اقبال کی صحبت میں

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

علاّمہ محمّد اِقبالؒ

(۱۸۷۷ — ۱۹۳۸ء)

اقبال کی صحبت میں

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات ولادتِ علامہ محمد اقبال

مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول : نومبر ۱۹۷۷ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
ناظمِ مجلسِ ترقیِ ادب ، لاہور

طابع : محمد زرین خاں

مطبع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ ریلوے روڈ ، لاہور

تقسیم کنندگان

اقبال اکادمی پاکستان
90/بی - 2 ، گلبرگ III ،
لاہور

فہرست مضامین

☆ ☆ ☆

مقدمہ

علامہ اقبال کے فکر و فن اور شخصیت پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آیندہ اس سے زیادہ لکھا جائے گا، مگر علامہ کے حالاتِ زندگی کے اکثر پہلو ایسے ہیں جن کے بارے میں کماحقہ تحقیق نہیں کی گئی اور اگر کی گئی تو وہ بے حد تشنہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ علامہ کے علمی و فنی کارناموں پر تو سبھی متفق ہیں مگر ان کے سوانح کے معاملے میں خاصا وسیع اختلافِ رائے موجود ہے۔ اس ضمن میں اب تک جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے درجِ ذیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

(۱) اقبال — ایک نظر: مصنفہ مولوی احمد الدین وکیل۔

(۲) ذکرِ اقبال: مصنفہ عبدالمجید سالک۔

(۳) روزگارِ فقیر: مصنفہ فقیر سیّد وحید الدین۔

علاوہ ازیں علامہ کی زندگی کے بعض حالات متعدد غیر منظّم تحریروں سے بھی دستیاب ہو جاتے ہیں۔

راقم الحروف نے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک کوشش کی تھی کہ جو کچھ علامہ کے فکر و فن کے بارے میں لکھا گیا ہے اسے محفوظ کر لیا جائے۔ اقبال اکیڈمی نے بھی قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کی ایک کتاب ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' شائع کی تھی۔

انھی دنوں عبدالغنی اور خواجہ نور الٰہی نے لاہور سے اقبال پر کتابیات کا مجموعہ شائع کیا - فوراً بعد اقبال اکیڈمی کی طرف سے کتابیات متعلقۂ اقبال مرتبہ خواجہ عبدالوحید کا مجموعہ طبع ہؤا - پھر بہاولپور سے نذیر احمد ملک نے اس سرمائے میں ''کلیدِ اقبال'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب کا اضافہ کیا - بعد میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی اور عبدالقوی دسنوی نے ''اقبال ریویو'' ۱۹۷۶ء میں اس سلسلے میں مزید اضافہ کیا - بہرحال یہ حقیقت ہے کہ علامہ کے فکر و فن کے مقابلے میں ان کے سوانح پر نسبتاً کم توجہ صرف کی گئی ہے -

یوں تو مجھے علامہ اقبال کی نظمیں ابتدا ہی سے انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسوں اور بعض دوسری مجالس میں سننے کا اتفاق ہوا مگر سنہ ۱۹۱۴ء کے اخیر سے مجھے ان سے زیادہ قریب ہونے کا موقع ملا - پھر ۱۹۲۳ء سے لے کر ان کی رحلت تک سفر و حضر میں ان کے ہمراہ رہنے کا شرف حاصل ہوا - یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی اس تالیف کا نام ''اقبال کی صحبت میں'' رکھا ہے - میں نے اس میں اپنی یادداشتوں اور مشاہدات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے -

میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ وقت ہے جب علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی پوری صحت کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لائے جا سکتے ہیں - علامہ اقبال کے مداحین و معتقدین سے اب تک اس ضمن میں جو غفلت ہوئی ہے اس کا کفارہ اسی طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ علامہ کے بارے میں جس کو بھی ، جتنا کچھ بھی معلوم ہو ، اسے وہ مستند حوالوں کے ساتھ ، منظرِ عام پر لے آئے - ابھی بعض ایسے لوگ زندہ ہیں جنھوں نے علامہ کے فیضِ صحبت کا اعزاز حاصل کیا - علامہ کی اولاد موجود ہے ، علامہ کے اعزہ و اقربا موجود ہیں - ان سب کی طرف سے علامہ کے حالاتِ زندگی کی جزئیات یک جا کرنے کا کام ہونا

چاہیے تاکہ مستقبل کے محقّق کا کام آسان ہو جائے اور وہ علامہ کی زندگی کے بعض ایسے گوشوں کی من مانی تاویلیں نہ کرتا پھرے ، جن کے متعلق تحقیق و تفتیش کرنے سے اس دور کے لوگ ہچکچاتے رہے یا سہل انگاری کے شکار رہے ۔

راقم الحروف نے کوشش کی ہے کہ علامہ کے حالاتِ زندگی ترتیب و تنظیم اور اختصار کے ساتھ پیش کر دیے جائیں ۔ فیصلہ ہمیشہ قارئینِ کرام کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ کسی مصنف یا مؤلف کی مساعی کی تحسین یا تنقید کریں ۔ مجھے صرف اتنا یقین دلانا ہے کہ میں نے واقعات کی ترتیب اور استخراجِ نتائج کے ضمن میں حتی الامکان احتیاط سے کام لیا ہے ۔

علامہ کا ہر عمل اور ہر قول ، اپنے عصر کے حوالے سے ، ہمیشہ بہت اہم اور بہت با معنی رہا ہے ، چنانچہ علامہ کے حالاتِ زندگی کو قلم بند کرنے والے کی ذمہ داریاں دو چند ہو جاتی ہیں ۔ میں نے یہ ذمہ داریاں کس حد تک نبھائی ہیں ، اس کا فیصلہ قارئین کریں گے ۔

محمد عبداللہ چغتائی

۱

اقبال کے بلند مقام کا اعتراف و احترام

آج ہم علامہ اقبال کا سو سالہ جشنِ ولادت منا رہے ہیں ۔ ۱۹۷۷ء کو ''سالِ اقبال'' قرار دیا جا چکا ہے اور مختلف سرکاری و غیر سرکاری ادارے اپنی بساط کے مطابق تقریبات کا اہتمام کر رہے ہیں ۔ علامہ کے کلام اور علمی کارناموں پر ، مختلف موضوعات کے تحت ، دنیا میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ آج اسے مہیا کرنا تو درکنار ، ان تمام نگارشات کی مفصّل فہرست مرتّب کرنا بھی ایک بہت بڑا کارنامہ ہے ۔ یہ علامہ اقبال کے تبحّرِ علمی کا اعجاز ہے کہ ان کے فکر و فن پر قلم اٹھانے والے ہر صاحبِ علم نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے اور ان کے کلام کو انسانیت کی فلاح کے لیے بالعموم اور دنیائے اسلام کی سربلندی کے لیے بالخصوص ایک الہامی پیغام کا درجہ دیا ہے ۔ اقبال کے کلام میں اسلامی اخوت و صداقت ، عدل و مساوات ، جرأت و سرفروشی اور عالم گیر اسلامی اتحاد کا پیغام ہے ۔ حضور اکرمؐ سے اقبال کی والہانہ محبت اور اسلام کی سچائی پر ان کا غیر متزلزل ایمان ان کے لیے ہمیشہ سرمایۂ افتخار رہا ۔

اگرچہ بعض کم فہم اور اقبال ناشناس حضرات نے علامہ کی تخلیقات پر مشکل اور دقیق ہونے کا الزام بھی عاید کیا ہے مگر

حقیقت میں ایسا ہرگز نہیں ہے ۔ اگر سچی لگن کے ساتھ اقبال کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو کلامِ اقبال کوئی معمہ نہیں ہے کہ اسے سمجھا نہ جا سکے لیکن اگر کوئی اس پر مائل ہی نہ ہو تو الگ بات ہے ۔ علامہ نے خود بھی فرمایا ہے :

ہوں وہ مضمون کہ مشکل ہے سمجھنا میرا
کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آسان ہوں میں

یہ درست ہے کہ اقبال کا ابتدائی کلام حسن و عشق کی شوخیوں سے معمور ہے لیکن اگر بنظرِ تعمّق دیکھا جائے تو اس میں بھی اس غیرفانی پیغام کے نقوش تلاش کیے جا سکتے ہیں جو آگے چل کر عالمِ انسانیت کو اخوّت و مساوات ، حرّیت و سرفروشی اور خودی و خودشناسی کی دولت سے مالامال کرتا ہے ۔ یہ اقبال ہی کی اقبال مندی ہے کہ انھیں اپنے حینِ حیات وہ عزت اور عالمگیر شہرت نصیب ہوئی جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے ۔ مگر افسوس کہ آج نہ وہ اقبال ہمارے درمیان موجود ہے اور نہ وہ صاحبانِ بصیرت جنھوں نے اقبال کی پیشانی پر ملّت کے شاندار مستقبل کی جھلک دیکھی تھی اور انھیں شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا تھا ۔ شبلی نعمانی جیسے نابغۂ روزگار نے ۱۹۱۱ء میں انھیں ''ملک الشعرا'' کا خطاب دیا تھا جب کہ اقبال کی عمر صرف ۳۴ برس تھی ۔ اسی زمانے میں آزاد بلگرامی نے ''حسان الہند'' اور اس کے ایک سال بعد سید سلیمان نے انھیں ''فرزدقِ ہند'' کے خطاب سے مخاطب کیا ۔ غالباً یہی زمانہ تھا جب لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نے ایک موقع پر کہا تھا :

حضرتِ اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں

یہ خود آگاہی ، یہ خوش گوئی ، یہ ذوقِ معرفت !
یہ طریقِ دوستی ، خود داریِ با تمکنت !
اس کی شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
باخدا تھے ، اہلِ دل تھے ، صاحبِ اسرار تھے

آپ کے ایک گرامی قدر دوست حضرت علامہ گرامی نے کہا تھا :

در دیدۂ حق نگراں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

اسی پر بس نہیں ، بلکہ علامہ کو ان کی زندگی ہی میں قوم نے ''ترجمانِ حقیقت'' اور ''ترجمانِ اسلام'' جیسے خطابات سے نوازا جس کی شاہد انجمنِ حمایتِ اسلام میں پڑھی جانے والی نظمیں ہیں جو انھی خطابات کے ساتھ شائع ہوئی تھیں :

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اقبال اوّل و آخر ایک سچے مسلمان تھے اور اسی نقطۂ نظر سے سوچتے تھے ۔ وہ اپنی چشمِ تصوّر سے ایک ایسی جمہوری دنیا کو دیکھتے تھے جس میں تمام اسلامی ریاستیں مدغم ہو کر ایک نئی عظیم الشان اسلامی دنیا وجود میں آ جائے جس میں باہمی تفرقے اور فرقہ بندی کا کوئی وجود نہیں ہو ۔ یہی تصور اقبال کے کلام میں ہمیں جابجا نظر آتا ہے اور اسی وجہ سے ''انسائیکلو پیڈیا برطانیکا'' میں آپ کو ''شاعرِ پین اسلامزم'' کہا گیا ہے ۔ آپ کے استاد پروفیسر آرنلڈ نے آپ کی شاعری کو ''انکشافِ حقیقت'' کہا ہے اور بعض دوسرے مغربی مفکّرین نے آپ کو گوئٹے ، نٹشے اور شیکسپئر سے ملایا ہے ۔ ایک امریکی نقاد نے لکھا ہے کہ گزشتہ آٹھ سو سال سے

اقبال کے پائے کا شاعر دنیا میں پیدا نہیں ہوا ۔ بعض اطالوی یونیورسٹیوں میں پروفیسر نکلسن کا ترجمۂ ''اسرارِ خودی'' نصابہ میں شامل ہے اور کئی نظمیں ترکی زبان میں منتقل کی گئی ہیں تاکہ انہیں ترک طلبہ کو پڑھایا جا سکے ۔ غرض کلامِ اقبال صرف برعظیم پاک و ہند کے لیے سرمایۂ افتخار نہیں بلکہ بیرونی دنیا میں بھی اس کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔

کلامِ اقبال کی مقبولیت دیکھ کر بہت سے لوگوں نے اس کی تقلید کی کوشش کی مگر اس کا جو نتیجہ نکلا اس کی کیفیت مولانا عبدالمجید سالک کے الفاظ میں یوں ہے :

''علامہ اقبال نے اپنی حیات افروز شاعری سے شعر کی دنیا میں جو انقلاب پیدا کر دیا ہے ، وہ کسی سے مخفی نہیں ، لیکن اس کی غلط تقلید نے بہت سے نوجوان شاعروں کی کاوشیں برباد اور عمریں تباہ کی ہیں ۔ ان کے نزدیک اقبال کی تقلید صرف اسی بات میں ہے کہ فارسی کی چند ترکیبیں جمع کر کے ایک نظم تیار کر دی جائے ۔ اس میں معنی نہ ہوں ، اس میں شاعرانہ بلند خیالی اور فطرت کی صحیح مصوری نہ ہو ، اس کی پروا نہیں — لیکن شعرگفتنی ضرور است ۔''

۱۹۲۲ع میں نوبل پرائز پر تنقید کرتے ہوئے ''بمبئی کرانیکل'' نے لکھا تھا :

''شاعری کے خداداد وصف کی بدولت جو اثر مسٹر ییٹس (Yeats) نے اپنے ساتھیوں میں پیدا کیا ہے ، اس کی ہمسری اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہ ہندوستان کا اعلیٰ ترین شاعر اقبال ہے ۔''

اسی موقع پر ''ٹائمز آف انڈیا'' نے یوں اپنی رائے ظاہر کی تھی :

''یہ اعلان کہ اس سال علم و ادب کا نوبل پرائز مسٹر ییٹس کو دیا گیا ہے ، ہندوستان میں کسی قدر مایوسی کا باعث ہوگا ۔ تین چار مجوزہ ناموں میں سب سے زیادہ قابلِ وقعت نام ہندوستان اور یورپ کے علمی حلقوں میں سر محمد اقبال کا ہے ۔ اگر ہندوستان کی ایک دفعہ اَور قدر و منزلت کی جاتی تو اقبال سے بہتر کوئی اور اس کا مستحق نہ ہوتا ۔''

راقم الحروف اپنی اس خوش بختی پر ہمیشہ ناز کرے گا کہ اسے ایک طویل عرصے تک شاعرِ مشرق کی جوتیوں میں بیٹھنے کا شرف حاصل رہا ۔ خود ان کی مبارک زبان سے ان کا حیات افروز کلام سنا ، ان کی بلیغ تقریریں سنیں اور ان کی شگفتہ مجالس میں بیٹھنے کی سعادت حاصل کی ۔ آنے والی نسلیں اس خوش بختی پر یقیناً رشک کریں گی ۔ ع

جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

☆ ☆ ☆

۲

تاریخِ ولادت

علامہ اقبال اپنے آبائی وطن سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی صحیح تاریخِ پیدائش تلاش کرنے کی کماحقہ کوشش کی گئی اور آپ کے تمام سرٹیفیکیٹ وغیرہ کا پوری طرح جائزہ لیا گیا۔ اس ضمن میں دو تین مرتبہ مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی معیت میں سیالکوٹ جانے کا اتفاق بھی ہوا تاکہ آپ کی صحیح تاریخِ پیدائش کا تعیّن ہو سکے۔ اس سلسلے میں ایک میٹنگ لاہور میں ہوئی تھی جس میں علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے بڑے صاحبزادے شیخ اعجاز احمد نے شرکت کی تھی اور انھوں نے مندرجہ ذیل تاریخ پیش کی تھی جو میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کی یادداشتوں میں درج ہے:

> There is absolutely no reason for us to disregard the date of Iqbal's birth as given by him; that is 3rd Ziqadah 1294 A.H. Corresponding to 9th November 1877, although the Municipal record of Sialkot town make no mention of this date.

اس کے بعد میں نے یورپ کے ریکارڈوں سے بھی استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ مندرجہ بالا ریکارڈ کی میونک یونیورسٹی جرمنی سے بھی تائید ہوتی ہے جہاں سے آپ نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری (پی ایچ۔ ڈی)

حاصل کی تھی ۔ کیونکہ آپ نے خود بھی ۳ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ اپنی تاریخِ پیدائش بیان کی ہے جو ۹ نومبر ۱۸۷۷ع کے مطابق ہے ۔

ان حالات میں ۳ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ع ہی کو طے شدہ تاریخِ پیدائش تصور کرنا چاہیے کہ آپ اسی تاریخ کو مقامِ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ آیندہ اسی تاریخ کو رواج پانا چاہیے جس کے مطابق پاکستان میں یا دوسرے ممالک میں تقریباتِ یومِ اقبال منائی جائیں ۔

۳

خاندان

علامہ اقبال کشمیر کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اس ضمن میں مرحوم محمد دین فوق نے اپنی تالیف ''مشاہیرِ کشمیر'' میں بھی کچھ روشنی ڈالی ہے اور علامہ نے خود بھی اپنے ایک مکتوب (مورخہ ۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء بنام شیخ اعجاز احمد ابنِ شیخ عطا محمد) میں وضاحت کی ہے ۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں :

''لاہور ، ۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء

''برادرِ مکرم ۔ السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے جس سے بہت اطمینان ہوا ۔ الحمد للہ علیٰ ذالک ۔ جاوید اقبال بالکل تندرست ہے ۔ آج پورے ایک سال کا ہوگیا ہے ۔ اس کی والدہ آج قربانی دینے میں مصروف ہے ۔ آپ اور والدِ مکرم یہ سن کر خوش ہوں گے کہ مدت کی جستجو کے بعد اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے ۔ حضرت بابا لولی حج ، کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے ۔ ان کا ذکر خواجہ اعظم کی ''تاریخِ کشمیر'' میں اتفاقاً مل گیا ہے ۔ والدِ مکرم نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا تھا وہ بحیثیتِ مجموعی درست ہے ۔ ان کا اصل گاؤں

لوچر نہ تھا بلکہ موضع چکو پرگنہ اڈون تھا ۔ بارہ سال
کشمیر سے باہر رہے اور ممالک کی سیر میں مصروف رہے۔
بیوی کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہ تھے ، اس واسطے
ترکِ دنیا کر کے کشمیر سے نکل گئے تھے ۔ واپس آنے پر
اشارۂ غیبی پا کر حضرت بابا نصرالدین کے مرید ہوئے جو
حضرت نور الدین ولی کے مرید تھے ۔ بقیہ عمر انھوں
نے بابا نصرالدین کی صحبت میں گزاری اور اپنے مرشد
کے جوار میں مدفون ہیں ۔ اب امید ہے کہ مزید حالات
معلوم ہو جائیں گے ۔ خواجہ اعظم کا تذکرہ مختصر ہے
مگر یہ مختصر نشان غالباً مزید انکشافات کا باعث ہوگا ۔ ان
حالات کے معلوم ہونے کا سبب بھی عجیب و غریب
ہے ؛ دہلی یونیورسٹی کے رجسٹرار ، الہ آباد یونیورسٹی سے
ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے ایک کتاب ''کشمیر
کی تہذیب و تمدن'' لکھ رہے ہیں ۔ میں ان کا ممتحن ہوں ۔
باقی دو ممتحن انگلستان اور آئرلینڈ کے پروفیسر ہیں ۔
اتفاق سے رجسٹرار صاحب کل آئے ہوئے تھے ۔ انھوں نے
کسی اپنے دوست کو ہدایت کی تھی کہ خواجہ اعظم کی
''تاریخِ کشمیر'' کا قلمی نسخہ میرے مکان پر پہنچا دے ۔
وہ شخص قلمی نسخہ تاریخِ مذکور کا لایا ۔ میں اس وقت
فارغ بیٹھا تھا ، یہی کتاب دیکھنی شروع کردی ۔ دو چار
ورق ہی الٹے تھے کہ بابا صاحب کا تذکرہ مل گیا جس سے
مجھ کو بڑی خوشی ہوئی ۔ غالباً بابا نصرالدین کی اولاد
کشمیر میں ہوگی ۔ ان سے مزید حالات معلوم ہونے کی
توقع ہے ، اور کیا عجب کہ ان کے پاس اپنے مریدوں کا

سارا سلسلہ موجود ہو۔"

اس خط سے پتا چلتا ہے کہ علامہ اپنے والدِ محترم کی روایت کی تصدیق کے لیے اپنے اجداد کا سراغ لگانے کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ ویسے "تاریخِ کشمیر" اعظمی (واقعاتِ کشمیر) کے قلمی نسخے مل جاتے ہیں۔ میرے پاس بھی ایک نسخہ موجود ہے۔ یہ کتاب ۱۱۶۶ھ میں تالیف ہوئی تھی۔

علامہ کے اس کشمیری خاندان پر مزید روشنی ڈاکٹر باقر نے روزنامہ "نوائے وقت" (۱۷ نومبر ۱۹۷۴ع) میں بھی ڈالی ہے جس کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

۴

علامہ اقبال کے والدین

میں نے علامہ کے والدِ ماجد شیخ نور محمد صاحب کو پہلی مرتبہ ۱۹۱۱ء میں دیکھا تھا جب وہ رواز ہوسٹل میں علامہ کی نظم ''شکوہ'' سننے کے لیے تشریف لائے تھے - ان کا انتقال ۱۹۳۰ء میں سیالکوٹ میں ہوا - علامہ اقبال ان کا بے حد احترام کرتے تھے - وہ فارسی زبان کی اچھی خاصی استعداد رکھتے تھے اور علامہ کی مثنوی ''اسرار خودی'' کو بآسانی سمجھ لیتے تھے - ایک مرتبہ علامہ نے دوران گفتگو میں فرمایا تھا کہ میں نے والد صاحب کی سہولت کے لیے مثنوی ''اسرار خودی'' کو جلی قلم سے لکھا ہے تا کہ وہ پڑھنے میں کوئی دقّت محسوس نہ کریں - وہ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں اکثر علامہ کی نظمیں سننے کی غرض سے تشریف لاتے تھے - چنانچہ انجمن کی مختصر تاریخ میں لکھا ہے :

> سنہ ۱۹۰۰ء میں انجمن کی سٹیج پر شاعرِ اسلام علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال (علیہ الرحمہ) کا طلوع ہوا اور آپ نے ایک نہایت رقّت آمیز نظم موسومہ ''نالۂ یتیم'' اپنے مخصوص رنگ اور درد انگیز آواز میں پڑھی - اس وقت سامعین کے تأثر کی حالت احاطۂ تحریر میں نہیں آ سکتی -

ہر دیدہ اشک ریز اور ہر قلب مضطر تھا ۔ وجدان کی یہ کیفیت تھی کہ جب منشی عبدالعزیز مرحوم (پیسہ اخبار) نے ممدوح کو نظم کے چند بند پڑھنے کے بعد اس غرض سے روک دیا کہ نظمِ مذکور کی مطبوعہ کاپیاں ، جن کی تعداد کئی صد تھی ، فروخت کرلی جائیں (اور قیمت فی جلد چار روپے بتلائی) تو یہ تمام جلدیں آناً فاناً اسی قیمت پر فروخت ہوگئیں لیکن مانگ بدستور تھی ۔ چنانچہ بعض حضرات نے خرید کردہ جلدیں اس شرط پر انجمن کو مکرر دے دیں کہ کوئی جلد پچاس روپے سے کم میں فروخت نہ ہو ۔ چند لمحوں میں وہ بھی بک گئیں ۔ خود علامہ کے والد ماجد مرحوم نے ، جو اس وقت گیلری میں تشریف فرما تھے ، سولہ روپے میں ایک جلد خریدی تھی ۔"

میں نے "زبور عجم" کی اشاعت پر ایک مضمون روزنامہ "انقلاب" میں ۲۴ جولائی ۱۹۲۷ء کو لکھا تھا جسے علامہ کے والدِ ماجد نے بھی پڑھا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار ایک خط میں کیا جو انھوں نے علامہ کو لکھا تھا ۔

علامہ کی والدۂ ماجدہ کا اسمِ گرامی امام بی بی تھا ۔ وہ ایک ہردلعزیز خاتون تھیں اور علامہ ان کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے ۔ جب ۱۹۱۴ء میں وہ انتقال فرما گئیں تو علامہ نے ان کی وفات پر "والدۂ مرحومہ کی یاد میں" کے نام سے ایک رقّت انگیز مرثیہ تحریر فرمایا جو "بانگ درا" میں شامل ہے ۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے بھی مرحومہ کی وفات پر ایک قطعۂ تاریخِ وفات لکھا تھا جو ان کے مزار پر کندہ ہے ۔

علامہ کی چار بہنیں تھیں اور ایک بڑے بھائی تھے جن کا نام

شیخ عطا محمد تھا ۔ ان سے وزیرآباد اور پھر لدھیانہ میں راقم نے نیاز حاصل کیا تھا ۔

میں نے علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب کو پہلی مرتبہ ۱۹۲۲ء میں لاہور میں دیکھا تھا جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے ۔ انھی دنوں علامہ نے انارکلی والے مکان کو چھوڑ کر میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور چونکہ ان کے بڑے بھائی شعبۂ انجینیرنگ میں ملازم رہے تھے لہٰذا ان کی معرفت مذکورہ کوٹھی میں کچھ عمارتی رد و بدل کرانا تھا ۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں جب علامہ کو ''سر'' کا خطاب ملا تو یہ مکان بھی درست ہو چکا تھا ۔ شیخ عطا محمد کی قوتِ سماعت کمزور تھی اور وہ اونچا سنتے تھے ۔ علامہ صاحب اپنے بڑے بھائی کا بہت احترام کرتے تھے اور انھیں ''بھا جی'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے ۔

علامہ اقبال کبھی کبھی اپنے سفر بلوچستان کا تذکرہ بھی کیا کرتے تھے جو انھوں نے ۱۹۰۳ء میں کیا تھا ۔ اس سفر میں ان کا پرانا خدمتگار علی بخش بھی ان کے ہمراہ تھا ۔ سفر کی غرض و غایت یہ تھی کہ علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب آن دنوں بلوچستان میں تعینات تھے اور بعض شرپسندوں نے سازش کر کے انھیں ایک فوجداری مقدمے میں ملوث کر لیا تھا ۔ چنانچہ علامہ خود بلوچستان کے شہر فورٹ سنڈیمن تشریف لے گئے ۔ ان کی کوششوں سے ان کے بھائی باعزت طور پر بری ہوگئے اور ملازمت پر بحال رہے ۔

اس کے بعد جب شیخ عطا محمد صاحب کا تبادلہ ایبٹ آباد میں ہوگیا تو علامہ بھی ایک مرتبہ وہاں تشریف لے گئے ۔ وہاں کے اہلِ علم حضرات کے اصرار پر آپ نے وہاں ایک لیکچر بھی دیا جس

کا عنوان تھا ''قومی زندگی'' - یہ لیکچر رسالہ ''مخزن'' کے دو شماروں یعنی اکتوبر ۱۹۰۴ء اور مارچ ۱۹۰۵ء میں شائع ہو چکا ہے -

۱۹۱۱ء میں شیخ عطا محمد مرحوم کا تبادلہ کیمبل پور میں ہوا تو علامہ وہاں بھی تشریف لے گئے - وہ ہمیشہ اپنے بڑے بھائی کی عزت کرتے تھے اور ان کے لیے تقویت کا باعث بنتے تھے - مگر معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کے بڑے بیٹے آفتاب اقبال کو اپنے چچا سے بعض شکایات بھی تھیں - یہ خاندانی نوعیت کی شکایات تھیں جن کا تذکرہ یہاں مناسب نہیں - شیخ عطا محمد صاحب کا انتقال ۲۲ دسمبر ۱۹۴۱ء کو سیالکوٹ میں ہوا - اس وقت ان کی عمر اسی برس کے قریب تھی -

علامہ کو اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد مرحوم کی اولاد بھی بہت عزیز تھی اور وہ ان کا بہت خیال رکھتے تھے- چنانچہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں قیام کے زمانے میں انھوں نے شیخ صاحب کے چھوٹے بیٹے مختار احمد کو خود تعلیم دلوائی اور پھر ملازم کروایا - جب ۱۹۳۱ء - ۱۹۳۲ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے آپ لندن تشریف لے گئے تو مختار احمد ان کے گھر میں موجود تھے -

۵

شعرگوئی کا آغاز اور داغ سے تلمذ

۱۸۹۵ء میں علامہ اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کی کلاس میں داخلہ لیا اور اس طرح لاہور میں ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ بعض شواہد سے پتا چلتا ہے کہ لاہور میں اپنے قیام (۱۸۹۵ء) سے خاصا عرصہ پیشتر علامہ اقبال شاعری کا آغاز کر چکے تھے۔ رسالہ ''آجکل'' دہلی کے ۱۵ جولائی ۱۹۴۴ء کے شمارے میں علامہ کی دو غزلیں ہمیں ملی ہیں جو دراصل رسالہ ''زبان'' دہلی کے شمارہ نومبر ۱۸۹۳ء اور فروری ۱۸۹۴ء سے نقل کی گئی ہیں۔ نومبر ۱۸۹۳ء اور فروری ۱۸۹۴ء وہ زمانہ ہے جب علامہ اقبال سیالکوٹ میں ایف۔ اے کی کلاس میں سالِ اول اور سالِ دوم کے طالب علم تھے۔ رسالہ ''زبان'' دہلی کا مذکورہ شمارہ جس میں سب سے پہلے یہ غزلیں شائع ہوئیں، کتب خانۂ ''الاصلاح'' دیسنہ ضلع پٹنہ کے مجموعۂ رسائل میں محفوظ ہے اور اسی سے نقل کرکے رسالہ ''آجکل'' کے ۱۵ جولائی ۱۹۴۴ء کے شمارے میں یہ غزلیں شائع کی گئی ہیں۔ رسالہ ''آجکل'' کا یہ شمارہ ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اس میں شائع شدہ غزلیں ہم ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔ بقولِ ''آجکل'' ان غزلوں کے شروع میں ''تلمیذِ بلبلِ ہند حضرت داغ دہلوی'' کے الفاظ

بھی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال اس زمانے میں داغ کی شاگردی اختیار کر چکے تھے ۔ "آجکل" کے نوٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اقبال پہلے پہل صاحبِ عالم میرزا ارشد گورگانی دودمانِ مغلیہ سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے ، مگر اصلاح کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تو نواب فصیح الملک میرزا داغ دہلوی کو اپنا کلام بھیجنے لگے ۔ یہ دونوں غزلیں طرحی ہیں اور علامہ کے کسی مجموعۂ کلام میں شائع نہیں ہوئیں :

۱

"غزل مندرجہ رسالہ "زبان" دہلی ، بابت ماہ نومبر ۱۸۹۳ ع
مصرع مطروحۂ زبان دہلی :

خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیّاد کا

کیا مزہ بلبل کو آیا شیوۂ بیداد کا
ڈھونڈتی پھرتی ہے اڑ اڑ کر جو گھر صیّاد کا

کس بتِ پردہ نشیں کے عشق میں ہوں مبتلا
حسرتِ دل پر ہے برقع دامنِ فریاد کا

جب دعا بھرِ اثر مانگی تو یہ پایا جواب
غیر رو کر لے گئے حصّہ تری فریاد کا

ہوں وہ ناداں ڈر سے زیرِ دام پنہاں ہو گیا
دور سے چہرہ نظر آیا اگر صیّاد کا

سن کے اس کو بیرخی سے بھاگ جاتا ہے مدام
کیا اثر معشوق ہے اے دل تری فریاد کا

شرم آئی ، جب مری رگ میں لہو نکلا نہ کچھ
آب میں ہے غرق گویا نیشتر فصّاد کا

قمریوں نے باغ میں دیکھا ہے اس خوش قد کو کیا
ہے چھری ان کے لیے پتّا ہر اک شمشاد کا

بھول جاتے ہیں مجھے سب یار کے جور و ستم
میں تو دیوانہ ہوں اے اقبال! تیری یاد کا

۲

غزل مندرجۂ رسالہ ''زبان'' دہلی، بابت ماہ فروری ۱۸۹۴ء

مصرع مطروحۂ زبان دہلی:

یہ اشارے مجھے پیغامِ قضا دیتے ہیں

جان دے کر تمھیں جینے کی دعا دیتے ہیں
پھر بھی کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں

کوچۂ یار میں ساتھ اپنے سُلایا ان کو
بختِ خفتہ کو مرے پاؤں دعا دیتے ہیں

بدگمانی کی بھی کچھ حد ہے کہ ہم قاصد سے
قسمیں سو لیتے ہیں، جب ایک پتا دیتے ہیں

موت بازار میں بکتی ہے تو لا دو مجھ کو
ہم نشیں کے لیے جینے کی دعا دیتے ہیں

رحم آتا ہے ہمیں قیس کی عریانی پر
دھجّیاں دامنِ صحرا کی اڑا دیتے ہیں

ایسی ذلّت ہے مرے واسطے عزّت سے سوا
خود وہ اٹھ کر مجھے محفل سے اٹھا دیتے ہیں

غیر کہتے ہیں کہ یہ پھول گیا ہے مردہ
قبر پر میری جو وہ پھول چڑھا دیتے ہیں

موت بولی جو ہوا کوچۂ قاتل میں گذر
سر اسی راہ میں مردانِ خدا دیتے ہیں

ان کو بیتاب کیا ، غیر کا گھر پھونک دیا
ہم دعائیں تجھے اے آہِ رسا دیتے ہیں

گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے جو وہ بُت **اقبال**
حضرتِ **داغ** کے اشعار سنا دیتے ہیں

شاگردیِ داغ کے سلسلے میں علامہ کا وہ خط خاصا اہم ہے جو انھوں نے مولانا احسن مارہروی کو لکھا تھا ۔ اس کا ضروری حصہ نذرِ قارئین ہے :

"۔ ۔ ۔ اگر آپ کے پاس استادی حضرت میرزا داغ کی تصویر ہو تو ارسال فرمائیے گا ۔ بہت ممنون ہوں گا ۔ اگر آپ کے پاس نہ ہو تو مطلع فرمائیے گا کہ کہاں سے مل سکتی ہے ۔ میں نے تمام دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کر دیے ہیں ۔ چنانچہ انگریز ، جرمن اور فرنچ شعرا کے فوٹوز کے لیے امریکہ لکھا ہے ۔ غالباً کسی نہ کسی استاد بھائی کے پاس حضرت کا فوٹو ضرور ہوگا ۔ اگر آپ کو معلوم نہ ہو تو از راہِ عنایت جلد مطلع فرمائیے ۔ حضرت امیر مینائی کے فوٹو کی بھی ضرورت ہے ۔ والسلام
خاکسار محمد اقبال
از لاہور گورنمنٹ کالج بورڈنگ ہاؤس ، ۲۸ فروری ۱۸۹۹ع ۔"

حکیم احمد شجاع ، جن کا ۷۶ سال کی عمر میں ۴ جنوری ۱۹۶۹ع کو انتقال ہوا ، اقبال کو اس زمانے سے جانتے تھے جب وہ گزشتہ صدی کے آخر میں بھاٹی دروازہ لاہور کے اندر ان کے ہاں

مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے ۔ انھوں نے ''نقوش'' لاہور میں بھی ''لاہور کا چیلسی'' کے عنوان سے ایک مضمون اقبال پر لکھا ہے اور اپنی سوانح حیات ''خوں بہا'' میں بھی ان کا ذکر کیا ہے ۔ چنانچہ رسالہ ''نقوش'' میں وہ لکھتے ہیں :

''۳۰ نومبر ۱۸۹۵ع کو پہلا جلسۂ مشاعرہ حکیم امین الدین بار ایٹ لا کے عالی شان مکان پر شام چھ بجے ہوا ۔ اس بزمِ مشاعرہ کے دوسرے مشاعرے میں حضرتِ اقبال نے بھی شرکت کی تھی اور سب سے پہلے اپنی غزل پڑھی تھی ۔ اس محفلِ مشاعرہ کی روداد ''شور محشر'' بابت دسمبر ۱۸۹۵ع میں ان کی غزل پر ان کا نام اس طرح درج ہے :

''جناب شیخ محمد اقبال صاحب اقبال ، تلمیذِ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی ۔''

اس غزل کے مقطع میں اقبال نے داغ کی شاگردی پر اس طرح فخر کا اظہار کیا ہے :

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخن داں کا

اس زمانے میں اقبال کا قیام بھاٹی دروازہ لاہور کے اندر ایک مکان میں تھا ۔ ان مشاعروں میں شاعری سے دلچسپی رکھنے والے اکثر صاحبِ ذوق حضرات شرکت کرتے تھے اور شعرا کو دادِ سخن طرازی دیتے تھے ۔ اسی قسم کی ایک محفل میں اقبال نے اپنی وہ غزل پڑھی تھی جس کے اس غیرفانی شعر نے لکھنو اور دلی کے اساتذۂ سخن کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا :

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس محفل میں میرزا محمد عبدالغنی ، میرزا ارشد گورگانی اور میر ناصر حسین دہلوی جیسے شعرا بھی موجود تھے جو اس شعر کو سن کر تصویرِ حیرت بنے ہوئے تھے ۔ اس وقت کے کم عمر اور نوجوان اقبال کی زبان سے اتنا بلند پایہ شعر واقعی حیرت ناک بات تھی جو اس کے اقبالِ بلند اور روشن مستقبل کی علامت تھی ۔

اس کے بعد بھی اقبال نے بھاٹی دروازے کے بعض مشاعروں میں حصہ لیا اور اپنا کلام سنایا جس سے ان کی شہرت میں خاصا اضافہ ہوا ۔ اس کے بعد آپ نے انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسوں میں شرکت شروع کی اور ۱۸۹۹ء کے بعد باقاعدگی سے ان جلسوں میں اپنے کلام کا جادو جگاتے رہے ۔ اس سے ان کی شہرت و مقبولیت کو جیسے پر لگ گئے اور ملک کے طول و عرض میں اقبال کا نام اور کلام خوشبو کی طرح پھیل گیا جس نے پورے برِعظیم کو مہکا دیا ۔

☆ ☆ ☆

۶

گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ

علامہ اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں اپنے زمانۂ طالب علمی اور پھر ملازمت کے واقعات اکثر بیان فرمایا کرتے تھے۔ سیالکوٹ کے مشن کالج سے ۱۸۹۵ء میں ایف۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ نے اعلیٰ تعلیم کی غرض سے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا تھا۔ ۱۱ فروری ۱۸۹۸ء کو پروفیسر سر ٹامس آرنلڈ گورنمنٹ کالج لاہور میں پرنسپل کی حیثیت سے آئے جو فلسفے کے معروف استاد تھے۔ اپریل ۱۸۹۹ء کو وہ اورینٹل کالج کے پرنسپل بنے مگر ۲۳ نومبر ۱۸۹۹ء کو وہ پھر گورنمنٹ کالج میں اپنے سابقہ منصب پر واپس آ گئے۔ پروفیسر آرنلڈ ہی وہ شخص ہیں جنھوں نے علامہ اقبال کی غیر معمولی صلاحیتوں کو پرکھا اور بامِ عروج پر پہنچنے میں ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ ۱۸۹۷ء میں اقبال نے بی۔ اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور انگریزی اور عربی مضامین میں اول آنے پر تمغے حاصل کیے۔ پھر ۱۸۹۹ء مین فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں اقبال گورنمنٹ کالج کے کوڈرینگل ہوسٹل (اب یہ ”اقبال ہوسٹل“ کہلاتا ہے) کے کمرہ نمبر ۱ میں مقیم رہے۔ گورنمنٹ کالج میں قیام کے زمانے میں ہی اقبال بھاٹی دروازے

کے مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے ۔ اس کا ثبوت ہمیں ان کے
اُس قدیم ترین خط سے بھی ملتا ہے جو انھوں نے اسی ہوسٹل سے مولانا
احسن مارہروی کو لکھا تھا اور جس کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے
ہیں ۔ غالباً یہ آخری خط ہے جو انھوں نے ہوسٹل سے لکھا تھا ۔
اس کے بعد وہ بھاٹی دروازے والے مکان میں آٹھ آئے تھے ۔

☆ ☆ ☆

۷

انجمنِ حمایتِ اسلام میں پہلی نظم

اقبال کو بھاٹی دروازہ کی محفل ہائے مشاعرہ میں خاصی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ جو لوگ ان محفلوں میں شامل ہوتے تھے وہی لوگ آپ کو انجمنِ حمایتِ اسلام کے ایک سالانہ جلسے منعقدہ ۱۸۹۹ء میں پہلی بار انجمن کی سٹیج پر لے آئے۔ یہ جلسہ انجمن حمایتِ اسلام کے ہائی سکول واقع شیرانوالہ گیٹ کے اندر میدان میں منعقد ہوا تھا۔ چنانچہ آپ نے یہاں اپنی ایک طویل نظم بعنوان ''نالۂ یتیم'' نہایت درد انگیز آواز میں پڑھی۔ اس وقت سامعین کے تاثرات کی کیفیت احاطۂ تحریر میں نہیں آ سکتی۔ ہر چشم اشک آلود اور لوگوں کے قلوب مضطرب تھے۔ تاثر کی یہ کیفیت تھی کہ جب منشی عبدالعزیز (پیسہ اخبار) مرحوم نے آپ کو نظم کے چند بند پڑھنے کے بعد روک دیا تاکہ نظمِ مذکور کی مطبوعہ کاپیاں، جن کی تعداد کئی صد تھی، فروخت کر لی جائیں (قیمت فی نسخہ چار روپے اعلان کیا گیا) تو یہ تمام جلدیں آناً فاناً اسی وقت فروخت ہو گئی تھیں، لیکن ان کی مانگ بدستور باقی تھی۔ چنانچہ بعض حضرات نے اپنی خرید کردہ کاپیاں اس شرط پر انجمن کو مکرّر عطیے میں دے دیں کہ کوئی جلد پچاس روپے سے کم میں فروخت نہ ہو، مگر چند لمحوں میں وہ

بھی بک گئیں ۔ علامہ کے والدِ مرحوم نے ، جو گیلری میں تشریف رکھتے تھے ، سولہ روپے میں ایک جلد خریدی تھی ۔ اس کے بعد علامہ نے مسلسل وہ نظم اپنے مخصوص انداز میں ترنم کے ساتھ پڑھی ۔

اس کے بعد علامہ متواتر انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں اپنی نظمیں پڑھتے رہے اور انجمنِ حمایتِ اسلام کے ساتھ آپ کا تعلق اخیر تک قائم رہا ۔

لاہور میں ایک انجمن ''بزمِ اُردو'' کے نام سے قائم تھی جس میں لوگ مشاعروں کا اہتمام کرتے تھے اور اکثر معاصر شعرا شامل ہوتے تھے ۔ ایک مرتبہ ۲۵ مارچ ۱۹۵۶ء کو خواجہ دل محمد نے مجھ سے بیان کیا کہ اس بزم کے مشاعرے عام طور پر محمڈن ہال لاہور میں ہوتے تھے ۔ اس کے سیکرٹری خان بشیر حسین خاں شاہجہان پوری تھے جو اُس وقت تک بقیدِ حیات تھے ۔ اقبال نے اس انجمن کے مشاعروں میں اکثر شرکت کی ہے ۔ ان کو یاد تھا کہ اقبال نے بھی اس بزم کے ایک جلسے میں نظم پڑھی تھی ۔ خواجہ دل محمد نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ میں نے بھی ان کی نظم ''نالۂ یتیم'' تبھی سنی تھی جب انھوں نے شیرانوالہ دروازہ کے اسلامیہ ہائی سکول میں پڑھی تھی ۔ وہ فرماتے تھے کہ میں خود بھی اس سکول میں اُس وقت پڑھتا تھا ۔

☆ ☆ ☆

۸

ملازمت کا آغاز

"تاریخِ اوریئنٹل کالج لاہور" مرتّبہ ڈاکٹر غلام حسین میں لکھا ہے :

"شاعرِ مشرق علامہ اقبال ، جنھوں نے ۱۸۹۹ع میں ایم ۔اے (فلسفہ) کا امتحان پاس کیا تھا ، اسی سال ۱۳ مئی کو میکلوڈ پنجاب عربیک ریڈر مقرر ہوئے اور چار برس تک اسی حیثیت سے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے ۔ واکر کی سیاستِ مدن کا اردو ترجمہ کیا اور اردو میں علمِ اقتصاد پر ایک تالیف انھوں نے اسی دوران میں مرتّب کی ۔[۱]"

اس کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو کر چلے گئے جہاں آپ نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۲ع کو اپنے اس عہدے کا چارج سنبھالا اور ۲ جنوری ۱۹۰۸ع تک اس کالج سے وابستہ رہے ۔ اگرچہ ۱۹۰۵ع میں آپ بیرسٹری کی اعلیٰ تعلیم کی غرض سے یورپ تشریف لے گئے تھے مگر جولائی ۱۹۰۸ع کو جب آپ واپس تشریف

۱۔ تاریخ یونیورسٹی اوریئنٹل کالج لاہور ، مصنّفہ ڈاکٹر غلام حسین ، ص۔ ۴۴ ۔

لائے تو جز وقتی ٹیچر کی حیثیت سے اسی کالج میں تعینات ہوئے ۔ بالآخر آپ نے کالج کی ملازمت کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور مستقل طور پر پیشۂ وکالت سے منسلک ہو گئے ۔

اوریئنٹل کالج کے زمانۂ تدریس کی یادگار کتاب ''علم الاقتصاد'' سب سے پہلے ۱۹۰۳ع میں شائع ہوئی تھی ۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ع میں اقبال اکیڈمی نے اسے کراچی سے شائع کیا ۔ آپ نے اس کتاب میں جو نظریات پیش کیے ان پر وہ زندگی بھر قائم رہے اور انھی نظریات کا پرتو ان کے ایک اور مقالے میں بھی نظر آتا ہے جس کا نام ''ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر'' ہے ۔ پنجابی کسان اور قائدِ اعظم کے خطوط میں بھی ان نظریات کی تائید ملتی ہے ۔

اوریئنٹل کالج لاہور میں علامہ اقبال کا دوسرا علمی کارنامہ شیخ عبدالقادر جیلانی کے نظریۂ توحیدِ مطلق پر وہ بلند پایہ مقالہ ہے جو
The Doctorine of the Absolute Unity as Expressed by Al-jilani
کے نام سے بمبئی کے ماہوار انگریزی رسالے Indian Antiquity میں ۱۹۰۰ع میں شائع ہوا تھا ۔ اس زمانے میں اقبال اوریئنٹل کالج میں بی ۔ او ۔ ایل اور انٹرمیڈیٹ کو پڑھاتے تھے ۔

۱۹۰۸ع میں جب اقبال علامہ یورپ سے واپس آئے تو آپ نے چنگڑ محلہ (رائے بہادر سوہن لال روڈ اردو بازار) میں مکان کرائے پر لیا ۔ ان ایام میں اقبال کے رہن سہن کے متعلق میر غلام بھیک نیرنگ کا وہ بیان بہت دلچسپ ہے جو انھی دنوں اقبال سے اس مکان میں ملے تھے ۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں اقبال سے ملاقات کی غرض سے لاہور گیا تھا ۔ میں دن کے وقت لاہور پہنچا اور سیدھا اقبال کی قیام گاہ پر حاضر ہوا ۔ ملازموں سے معلوم ہوا کہ علامہ گھومنے کے لیے باہر گئے ہیں ۔ میں بہت خوش ہوا کہ اقبال گھر سے نکلنا سیکھ رہے ہیں ۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ تشریف لائے تو مجھے بہت حیرت ہوئی کیونکہ اقبال نہایت نستعلیق سوٹ میں ملبوس تھے (اس سے پیشتر وہ لباس کے معاملے میں نہ صرف سادگی پسند تھے بلکہ لاپروا واقع ہوئے تھے)۔ خیر ملاقات ہوئی تو بہت گرمجوشی سے گلے ملے۔ اس کے بعد وہ سوٹ اتر گیا اور ہمیشہ کی طرح تہبند اور بنیان کے ساتھ ساتھ کمبل ان کے شانوں پر سوار ہو گیا۔ ان کا دیرینہ ہم نفس حقہ بھی حاضر ہو گیا اور ہم حسبِ سابق فرش پر بیٹھ کر دنیا جہان کی باتیں کرنے لگے۔

۱۹۲۸ء کے ایک موسمِ گرما کا ذکر ہے۔ علامہ اقبال راقم الحروف کو ساتھ لے کر کالکا ریلوے سٹیشن سے موٹر میں بیٹھ کر شملے جا رہے تھے۔ دورانِ سفر ہم کسی وجہ سے ایک موڑ پر رک گئے۔ اسی اثنا میں ایک موٹر آ گئی جو ہمارے قریب آ کر رکی اور اس میں سے غلام بھیک نیرنگ مرحوم برآمد ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد جب ہم اپنی اپنی موٹروں میں سوار ہو کر منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہونے لگے تو ایک تیسری موٹر ہمارے قریب آ کر رکی جس میں فلسفے کے معروف پروفیسر دیوان چند سفر کر رہے تھے۔ وہ کانپور سے آ رہے تھے۔ مجھے اُس وقت بہت خوشی ہوئی تھی کیونکہ میں نے پہلی مرتبہ ان صاحبانِ علم کو یکجا دیکھا تھا۔ اس مختصر ملاقات میں غلام بھیک نیرنگ مرحوم نے قدیم دکنی اُردو کے کچھ اشعار بھی سنائے تھے۔ ان میں سے ایک شعر میں لفظ ''شیشہ'' کو پانی کی بوتل کے معنوں میں استعمال کیا گیا تھا۔

ولایت سے آ کر جب علامہ نے وکالت کا آغاز کیا تو وکالت کے علاوہ کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج میں جز وقتی طور پر فلسفہ اور انگریزی بھی پڑھاتے رہے۔ کالج نے بطور خاص علامہ کے لیے یہ انتظام کیا تھا کہ چیف کورٹ میں جن مقدمات میں علامہ کو پیش

ہوتا ہوتا تھا ان کی ساعت کالج کے اوقات کے بعد ہوتی تھی ۔ تقریباً ڈیڑھ برس تک یہ انتظام رہا ۔ آن دنوں انڈین سول سروس اگرچہ زیادہ تر انگریزوں کے لیے مخصوص تھی مگر گورنمنٹ نے بطورِ خاص علامہ اقبال کو یہ اعلیٰ اسامی پیش کی جو آنھوں نے قبول نہ فرمائی اور اس کے مقابلے میں اپنے وکالت کے آزاد پیشے کو پسند کیا ۔ کیونکہ آپ طبعاً ملازمت کو پسند نہیں کرتے تھے ۔ چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کو بطورِ مشورہ ملازمت کے متعلق جواب میں جو کچھ لکھا اس میں ملازمت سے اپنے اجتناب کو اس طرح ظاہر فرمایا :

''ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور نے مجھ سے اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی اپنے کلرک سے کرتا ہے ، اس لیے آس دن سے ملازمت سے طبیعت بیزار ہوگئی اور ارادہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے گا ، ملازمت سے پرہیز کروں گا ۔''

۱۹۲۳ع میں جنوری کے مہینے کی پہلی تاریخ کو سرکار انگلشیہ نے علامہ کو ''سر'' کے خطاب سے سرفراز کیا ۔ ۱۹۳۱ع میں پروفیسر چیٹرجی نے لندن سے آکر گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ فلسفہ کا چارج لیا ۔ اسی زمانے میں قاضی اسلم علی گڑھ سے بی ۔ اے پاس کر کے یہاں ایم ۔ اے فلسفہ کی کلاس میں داخل ہوئے تھے ۔ انھوں نے اپنی یادداشتوں کے ضمن میں ایک مضمون : Iqbal at a College Reception in Lahore کے عنوان سے کراچی کے مجلہ ''اقبال ریویو'' (اکتوبر ۱۹۷۰ع) میں لکھا تھا جو بڑا دلچسپ ہے ۔ انھی کی کوشش سے اقبال کے اعزاز میں ایک استقبالیے کا اہتمام ہوا جو گورنمنٹ کالج کی فلسفے کی انجمن ''بریٹ'' کی طرف سے دیا گیا ، کیونکہ یہ خوشی

اس مجلس کی بھی تھی ۔ اقبال کو ''سر'' کا خطاب ان کے علمی کارناموں کی بدولت ملا تھا ، کسی سیاسی خدمت کا صلہ نہ تھا ۔

گورنمنٹ کالج کی مذکور انجمن سے زیادہ تر بی ۔ اے کے طلبہ وابستہ ہوتے تھے جن میں ہندو ، مسلم اور سکھ سب شامل تھے ۔ چنانچہ وہ علامہ کی خدمت میں چیٹرجی کی چٹھی لے کر استقبالیے میں شرکت کی دعوت دینے کے لیے حاضر ہوئے ۔ علامہ اپنے گھر واقع میکلوڈ روڈ پر بے تکلف بیٹھے ہوئے تھے ۔ وہ دعوت کا دن اور وقت طے کر آئے اور واپس آ کر انھوں نے مدعوین کی فہرست مرتب کی جس میں شہر کے معززین بھی شامل تھے ۔ اس بزم کے سیکرٹری کلیم الرحمٰن لاہور کے ایک معروف خاندان کے فرد تھے اور اسسٹنٹ سیکرٹری منوہر ناتھ تھے ۔ دعوت کا دن ۲۳ جنوری ۱۹۲۳ع مقرر ہوا تھا ۔ یہ دعوت کالج کے مغربی لان میں منعقد ہوئی تھی ۔ ایک گروپ فوٹو بھی ''بریٹ'' (Brett) کی طرف سے ہوا تھا جس میں کالج کے عہدے داروں میں سے پرنسپل مسٹر ہیمی ، پروفیسر چیٹرجی ، پروفیسر احمد حسین (جو بعد میں اسلامیہ کالج گوجرانوالہ کے پرنسپل ۷۸ سال کی عمر تک رہے) اور شرکاے دعوت میں سے شیخ فضل حق اور انور سکندر خاں شامل تھے ۔ یہ دعوت بہت سادہ تھی یعنی کالج کی جانب سے استقبالیہ اور پھر علامہ اقبال کا خطاب ۔ آپ نے اس موقع پر ایک نظم بھی سنائی تھی ۔ اس دعوت کی مکمل روداد قاضی اسلم نے متذکرہ بالا رسالے میں شائع کردی ہے ۔

یہاں یہ بیان کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اہل ِ لاہور کی طرف سے بھی جنوری ۱۹۲۳ع میں علامہ اقبال کے اعزاز میں ان کو ''سر'' کا خطاب ملنے پر ایک شاندار عصرانہ مقبرۂ جہانگیر میں منعقد ہوا تھا ، جس میں سکول اور کالج کے طلبہ نے نظمیں بھی پڑھی تھیں ۔

گورنمنٹ کالج سے علامہ کے تعلق کے ضمن میں عرض ہے کہ جس سال علامہ اقبال نے اس کالج میں داخلہ لیا اسی سال میر غلام بھیک نیرنگ بھی میٹرک پاس کرنے کے بعد اس کالج میں داخل ہوئے ۔ ان کے ہمراہ کالج میں اور ہوسٹل میں ان کے ہم جماعت چودھری جلال الدین (ضلع سیالکوٹ ، ڈسکہ کے رہنے والے) بھی تھے ۔ ایک روز اقبال بھاٹی دروازے سے کالج کی طرف آ رہے تھے کہ چودھری جلال الدین نے اقبال کا تعارف میر غلام بھیک نیرنگ سے اس طرح کروایا کہ آپ مولوی سید میر حسن کے خاص تربیت یافتہ ہیں اور شاعر بھی ہیں ۔ اس کے بعد ان کو اقبال کا کلام سننے یا پڑھنے کا شوق ہوا تو چودھری صاحب اقبال کے کچھ مطبوعہ اشعار ان کے پاس لائے جو اب ''بانگِ درا'' وغیرہ کتابوں میں نہیں ہیں ۔ اسی طرح اقبال نے بھی میر غلام بھیک کے کلام کا نمونہ دیکھنا چاہا ۔

آپ کے ہم جماعت طلبہ میں ایک صاحب مولوی ضیاء الدین احمد تھے جو کوچہ ہنوسان گمٹی بازار لاہور میں رہتے تھے ۔ اقبال اکثر ہوسٹل سے نکل کر ان کے ہاں آ جاتے تھے ۔ وہ ان کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے ۔ بعد میں وہ بمبئی میں پولیس آفیسر ہو گئے تھے ۔ میر غلام بھیک نیرنگ اور مولوی ضیاء الدین احمد گہرے دوست تھے ۔ میں اور اقبال اکثر ان سے ملنے جایا کرتے تھے ۔

گورنمنٹ کالج میں اقبال کے زمانۂ پروفیسری میں ایک صاحب پروفیسر مدن گوپال سنگھ چاولہ ریاضی پڑھاتے تھے ۔ اگرچہ وہ اپنے مضمون میں بہت قابل تھے مگر عام مجلسی آداب سے قدرے عاری تھے ۔ ایک مرتبہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں کوئی صاحب اقبال سے ملنے آئے ۔ وہ بھی اقبال کو عام آداب سے ذرا عاری نظر آئے تو اس کے جانے پر آپ نے مسکرا کر کہا کہ میں اکثر پروفیسر

چاولہ کو کالج میں کہا کرتا تھا ، خاص کر جب وہ سٹاف روم میں ہماری طرف پیٹھ کر کے خلافِ قاعدہ بیٹھ جاتے "پروفیسر چاولہ ! نوازش فرما کر آپ مجھے ریاضی پڑھا دیں اور میں آپ کو عام مجلسی آداب سکھا دوں گا تا کہ آپ ذرا آدابِ محفل کے مطابق ٹھیک ہو کر بیٹھ جایا کریں ۔"

ایک روز علامہ اقبال نے اپنی عادتِ کتب بینی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جب میں گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل میں رہتا تھا تو تمام وقت اپنے کمرے میں مطالعے میں گزارتا تھا ۔ ایک روز قریبِ شام جب دیگر طلبائے ہوسٹل گراؤنڈ میں کھیل میں مصروف تھے اور میں پڑھنے میں مستغرق تھا ، تو ہمارے پرنسپل صاحب میرے کمرے میں تشریف لے آئے اور فرمانے لگے کہ تمام طالب علم باہر گراؤنڈ میں ورزش اور کھیل میں مصروف ہیں اور تم یہاں پڑھ رہے ہو ۔ میں نے ادب سے جواب دیا کہ یہ بھی تو اپنی جگہ ایک ورزش ہی ہے ۔

اقبال سے جن طلبہ نے گورنمنٹ کالج میں پڑھا وہ اکثر بعد میں بھی آپ سے ملنے آیا کرتے تھے ۔ مجھے یاد ہے کہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں جناب سلیمان خاں ، جو کہیں افسر مال تھے ، اور سکندر خاں ، جو سابق ہیڈ کلرک پنجاب یونیورسٹی کے صاحبزادے تھے ، جب بھی لاہور آتے ، علامہ کے یہاں ضرور حاضر ہوتے ۔ میں نے ان کو بارہا دیکھا تھا ۔ علی بخش بھی ان کی عزت کرتا تھا ۔ ایک مرتبہ وہ علامہ کے سامنے ان کے ایک لیکچر کا ذکر کر رہے تھے جو علامہ نے شیلے پر دیا تھا ۔ وہ دیر تک علامہ کے نظریاتِ شاعری پر گفتگو کرتے رہے ۔ علامہ کو انگریزی شعرا میں شیلے بہت پسند تھا ۔ غالباً علامہ نے خود یا ان کے کسی شاگرد نے

علامہ کی مدد سے شیلے کے نظریاتِ شاعری کے بارے میں ایک کتاب بھی شائع کی تھی۔ میں نے خود علامہ کے ہاں اس کے معمولی طباعت کے نسخے دیکھے تھے۔ اس پر شیخ محمد اقبال بحیثیتِ مصنّف درج تھا۔

مولوی محمد علی قصوری بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ۱۹۰۹ع سے لے کر ۱۹۱۱ع تک گورنمنٹ کالج لاہور میں علامہ سے پڑھا تھا جب وہ فلسفے کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے کئی انگریزی نظمیں بھی علامہ سے پڑھی تھیں۔ ان کا بیان ہے کہ علامہ اقبال دورانِ لیکچر اکثر مطالب سمجھانے کے لیے فارسی اشعار بطورِ مثال پیش کر کے انگریزی شعروں کا مفہوم واضح کیا کرتے تھے۔ انھوں نے بیان کیا تھا کہ ہم نے ملٹن کی نظم "Paradise Lost" اور ورڈز ورتھ کی نظم "Ode to Immortality" علامہ ہی سے پڑھی تھی۔ آپ نے ان کو اس خوش اسلوبی سے سمجھایا کہ آج تک یاد ہے۔ میں نے اپنی یادداشتوں کو ایک مرتبہ علامہ صلاح الدین سلجوقی افغانی کے سامنے بیان کیا جو ان دنوں بمبئی میں افغان گورنمنٹ کے کونسل تھے، تو ان کو بھی علامہ اقبال سے ملنے کا شوق ہوا۔ علامہ صلاح الدین سلجوقی مرحوم اسلامی رنگ کی خاص شان کے مالک تھے۔

علامہ اقبال کبھی کبھی گورنمنٹ کالج کے ماحول کا ذکر بھی کیا کرتے تھے۔ اس کالج میں جہاں اب مسجد تعمیر ہوئی ہے، اس کے قرب میں ایک خانقاہ کسی بزرگ کی تھی جہاں سال میں ایک مرتبہ عرس ہوتا تھا۔ جو لوگ اس میں شرکت کرتے تھے وہ زیادہ تر "ہیر وارث شاہ" پڑھا کرتے تھے۔ علامہ نے بھی اپنے زمانۂ طالب علمی میں ایسی بعض مجالس دیکھی تھیں۔ راقم

نے خود بھی آج سے پچاس سال قبل ایسی مجالس دیکھی ہیں جن میں مولوی غلام رسول مصنفِ "سوہنی مہینوال" جیسے عظیم پنجابی شاعر شامل ہوا کرتے تھے -

میر سید غلام بھیک نیرنگ بیان کرتے تھے کہ ہماری ہم سالہ صحبتوں میں ، جو اسی گورنمنٹ کالج میں ہوتی تھیں ، اقبال اپنی ایک تجویز بار بار پیش کیا کرتے تھے : یعنی وہ ملٹن کی مشہور نظم "Paradise Lost" اور "Paradise Regained" کا ذکر کر کے کہا کرتے تھے کہ میں بھی واقعاتِ کربلا کو اس رنگ میں نظم کروں گا کہ ملٹن کی "Paradise Regained" کا جواب ہو جائے، مگر اس کی تکمیل کبھی نہ ہو سکی - بقول سید غلام بھیک نیرنگ ، علامہ اس زمانے میں پروفیسر آرنلڈ سے بہت متاثر تھے -

جب پروفیسر ڈکنسن گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبۂ انگریزی کے صدر ہو کر علی گڑھ سے آئے تو وہ اکثر علامہ سے ملنے کے لیے ان کے گھر آتے تھے اور علمی معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے - علامہ نے ان کے دماغ سے ڈراما "دارا شکوہ" کا خیال نکال دیا تھا جس پر وہ بہت مصر تھے - علامہ نے تاریخ کی روشنی میں بحث کر کے بہت سے حقائق ان پر واضح کیے - علامہ کے یہاں ان کے آنے سے ایک علمی فضا نظر آیا کرتی تھی ، اور علامہ کو ان کی خاطر ذرا زیادہ ٹھوس علمی گفتگو کرنا پڑتی تھی - عموماً اسلامی

۱- رسالہ "ھلال" (فارسی - پاکستان) میں ایک قدیم گروپ تصویر گورنمنٹ کالج لاہور سے متعلق چھپی ہے - اقبال اس تصویر میں دیگر حضرات کے ہمراہ درمیان میں بیٹھے ہیں - غالباً یہ تصویر اُن ایام کی ہے جب اقبال وکالت کرنے کے ساتھ ساتھ کالج میں پروفیسر بھی تھے - (دیکھیے مسلسل شمارہ نمبر ۱۰۰ ، ج ۱۸) -

ثقافت گفتگو کا موضوع ہوا کرتی تھی ۔ علاوہ ازیں وہ اپنے زمانے کے بعض یوروپین پروفیسروں کے پڑھانے کے طریقے پر بھی گفتگو کیا کرتے تھے ۔

تجھ پر اے پنجاب نازل ہوں خدا کی رحمتیں
اے کہ تو اسلام کی دولت سے مالامال ہے
ہم نے مانا تو نہیں مسحورِ تہذیبِ فرنگ
تجھ میں سب کچھ ہے اگر اسلام اور اقبال ہے
(حضرت علامہ عبداللہ عمادی)

۹

کوچۂ ہنومان کا ایک واقعہ

ایک روز علامہ نے برسبیلِ تذکرہ کسی غیر مذہب پر گفتگو کے دوران میں بیان فرمایا کہ وہ ایک مرتبہ لاہور کے کوچۂ ہنومان میں ٹھہرے ہوئے تھے ۔ ہر روز علی الصبح ایک ہندو پنڈت جب نہایت دلکش اور بلند آواز میں کوئی بھجن گاتا تو میں بیدار ہو جاتا اور سوچتا کہ خدا جانے یہ کیا صدا لگاتا ہے ۔ آخر ایک صبح میں نے اس سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ محض دلکش آواز میں اپنی صدا کو ادا کرتا ہے ۔ علامہ نے خیال کیا کہ اگر یہ شخص اسی سریلی آواز میں اسلام کی حقانیت اور وحدانیت بیان کرتا تو کتنا اچھا ہوتا ۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ وہ زمانہ تھا جب میں ابھی گورنمنٹ کالج میں زیرِ تعلیم تھا ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اقبال کالج میں قیام کے زمانے میں اکثر اپنے بعض احباب کے ہاں آیا جایا کرتے تھے ۔

دراصل کوچۂ ہنومان میں مولوی صلاح الدین احمد مرحوم کا مکان تھا جہاں علامہ ان کے بڑے بھائی مولوی ضیاءالدین احمد کی وجہ سے جایا کرتے تھے جو گورنمنٹ کالج کے زمانے میں علامہ کے ہم جماعت تھے ۔ یہ مکان لاہور کے گُمٹی بازار سے آگے سید مٹھا

بازار کو جاتے ہوئے ایک تنگ کوچے (کوچۂ ہنومان) کے بائیں طرف واقع تھا ۔ میں نے بھی اس مکان کو دیکھا ہے ۔ اس کے چاروں طرف ہندوؤں کی آبادی تھی اور صرف یہی ایک مکان تھا جس میں مولوی صلاح الدین احمد کے والد مولوی احمد بخش پروفیسر چیفس کالج رہتے تھے ۔ یہاں مولوی صلاح الدین احمد نے اپنے فرزندِ اکبر وجیہ الدین احمد کی شادی بھی کی تھی جس کی دعوتِ ولیمہ میں سر عبد القادر ، پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اور قاضی محمد اسلم وغیرہ بہت سے احباب نے شرکت کی تھی ۔ شیخ عبد القادر اس مکان کے متعلق اپنے تاثرات یوں بیان فرماتے ہیں :

"جس زمانے میں میر غلام بھیک نیرنگ لا کالج میں پڑھتے تھے تو وہ اسی مکان میں رہتے تھے ۔ میر صاحب ، مولوی ضیاء الدین احمد کے بڑے گہرے دوست تھے ۔ اقبال مرحوم اور میں اکثر ان سے ملنے یہاں آیا کرتے تھے ۔ ہمارے ایک دوست کدار ناتھ چوپڑا بھی ہمارے ساتھ ہوتے تھے ۔ مولوی ضیاء الدین احمد اور میر نیرنگ کو کسرت کا بہت شوق تھا ۔ اس کے ایک کونے میں ایک اکھاڑہ بھی انھوں نے بنا رکھا تھا جہاں وہ کُشتی لڑتے تھے ۔ کبھی کبھی اقبال مرحوم کو شوق آتا تو وہ بھی لنگوٹ باندھ کر اکھاڑے میں اترتے اور میر صاحب کے ساتھ ان کا دنگل بڑا لطف دیتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔"

افسوس کہ مولانا صلاح الدین احمد کا یہ مکان مارچ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جل گیا تھا اور اب وہ موجود نہیں ہے ۔ مولانا صلاح الدین احمد کے ایک بڑے بھائی حافظ فیروزالدین احمد تھے ۔ مولوی ضیاء الدین احمد بمبئی پولیس میں ملازم تھے اور حافظ

فیروزالدین پنجاب میں پولیس آفیسر تھے۔ میں نے ان کے ہاں امرتسر میں ۱۹۱۵ء میں ایک دعوت میں شرکت کی تھی جو اُنھوں نے حکیم بھورے میاں کے اعزاز میں دی تھی۔

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اقبال اپنے قیامِ لاہور کے ابتدائی دنوں میں اَور کہاں آتے جاتے تھے۔ یہ واقعہ محض اتفاق سے یاد رہ گیا ہے۔

۱۰

لاہور میں علامہ کی قیام گاہیں

بھاٹی دروازہ :

علامہ اقبال گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل کو چھوڑ کر سنہ ۱۹۰۰ء کے فوراً بعد بھاٹی دروازے کے اندر کرائے کے ایک مکان میں منتقل ہوگئے تھے ۔ غالباً بھاٹی دروازے کی ادبی محفلوں نے علامہ کو اپنی طرف متوجہ کیا ہوگا ۔ انھوں نے یہاں آکر کئی مکان بدلے ۔ پہلا مکان ، جس میں وہ قیام پذیر ہوئے ، میاں احمد بخش کی ملکیت تھا ۔ اس کے ایک طرف مولوی محمد باقر پروفیسر فارسی (مشن کالج) رہا کرتے تھے اور ذرا فاصلے پر آگے جا کر شمس العلماء مولوی محمد حسین (پروفیسر عربی ، مشن کالج) کی رہائش تھی ۔ اسی بازار میں مولوی حاکم علی پروفیسر اسلامیہ کالج اور مفتی عبداللہ ٹونکی کا قیام بھی تھا ۔ موجودہ حالت میں اس مکان کا تعیّن ہمارے لیے ممکن نہیں ۔ البتہ کچھ عرصے کے بعد علامہ جس دوسرے مکان میں آئے اس کے بارے میں حتمی طور پر بعض معلومات پیش کی جا سکتی ہیں ۔ بھاٹی دروازے کے اندر جا کر تھوڑے ہی فاصلے پر دائیں طرف یہ مکان موجود ہے ۔ آج کل اس کا نمبر ۳۱۷ ۔ بی ہے ۔ مکان کے ساتھ

ہی ایک گلی مڑتی ہے جو کوچہ جلوٹیاں کہلاتی ہے ۔ کوچے کے موڑ پر ایک کنواں ہے جس کے ساتھ ہی ایک سیڑھی اوپر جاتی ہے ۔ اسی کی بالائی منزل پر علامہ اقبال چند مہینے رہے ۔ عرفِ عام میں یہ مکان ُمولی پٹاں کا مکان کہلاتا ہے ۔ اس کا مالک کھنڈو ارائیں تھا جس نے بعد میں اسے رائے بہادر لالہ رام سرنداس کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا ۔ تقسیمِ برِعظیم کے بعد یہ متروکہ جائداد میں شامل ہے ۔

چند ماہ بعد علامہ اقبال اس مکان کے قریب ہی مکان نمبر ۵۹۷ ۔بی میں آٹھ آئے ۔ اس مکان کو بھی بعد میں لالہ رام سرنداس نے خرید لیا تھا ۔ یہاں علامہ کا قیام انگلستان جانے تک رہا ، یعنی ۱۹۰۵ء تک ۔ علامہ سے پہلے اس مکان میں مولوی حاکم علی رہا کرتے تھے ۔ انھی کے مکان چھوڑنے پر علامہ اس میں آئے تھے ۔ مکان کا دروازہ گلی کے اندر ہے ۔ اوپر کی منزل میں بازار کے رخ تین کھڑکیاں اور تین بخارچے تھے ۔ علامہ اسی مکان میں قیام پذیر تھے جب ۱۹۰۵ء کا زلزلہ آیا تھا مگر وہ بخارچے میں بیٹھے اطمینان سے مطالعہ کرتے رہے ، حالانکہ زلزلے کے اثر سے دوسرا بخارچہ ٹوٹ گیا ۔ اسی مکان[1] میں علی بخش ان کی ملازمت میں آیا ۔ اس مکان کے قریب ہی علامہ کے ہم وطن شیخ گلاب دین مختارِ عدالت بھی رہائش پذیر تھے ۔ حکیم شہباز الدین کے مکان پر بدستور لطفِ صحبت

۱۔ اس مکان پر میں نے ۱۹۵۲ء میں ''بزمِ اقبال'' لاہور کی معرفت سنگ مرمر کی ایک تختی لگائی تھی جو ہنوز موجود ہے ۔ اس پر علامہ کے قیام کی تاریخیں بھی درج ہیں ۔

رہتا ۔ کہا جاتا ہے کہ علامہ روزانہ وہاں جاتے تھے ۔ مکان کے باہر ایک چبوترا تھا جس پر محفل جمتی تھی ۔ حقہ نوشی کے لیے ایک پیسے کا تمباکو منگوایا جاتا اور سب مل کر حظ اٹھاتے ۔ علامہ اقبال ان دلچسپ محفلوں کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے ۔

چنگڑ محلہ ، موہن لال روڈ :

۲۷ اگست ۱۹۰۵ء کو علامہ اقبال ولایت تشریف لے گئے اور ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو واپسی ہوئی ۔ احباب کے مشورے سے وکالت کرنے کا پروگرام بنا تو موہن لال روڈ پر رہائش کا بندوبست کیا گیا ۔ علی بخش کو بھی بلا لیا گیا ۔ اس زمانے میں یہ مکان لالہ چونی لال مونگا کی ملکیت تھا ۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس میں بٹ سٹیشنری مارٹ کے نام سے سٹیشنری کی دکان قائم ہوئی ۔ آج کل یہ عمارت بدل چکی ہے ۔ ستمبر ۱۹۰۸ء تک علامہ اقبال کا قیام اسی عمارت میں رہا ۔

انارکلی :

اکتوبر ۱۹۰۸ء کو علامہ موہن لال روڈ (اردو بازار) والے مکان سے انارکلی والے مکان میں اٹھ آئے ۔ منشی طاہر الدین کے مشورے سے یہ مکان کرائے پر لیا گیا تھا ۔ علامہ سے قبل اس مکان میں سر فضل حسین اور میاں شفیع بھی رہ چکے تھے ۔ اب اس مکان کو گرا کر اس کی جگہ نیو مارکیٹ قائم ہو چکی ہے ۔ علامہ کے ہاں راقم کی حاضری اسی انار کلی والے مکان سے شروع ہوئی ۔ دسمبر ۱۹۱۴ء کے آخر میں علامہ کی شادی لدھیانہ میں ہوئی اور میں جنوری ۱۹۱۵ء کی ابتدا میں لدھیانے میں ملازم ہوا ۔ مجھے علامہ کی اہلیہ

کے عزیزوں کے قریب ہی مکان مل گیا تھا ۔ وہ لاہور آتے تھے تو
میرا بھی آنا جانا ہو گیا ۔ علامہ اقبال مجھے ''ماسٹر'' کے نام سے
پکارا کرتے تھے ۔ اس دور کی اکثر محفلیں میری دیکھی ہوئی ہیں ۔
علامہ اس مکان کی بالائی منزل میں بازار والے حصے کی طرف رہتے
تھے ۔ عقب میں کھڑکیاں تھیں ۔ پچھواڑے میں ایک اور مکان بھی
تھا جس میں منشی طاہر الدین رہا کرتے تھے ۔ علامہ اقبال نے ایک
گگ رکھی ہوئی تھی ۔ وہ خود ہی اس گگ کو ہائی کورٹ تک لے
جاتے تھے ۔ ۱۹۱۹ء میں جب امرتسر میں کانگرس کا جلسہ ہوا تو
علامہ اقبال اسی مکان سے امرتسر گئے تھے ۔ انھی دنوں لاہور میں
مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کا جلوس نکلا تھا اور انھوں نے
انارکلی والے اسی مکان میں آ کر نماز عصر ادا کی تھی ۔ کچھ سیاسی
گفتگو بھی ہوئی تھی ۔ نظم ''خضر راہ'' بھی اسی مکان میں لکھی گئی
تھی جو انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے منعقدہ اسلامیہ ہائی
سکول شیرانوالہ دروازہ میں پڑھی گئی تھی ۔ اقبال نظم پڑھنے کے
دوران میں شلوار اور کوٹ پہنے ، سر پر لُنگی باندھے اور ہاتھ میں
چھڑی لیے تھے ۔ ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' بھی یہیں
لکھی گئی تھیں ۔ ''پیامِ مشرق'' کی پہلی اشاعت بھی یہیں سے ہوئی ۔
اسی مکان میں آپ کے ہاں مولانا گرامی بھی آیا کرتے تھے ۔

میکلوڈ روڈ :

۱۹۲۲ء کے اواخر میں علامہ اقبال انارکلی والے مکان کو
چھوڑ کر میکلوڈ روڈ کی کوٹھی میں آ گئے ۔ پہلے اکثر ان کا بھاٹی
دروازے آنا جانا رہتا تھا مگر یہاں آ کر کم ہوگیا ۔

یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو آپ کو 'سر' کا خطاب ملا تھا ۔

میکلوڈ روڈ کی رہائش کا اس خطاب سے گہرا تعلق ہے۔ یہ کوٹھی جج سید محمد لطیف مصنفِ ''تاریخ لاہور'' کی بیوی کی ملکیت تھی۔ مکان کا کرایہ وصول کرنے اور اس کی دیکھ بھال کرنے کا کام سید محمود احمد کیا کرتے تھے جو ہائی کورٹ میں ملازمت کرتے تھے اور پھر سبکدوش ہو گئے تھے۔ کوٹھی کا نمبر ۲۴ تھا۔ اب اسے پاکستان گورنمنٹ نے محکمۂ آثار قدیمہ کی تحویل میں دے دیا ہے۔ کوٹھی کا صرف ایک حصہ حکومت نے لیا ہے اور وہاں اقبال کے متعلق لائبریری قائم کی ہے۔ دوسرا حصہ، جس میں علامہ کی لائبریری، منشی خانہ اور ملازمین کی رہائش تھی، کسی اور کی ملکیت ہے۔ اس مکان میں منتقل ہونے کی روداد علامہ اقبال نے اپنے بعض خطوط میں بھی بیان کی ہے۔ مولانا گرامی کو ۴ اکتوبر ۱۹۲۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''میں نے مکان بھی تبدیل کر لیا ہے۔ مرزا جلال الدین صاحب کے قریب ہے۔ ایک کوٹھی ایک سو ستر روپے کرائے پر لے لی ہے۔ آپ تشریف لائیں گے تو آپ کو زیادہ آسائش ملے گی۔ آپ ضرور تشریف لائیے . . . مصطفیٰ کمال شاپا کی فتوحات کا مادۂ تاریخ یہ ہے:

شاخِ ابراہیم را نم مصطفیٰ
سالِ فتحش اسمِ اعظم مصطفیٰ

۱۳۴۱ھ''

اس کے بعد ۱۱- اکتوبر ۱۹۲۲ء کو آپ پھر مولانا گرامی کو لکھتے ہیں:

''. . . مصطفیٰ کمال پاشا کی تاریخِ فتح پر مصرع ایزاد کر کے آپ نے مادۂ تاریخ کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ جب

ذرا صحت ہو جائے تو ضرور تشریف لائیے ۔ اب تو سردی
کا موسم آ رہا ہے ۔ میں دو چار روز تک نئے مکان میں
منتقل ہو جاؤں گا ۔ نواب صاحب (ذوالفقار علی خاں) بھی
شملہ سے تشریف لے آئے ہیں ......"[1]

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ علامہ دسمبر کے آغاز میں نئے
مکان میں آ گئے تھے اور یکم جنوری ۱۹۲۳ع کو انھیں "سر" کا
خطاب ملا تھا ۔ مکان کی شکل و صورت بنانے میں علامہ کے بڑے
بھائی شیخ عطا محمد نے بڑا کام کیا تھا ۔ وہ اس مکان کو بنانے سنوارنے
کے لیے سیالکوٹ سے آ کر کئی مہینے لاہور میں قیام پذیر رہے تھے ۔
علامہ کی زندگی کے اہم واقعات اسی مکان کے دورانِ قیام سے تعلق
رکھتے ہیں ۔ وہ کم و بیش ساڑھے تیرہ برس یہاں رہے اور مئی ۱۹۳۵ع
میں اپنے ذاتی مکان میں منتقل ہوئے ۔ میں ۱۹۲۴ع سے مستقل طور
پر لاہور آ گیا تھا اور اکثر علامہ کی خدمت میں حاضر رہنے کا موقع
ملتا تھا ۔

اسی مکان میں قیام کے زمانے میں "پیامِ مشرق" کا دوسرا
ایڈیشن چھپ کر آیا تھا ۔ مطبع جامعۂ ملیہ نے اسے بڑے اہتمام سے
شائع کیا تھا ۔ اس کے فوراً بعد "بانگِ درا" کا پہلا ایڈیشن چھپا
تھا ۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے الیکشن کے ہنگامے (۱۹۲۷ع)
بھی اسی مکان میں رہائش کے دور سے تعلق رکھتے ہیں ۔ جب
"رنگیلا رسول" کے خلاف جلسے ہوئے اس وقت بھی علامہ کا قیام
یہیں تھا ۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی گرفتاری اسی کوٹھی کے باہر

۱۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی ، مرتبۂ محمد عبداللہ قریشی ، کراچی ۱۹۶۹ع ،
ص ۲۳۱ ، ۲۳۰ ۔

عمل میں آئی تھی - مسجدِ شہید گنج ، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس اور مدراس لیکچرز کا دور بھی یہی ہے - مدراس لیکچرز کی تیاری کے سلسلے میں فراہمیٔ مواد کے ضمن میں بھی راقم کو کچھ خدمت کا موقع ملا اور جنوبی ہند کے اس سفر کی رفاقت بھی نصیب ہوئی - لیکچروں کی تیاری کے سلسلے میں علامہ اکثر علمائے دین سے مشورہ کرتے تھے - مولانا سید طلحہ مرحوم نے مشورہ دیا تھا کہ امام شاطبی کی کتاب 'الموافقات' کا مطالعہ قیاس کے ضمن میں کیا جائے - اسی طرح مولانا اصغر علی روحی کو بھی میں ایک روز علامہ کی کوٹھی پر لے گیا تھا - مجھے یاد ہے کہ علامہ کوٹھی کے درمیانی حصے میں بیٹھے تھے اور حُقّے کی نے ہاتھ میں تھی - مولانا نے بے تکلفی سے حُقّے کا رخ اپنی طرف کر لیا مگر معلوم ہوا کہ حقہ بجھا ہوا ہے - اس پر علامہ نے فرمایا کہ میں تو حُقّے سے محض باتیں کر رہا تھا - یہ کہہ کر علی بخش کو حُقہ تازہ کر کے لانے کو کہا اور مولانا روحی اپنے مخصوص رنگ میں گفتگو کرنے لگے - بعض حوالوں کے سلسلے میں مولانا نے کہا کہ وہ لوگ بکتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مترادفات سے ایک ہی طرح کے معنی مقصود ہیں - نہیں ، ہر لفظ الگ الگ اپنا خاص معنی اور مفہوم رکھتا ہے -

علامہ کے قیام کے دوران میں اس کوٹھی کی مرمت ہوتے کبھی نہیں دیکھی گئی - اکثر دیواروں سے پلستر غائب تھا -

ایک دفعہ کا ذکر ہے ، سخت گرمی کا زمانہ تھا - پروفیسر ڈکنسن ، جو گورنمنٹ کالج لاہور میں ان دنوں تازہ تازہ علی گڑھ سے آئے تھے ، علامہ کے ہاں آئے - کوٹھی کے درمیانی کمرے میں علامہ کی نشست تھی اور نہایت بے ترتیبی سے کمرے کی دیوار پر ملکۂ وکٹوریہ کی رنگین تصویر بغیر شیشے کے آویزاں تھی - پروفیسر

ڈکنسن کی نظر جب تصویر پر پڑی تو مسکرا کر علامہ سے پوچھا کہ آپ کو تصاویر کا ذوق بھی ہے؟ علامہ نے تصویر کو اپنے ہاتھ سے ذرا سی حرکت دی تو پیچھے سے دیوار میں ایک شگاف نمودار ہوا جسے تصویر نے ڈھانپ رکھا تھا اور یہی اس تصویر کا مصرف تھا۔

ڈاکٹر سید محمد حسین ہر روز ۹ - ۱۰ بجے کے قریب اس کوٹھی میں اپنے ٹانگے میں آتے اور بے تکلفی سے سیدھے زنانے میں چلے جاتے۔ پھر خیر و عافیت معلوم کر کے واپس چلے جاتے۔ علی بخش ان کے ہمراہ رہتا۔ وہ واپس جانے سے پہلے علامہ سے بھی دریافت کرتے ''اقبال کیا حال ہے'' ؟ علامہ اسی طرح ادب سے جواب دیتے ''شاہ صاحب خیریت ہے''۔ ایسا لگتا تھا کہ اس شخص کا اپنا گھر ہے۔ اگر دوا کی ضرورت ہوتی تو علی بخش احمدیہ بلڈنگ میں ان کے مطب سے لے آتا۔ اپنے بعض احباب سے اقبال کے اسی طرح کے گھریلو تعلقات تھے جن کا عوام کو بالکل علم نہیں تھا۔

ایک روز علامہ دردِ گردہ میں مبتلا تھے۔ مرحوم بشیر احمد ـــــ مولوی احمدالدین وکیل کا لڑکا ـــــ مزاج پرسی کے لیے آیا۔ اس وقت اقبال اندرونِ خانہ بلند آواز سے بیدل کی غزل سکون حاصل کرنے کے خیال سے پڑھ رہے تھے اور بار بار یہ مصرع دہراتے تھے:

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسبابِ جہاں

پھر علامہ کو بشیر احمد کی آمد کا علم ہوا تو اسی حالت میں وہ باہر آ گئے۔ منشی طاہر الدین نے خیریت دریافت کی تو جواب پھر اسی مصرع سے دیا۔ بشیر مرحوم سے اس طرح ملے جیسے ان کا اپنا لڑکا آ گیا ہو مگر اس کو جسم دبانے کی زحمت نہ دی۔

ایک مرتبہ بیماری سے کچھ افاقہ تھا مگر ہائے ہائے برابر کر

رہے تھے ۔ منشی طاہر الدین نے دریافت کیا ''خیر تو ہے ؟'' جواب دیا ''میں ذرا بیماری کی یاد تازہ کر رہا ہوں ۔''

۱۹۲۴ء میں دیوبند کے علمائے کرام کی آپ نے نہایت شاندار دعوت کی تھی جس میں مولوی احمد علی مرحوم ، مولانا سید انور شاہ صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ اور ان کے دوسرے رفقائے دیوبند کے علاوہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ، مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور دیگر حضرات مدعو تھے ۔ مسئلۂ سود پر گفتگو ہوئی اور نہ معلوم کن کن نکات نے جنم لیا ۔

اسی کوٹھی میں قیام کے زمانے میں آپ کابل گئے تھے ۔ جب آپ ریلوے سٹیشن جانے کے لیے موٹر میں سوار ہو رہے تھے تو اتفاق سے پوسٹ مین نے آ کر خطوط دیے ۔ ان میں سے ایک خط میں کسی نے خاقانی کے اشعار کا مطلب دریافت کیا تھا ۔ آپ کو خط کا جواب فوراً دینے کی عادت تھی مگر اس وقت آپ کے لیے جواب دینا ایک مسئلہ بن گیا ۔ میں ہمراہ تھا ، میں نے فوراً کہا کہ آپ یہ خط پروفیسر محمود شیرانی کے حوالے کر جائیں ، وہ اس کا جواب لکھ دیں گے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ آپ نے اسی وقت پروفیسر شیرانی[1] کے نام چند جملے لکھ کر خط علی بخش کو دے دیا کہ ان تک پہنچا دے ۔

اقبال کی مجلس میں ظرافت ہر وقت جلوہ گر رہتی تھی ۔ ایک روز میں ان کے ہاں حسبِ معمول آیا تو انھوں نے دریافت کیا کہ فلاں کتاب نہیں لائے ؟ اور فلاں شخص سے نہیں ملے ؟ میں

۱۔ 'اقبال نامہ' میں علامہ اقبال کے یہ جملے محمود شیرانی کی بجائے غلطی سے اختر شیرانی کے نام منسوب ہوگئے ہیں ۔ (دیکھیے اقبال نامہ ، حصہ دوم ، ص ۳۵۱) ۔

گرمی کی وجہ سے پوری طرح سنبھلا نہیں تھا ۔ میں نے فوراً کہا ''دیکھو ! جی وقت ملتا ہے مگر فرصت نہیں ملتی ۔'' اس پر ڈاکٹر صاحب نے قہقہہ لگایا اور علی بخش کو آواز دی کہ فوراً سہر اور سالک کو بلا کر لاؤ ۔ ماسٹر نے فلسفے کا ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے ۔ ساتھ ہی کسی طرح چودھری محمد حسین کو بھی اطلاع دے دو ۔ بعد میں احباب میں یہ واقعہ بار بار دہرایا جاتا رہا ۔

میں ایک روز صبح صبح پہنچا تو کہنے لگے ''آؤ آج چودھری شہاب الدین کے ہاں چلیں ۔'' ہم موٹر میں چودھری صاحب کے ہاں پہنچے ۔ وہ غسل کر کے دھوپ میں بیٹھے تھے ۔ انھوں نے فوراً علامہ سے کہا کہ کوئی ایسی ویسی بات مت کرنا ۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ہماری کیا مجال ہے ۔ مگر ساتھ ہی ان کے ننگے بازو پر چٹکی لے کر پوچھا ''آپ نے یہ صُوف کیا بھاؤ لیا ہے ؟'' چودھری صاحب بہت سیاہ فام تھے ۔

جب علامہ کونسل کے الیکشن میں کامیاب ہو گئے تو حاجی دین محمد کاتب نے ضیافت کی ۔ ان کی دعوتِ پلاؤ بہت مشہور تھی ۔ ہم جب کوٹھی سے باہر نکل رہے تھے تو ایک صاحب آگے آ کر ملے اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو ؟ علامہ نے فوراً جواب دیا ''مت پوچھو ، آج پلاؤ کی شہادت کا دن ہے ۔''

جاوید منزل :

علامہ کا آخری قیام ان کی ذاتی کوٹھی ''جاوید منزل'' میں تھا جو میو روڈ (موجودہ علامہ اقبال روڈ) پر واقع ہے ۔ علامہ نے یہ زمین جاوید اقبال کے نام پر خریدی تھی اور بڑے شوق سے کوٹھی بنوائی تھی ۔ آپ اس میں ۱۹۳۵ء میں آ گئے تھے ۔ ابھی اس

میں آئے ہوئے چند ہی ماہ گزرے تھے کہ والدۂ جاوید کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے مرحومہ کی تاریخِ وفات ''سرمہ ٔ ما ذاغ'' سے ۱۳۵۴ھ نکالی تھی جو ان کی لوحِ مزار پر لکھی ہوئی ہے۔ اس زمانے میں علامہ کی اپنی صحت بھی اچھی نہیں رہتی تھی۔ چنانچہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اسی مکان میں آپ نے انتقال فرمایا۔

☆ ☆ ☆

۱۱

اعلیٰ تعلیم کے لیے سفر یورپ

جب آپ ۱۹۰۵ء میں لاہور سے اپنے تعلیمی سفر کے لیے یورپ روانہ ہوئے تھے تو پہلے پہل دہلی پہنچے تھے۔ دہلی کے قیام کی تمام تفصیلات میر سیّد غلام بھیک نیرنگ کے اس مضمون میں ملتی ہیں جو ''مخزن'' کے اکتوبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا (غلام بھیک نیرنگ خود بھی آپ کے ہمراہ تھے)۔

دہلی پہنچنے پر خواجہ حسن نظامی اور محکمۂ تعلیم کے منشی نذر محمد نے آپ کا استقبال کیا تھا۔ پھر علامہ نے حضرت نظام الدین اولیا کے آستانے پر حاضری دی اور اپنی نظم ''التجائے مسافر'' کو دلکش آواز میں پڑھا۔ حضرت نظام الدین اولیا کے آستانے پر موجود قوالوں نے بہت عمدہ قوالی بھی پیش کی تھی۔ اس کے بعد آپ مرزا غالب کے مزار پر گئے اور فاتحہ پڑھی۔

یہ تمام حالات خواجہ حسن نظامی اور ملّا واحدی نے اخبار ''وطن'' اور ''منادی'' میں بھی تحریر کیے ہیں۔

☆ ☆ ☆

۱۲

عطیہ بیگم ۔ پروفیسر آرنلڈ

(ڈاکٹریٹ کی تیاری)

علامہ اقبال کے سوانح پر قلم اٹھانے والا کوئی بھی مصنّف عطیہ بیگم کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ بعض لکھنے والوں نے اس ضمن میں افراط و تفریط سے بھی کام لیا ہے اور واقعات کے پس منظر کو مدِ نظر نہیں رکھا ۔ برِعظیم پاک و ہند کی ان دونوں صاحبِ علم ہستیوں کی تحریریں ہمارے پاس موجود ہیں جو ہماری رہنمائی بوجوہِ احسن کرتی ہیں بشرطیکہ سلیم الطبعی سے ان کا تجزیہ کیا جائے ۔

علامہ اقبال اور عطیہ بیگم کی پہلی ملاقات یورپ میں یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو ہوئی تھی ۔ علامہ اقبال ان دنوں پروفیسر آرنلڈ کی زیرِ ہدایت اپنا مقالہ لکھ رہے تھے اور عطیہ بیگم حال ہی میں ہندوستان سے آئی تھیں ۔ چنانچہ عطیہ بیگم اقبال سے اپنی پہلی ملاقات اور سفرِ یورپ کی بابت لکھتی ہیں :

”مجھے لندن مسلم گرلز انسٹیٹیوٹ ڈھاکہ میں استانی مقرر کرنے کے لیے کورنیلیا سہراب جی اور برٹش گورنمنٹ نے ایک وظیفے کا انتظام کیا اور سفرِ یورپ کے لیے

فرسٹ کلاس کا ٹکٹ مہیا کیا گیا ۔ اگرچہ مجھ میں کوئی خاص لیاقت نہیں تھی مگر حکام کو یقین تھا کہ میں ضرور کامیاب رہوں گی ۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ لندن میں اقبال سے بھی ملاقات کروں ۔ چنانچہ ۲۲۔ اگست ۱۹۰۶ع کو میں جہاز سے روانہ ہوگئی ۔ میں لندن پہنچی تو مس بیک نے ، جو علی گڑھ کے پروفیسر بیک کی ہمشیرہ ہیں ، ۲۱ کورن ویل روڈ پر میرے لیے انتظام کیا ہوا تھا جہاں ہندوستان سے آئے ہوئے لڑکے جمع ہوتے تھے ۔

یکم اپریل ۱۹۰۷ع کو مس بیک نے مجھے مدعو کیا اور بتایا کہ عنقریب تمھاری ملاقات ایک نہایت قابل آدمی اقبال سے ہوگی جو کیمبرج سے تمھیں ملنے کے لیے آ رہے ہیں ۔ وہ تمھیں سیّد علی بلگرامی کی طرف سے کیمبرج آنے کی دعوت بھی دیں گے ۔ سیّد علی بلگرامی صاحب نے مجھے اپنی کتاب ''تمدنِ عرب'' (ترجمہ از فرانسیسی) کا ایک نسخہ بھی عنایت فرمایا تھا ۔ چنانچہ اقبال سے ملاقات ہوئی اور میں نے انھیں بہت بڑا سکالر پایا ۔ وہ عربی ، فارسی اور سنسکرت سب زبانیں بخوبی جانتے تھے ۔ وہ بہت ظریف الطبع اور قادر الکلام آدمی تھے ۔ اقبال نے مجھ سے فرمایا کہ آپ اپنے سفرنامے کی وجہ سے ہندوستان میں اور یہاں بہت مقبول ہیں ۔ انھوں نے اپنی آمد کی غرض و غایت بتاتے ہوئے فرمایا کہ میں یہاں آپ سے تعارف کی غرض سے آیا ہوں اور نیز سیّد علی بلگرامی صاحب کی طرف سے کیمبرج آنے کا دعوت نامہ بھی لایا ہوں ۔ آپ ضرور کیمبرج آئیں ۔ میں نے دورانِ گفتگو ان

سے پوچھا کہ آپ لندن کس غرض سے آئے ہیں ؟ انھوں نے فرمایا کہ مجھے فلسفہ پڑھنے کا بے حد شوق ہے - جو کچھ یہاں میسر ہے وہ حاصل کروں گا ، پھر جرمنی اور فرانس جاؤں گا کیونکہ وہاں بہت کچھ ہے جو یہاں نہیں ہے - اقبال ، حافظ کے بہت شائق معلوم ہوتے تھے بلکہ وہ حافظ کے حافظ تھے - انھوں نے بتایا کہ جب مجھ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے تو حافظ کی سپرٹ مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں - میں نے بھی حافظ کو بہت پڑھا تھا لہٰذا گفتگو کے دوران میں جگہ جگہ میں حافظ کے اشعار سناتی رہی - اس سفرنامے کا ذکر بھی ہوا جو ''تہذیبِ نسواں'' میں چھپتا تھا اور کہا کہ زہرہ بیگم بہت قابل خاتون ہیں - اقبال نے کہا کہ میں ایران میں رہ چکا ہوں - انھوں نے کہا کہ آپ بابا فغانی کو ضرور پڑھیں - ہندوستان میں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ فغانی کتنے بڑے پائے کے شاعر ہیں -''

علامہ اقبال نے بھی اپنی ڈائری میں عطیہ بیگم سے پہلی ملاقات کا ذکر کیا ہے - چنانچہ وہ بھی یکم اپریل ۱۹۰۷ع کو عطیہ بیگم سے اپنے مراسم کے آغاز کی تاریخ بتاتے ہیں -

اس موضوع پر قلم اٹھانے والے حضرات کو یہ امر ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ علامہ اقبال اور عطیہ بیگم اپنے وقت کے نابغۂ روزگار لوگوں میں سے تھے اور وہ عام انسانوں سے بہت بلند مقام رکھتے تھے - ہم جس سطح سے ان کی ذات کو موضوعِ بحث بناتے ہیں ، وہ دراصل ہماری اپنی ذہنی سطح ہوتی ہے اور ان بلند پایہ

ہستیوں کو بھی ہم اسی سطح پر گھسیٹ لاتے ہیں جو کسی طرح مناسب نہیں ۔

عطیہ بیگم قسطنطنیہ میں پیدا ہوئیں ۔ ان کے والد حسن آفندی ترکی کے دربارِ سلطانی میں بہت زیادہ اثر و رسوخ کے مالک تھے ۔ عطیہ بیگم کی تعلیم و تربیت ترکی ہی میں ہوئی ۔ جب ان کے والد فوت ہوگئے تو یہ خاندان بمبئی میں آ گیا ۔ یہاں اس خاندان کے مراسم طیّب جی خاندان سے ہو گئے ۔ یہ تین بہنیں تھیں جن میں سے عطیہ بیگم سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ذہین تھی ۔ وہ ترکی ، انگریزی ، فرانسیسی ، جرمن ، اردو اور گجراتی زبانیں بہت اچھی طرح جانتی تھی اور ایک اعلٰی خاندان کی تربیت یافتہ ہونے کی حیثیت سے سوسائٹی میں ایک نمایاں مقام رکھتی تھی ۔ اقبال اس کی شائستگی ، اعلٰی ادبی ذوق ، ذہانت اور علم و فضل میں اس کے بلند مقام کو سراہتے تھے ۔ اور یہ ایسے صفات تھے جو خود اقبال میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھے اور یہی بات ان دونوں میں قدر مشترک بھی تھی ۔

غالباً ۱۹۴۶ء میں نواب حسن یار جنگ بہادر (حیدرآباد دکن) کی ملاقات عطیہ بیگم سے ہوئی تو انھوں نے عطیہ بیگم کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ حیدرآباد کی بزمِ اقبال کے سالانہ جلسے میں اقبال سے متعلق اپنی یادداشتیں پڑھ کر سنائیں ۔ چنانچہ انھوں نے با دلِ ناخواستہ اپنی یادداشتوں کو اقبال کے خطوط کی روشنی میں مرتّب کیا جو ان کے پاس محفوظ تھے اور اس مقالے کا نام ''اقبال'' رکھا ۔

عطیہ بیگم اپنے اس مقالے میں لکھتی ہیں کہ ۲۲ اگست ۱۹۰۷ء کو ہائیڈل برگ (جرمنی) کا ماحول پراسرار سا تھا اور یونیورسٹی کے اساتذہ حیران تھے کہ اقبال کو اس خاص کیفیت سے

کیسے واپس لایا جائے جس میں وہ گزشتہ رات سے مبتلا ہے ۔ اقبال، آن دنوں ہائیڈل برگ میں اپنا فلسفے کا تحقیقی مقالہ مکمل کر رہے تھے اور اسی غرض سے ہائیڈل برگ میں وہ مقیم تھے ۔[1] اس سے پہلے لندن میں بھی ان سے ملاقات ہو چکی تھی ۔ اس کے بعد وہ لندن میں اقبال سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتی ہیں اور کیمبرج میں سیّد علی بلگرامی کی دعوت کا ذکر بھی کرتی ہیں ۔ اس دعوت میں جو تصویر لی گئی تھی ، عطیہ بیگم نے وہ بھی اپنی کتاب میں شائع کی ہے ۔ اس میں شیخ عبدالقادر اور دیگر حضرات کے علاوہ عطیہ بیگم اور اقبال بھی بیٹھے ہوئے ہیں ۔

عطیہ بیگم نے اپنی کتاب میں پروفیسر آرنلڈ کا ذکر بھی کیا ہے جو ہندوستان میں اقبال کے استاد تھے اور جب اقبال یورپ آ گئے تو یہاں بھی انھیں آرنلڈ جیسے مشفق اور مہربان استاد کی رہنمائی

۱- ۱۹۰۷ء - ۱۹۰۸ء کے دوران میں علامہ لندن سے ہیڈل برگ (جرمنی) تشریف لے گئے تھے اور اسی شہر میں قیام کے دوران میں آپ نے اپنا مقالہ ''ڈویلپمنٹ آف میٹا فزکس ان پرشیا'' تحریر فرمایا تھا ۔ یہ یونیورسٹی اس زمانے میں بھی علمی خزانوں کے لیے مشہور تھی ۔ پروفیسر آرنلڈ چونکہ ہیڈل برگ کے علمی خزانوں سے بخوبی آگاہ تھے لہٰذا اُنھوں نے علامہ کے لیے اسی جگہ کا انتخاب کیا اور ان کو تحقیقی کام کے لیے یہاں قیام کرنے پر آمادہ کیا ۔ یہ ماحول علامہ کے لیے بہت سازگار تھا ۔ چنانچہ علامہ نے اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری میونخ (جرمنی) یونیورسٹی سے حاصل کی جو ہیڈل برگ سے تقریباً چار سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے ۔
علامہ اقبال کے اس قیام کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے اب حکومت جرمنی نے وہاں ایک یادگاری پتھر بھی نصب کرا دیا ہے جس پر علامہ اقبال کا نام اور دیگر تفصیلات درج ہیں ۔

میتسر رہی ۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ میں پروفیسر آرنلڈ کی دعوت پر کیمبرج میں ایک پکنک پارٹی میں شریک ہوئی ۔ یہ پارٹی دریا کے کنارے ترتیب دی گئی تھی ۔ موت و حیات کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر آرنلڈ نے اقبال کو دعوت دی کہ وہ بھی اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرے ۔ پہلے تو اقبال خاموش رہے مگر آخر میں انھوں یہ جملہ کہا ”زندگی دراصل موت کی ابتدا ہے اور موت زندگی کی ابتدا ۔“ اقبال کے اسی فقرے پر بحث کا خاتمہ ہو گیا ۔ آگے چل کر وہ لکھتی ہیں :

”میں ۹ جون ۱۹۰۷ع کو پروفیسر آرنلڈ کے ہاں کھانے پر مدعو تھی ۔ اقبال بھی موجود تھے ۔ اس موقع پر پروفیسر آرنلڈ نے ایک اہم عربی مخطوطے کی جرمنی میں موجودگی کا انکشاف کیا اور کہا ”اقبال ! میں تمھیں اس مخطوطے پر کام کرنے کے لیے جرمنی بھیجنا چاہتا ہوں کیونکہ میری نظر میں تم ہی اس مخطوطے پر کام کرنے کے لیے موزوں ترین آدمی ہو ۔ مگر اقبال نے کہا کہ میں اپنے استاد کی موجودگی میں ایک مبتدی کی حیثیت رکھتا ہوں اور ان کے سامنے ایسی جسارت نہیں کر سکتا ۔ اس پر آرنلڈ بولے کہ اقبال ایک قابلِ فخر شاگرد ہے جو اس کام کے لیے استاد سے زیادہ موزوں ہے ۔ وہ یقیناً اپنے استاد کو بھی مات کر جائے گا ۔“

اگلے روز اقبال فلسفے سے متعلق عربی اور جرمن زبان کی چند کتابیں ایک جرمن پروفیسر کی معیت میں میرے پاس لائے اور ان میں سے وہ مقامات پڑھ کر سنائے جن میں حافظ کا مذکور تھا ۔ اس گفتگو میں ہم سب نے حصہ لیا ۔ میں

نے محسوس کیا کہ اقبال کو حافظ سے غیر معمولی دلچسپی اور تعلق ہے ۔ انھوں نے حافظ کے تصورات کا دوسرے فلسفیوں کے تصورات و نظریات سے تقابل کیا اور یہ بحث تین گھنٹے تک جاری رہی ۔ اس بحث و مباحثہ کے اختتام پر اقبال نے کہا کہ اس قسم کی علمی گفتگو سے میرے نظریات کو تقویت ملتی ہے اور وہ زیادہ مستحکم ہوتے ہیں ۔

۲۳ جون کو میں نے ایک ضیافت کا اہتمام کیا تھا جس میں دوسرے احباب کے علاوہ اقبال بھی شریک ہوئے ۔ اس محفل میں ڈاکٹر انصاری نے گیت پیش کیے تھے اور لارڈ سہنا کی لڑکیوں کومولا اور رومولا نے موسیقی ۔ اقبال نے اس موقع پر لطائف سنائے تھے جس سے محفل کا لطف دوبالا ہو گیا ۔

۲۷ جون کو ایک جرمن خاتون مس شولے نے اپنے گھر میں ہندوستانی کھانے کی دعوت کی ۔ دراصل اقبال اسی گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے اور انھی کے ایما پر اس ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا ۔ یہاں اقبال نے اپنے تحقیقی مقالے پر گفتگو کی جس میں حسبِ مقدور دوسرے لوگوں نے بھی حصہ لیا ۔

۲۹ جون کو لیڈی ایلبیٹ نے ایک دعوت کا انتظام کیا ۔ اس دعوت میں بھی اقبال موجود تھے اور مس سروجنی داس سے بھی دعوت میں میری ملاقات ہوئی جس نے اقبال کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ میں تو محض آپ سے ملنے کے لیے یہاں آئی ہوں ۔ اس پر اقبال بولے کہ ایسی صورت میں یہاں سے زندہ بچ کر نکل جانا مشکل ہے ۔

فلسفے میں میری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اقبال نے ۱۳ تا ۱۵ جولائی ۱۹۰۷ء کے تین دن فلسفے کے مطالعے اور مباحثے کے لیے مخصوص کر دیے تاکہ ہر روز دو گھنٹے اس موضوع پر گفتگو کی جائے۔ چنانچہ پروفیسر پرشمنٹ، اقبال اور میں مقررہ پروگرام کے مطابق اس موضوع پر بحث مباحثہ کرتے رہے۔ اگلے روز اقبال اپنی کتاب ''پولیٹیکل اکانومی'' کا اصل مسودہ مجھے دکھانے کے لیے لائے۔ میں نے اقبال کا پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کا مسودہ بھی دیکھا۔ یہ بعد میں جرمن زبان میں ترجمہ ہوکر شائع ہوگیا تھا۔

۲۳ جولائی ۱۹۰۷ء کو ایک مقالاتی گفتگو لندن میں ہوئی تھی جس میں کافی تعداد میں ہندوستانیوں نے شرکت کی تھی۔ ایک ہندوستانی طالب علم پرمیشور لال نے بطورِ خاص ہند سے موصول شدہ خطوط کا ذکر کیا تھا کیونکہ انھی دنوں ہندوستان سے ڈاک آئی تھی جس میں رسالہ ''مخزن'' بھی تھا۔ اس میں اقبال کی ایک نظم شائع ہوئی تھی۔ مجھے اقبال کا جرمن زبان میں ایک خط ملا تھا جس کو دیکھ کر پروفیسر آرنلڈ نے خواہش کی کہ یہ مجھے دے دیں کیونکہ اقبال میرا قابلِ فخر شاگرد ہے۔ چنانچہ میں نے انھیں دے دیا۔

۱۶ اگست ۱۹۰۷ء کو پروفیسر آرنلڈ نے مجھے ومبلڈن میں مدعو کیا جہاں انھوں نے اپنے لیے ایک مثالی گھر بنایا ہوا تھا۔ وہاں پروفیسر آرنلڈ کی نو سالہ بچی نے مجھے بہت متاثر کیا جس نے ایک نہایت دل خوش کن

سماں پیدا کر دیا ۔ ایک جرمن خاتون مس سٹرٹن بھی اس موقع پر موجود تھیں ۔ گفتگو کا موضوع زیادہ تر میری علمی مصروفیات رہیں ۔ میں عنقریب ہندوستان واپس جا رہی تھی لیکن پروفیسر آرنلڈ نے مجھے ترغیب دی کہ مجھے اپنا کچھ وقت جرمنی میں اور خاص کر ہائیڈل برگ میں بھی گزارنا چاہیے ۔ چنانچہ میں نے اپنے بھائی فیضی کے ساتھ جرمنی جانے کا پروگرام طے کر لیا اور انھیں اس سلسلے میں مطلع بھی کر دیا ۔ اس موقع پر پروفیسر آرنلڈ نے اقبال کے مقالے کے ضمن میں مجھ سے گفتگو کی اور ان کے کچھ مسودات بھی دکھائے ۔ اقبال ان دنوں جرمنی میں تھے ۔ جب اقبال کو میرے جرمنی جانے کی اطلاع ملی تو انھوں نے مجھے ۶ اگست ۱۹۰۷ع کو ایک خط لکھا جس میں کتابوں کی ایک فہرست بھی تھی جو انھوں نے میرے مطالعے کے لیے منتخب کی تھیں ۔ میں نے اقبال کو لکھا کہ میں ۱۹ اگست کو جرمنی روانہ ہو رہی ہوں ۔

چنانچہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ۱۹ اگست کو میں لندن سے روانہ ہوئی اور دوسرے روز شام کے پانچ بجے جرمنی کے شہر ہیڈل برگ پہنچ گئی ۔ ہیڈل برگ میں پروفیسر اقبال ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے ۔ یہاں کا ماحول اگرچہ لندن سے بہت مختلف ہے اور اجنبیت کا احساس زیادہ ہوتا ہے مگر میں ہندوستانیوں میں ہونے کی وجہ سے ایک طرح اپنے ہی ماحول میں تھی ۔ اقبال نے کہا کہ مس فیضی! آپ نے جو علمی کام اپنے ذمے لے رکھا ہے وہ یہاں مکمل

ہو جائے گا۔ ہیڈل برگ یونیورسٹی میں دو نہایت قابل اور خوبصورت عورتیں اقبال کی استاد تھیں جو انہیں مقالے کی تکمیل میں مدد دیتی تھیں۔

۲۲ اگست ۱۹۰۷ء کو ایک پارٹی کا انتظام کیا گیا جس میں میں نے بھی حصہ لیا۔ جب ہم لوگ پارٹی میں جانے لگے تو سب شرکا کی قیام گاہوں پر جا کر انہیں ساتھ لیا۔ آخر میں ہم اقبال کے ہاں گئے اور انہیں قدرے مضمحل دیکھا۔ چنانچہ ہم نے انہیں بھی ساتھ لیا اور پھر ہم سب نے اس دعوت میں شرکت کی۔

۲۳ اگست کو زیادہ لمبی سیر کا پروگرام بنا جس کے اختتام پر ہم یونیورسٹی بورڈنگ ہاؤس میں واپس آئے۔

۲۵ اگست باغِ فردوس میں جانے کے لیے طے شدہ تاریخ تھی۔ وہاں ایک مسجد بھی تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اقبال نے وہاں کے عربی کتبات پڑھے اور ان کی تاریخ بیان کی۔

۲۸ اگست ہم نے میونک میں گزاری جسے اقبال بہت پسند کرتے تھے اور اس کو ''عزیز خوشی'' کا نام دیتے تھے۔ اس کے بعد ہم پروفیسر ران کے ہاں گئے جہاں مس ران نے اقبال کے علمی کام کا جائزہ لیا۔ یہ لڑکی غیر معمولی ذہین اور شکل و صورت میں قدرت کا شاہکار تھی۔ میونک میں یہ آخری پروگرام تھا۔ اس کے بعد ہم ہیڈل برگ واپس آ گئے۔

۳۰ اگست ۱۹۰۷ء کو ہیڈل برگ میں کشتیوں کی دوڑ تھی جس میں ہم سب شریک ہوئے۔ اقبال اس دوڑ میں

سب سے پیچھے رہ گئے ۔ (کتاب میں دوڑتی ہوئی کشتیوں کی تصاویر بھی دی گئی ہیں) ۔

جرمنی میں میرے قیام کی مدت ختم ہو رہی تھی اور میں دوسرے دن ہیڈل برگ کو خیرباد کہنے والی تھی ۔ اسی روز ایک باغ میں ایک پارٹی کا اہتمام تھا اور ہم لوگ یہاں جمع ہوئے ۔ اس دعوت میں سب نے ایک ایک پکوان تیار کیا ۔ اقبال نے بھی ہندوستانی کھانا بنایا ۔ آخر میں مجھے الوداع کہا گیا اور اس طرح جرمنی میں میرا یادگار سفر اختتام پذیر ہوا ۔

جب میں ہندوستان واپس آ گئی تو اقبال سے ملاقات کا سلسلہ منقطع ہوگیا ، البتہ ان کے خطوط مجھے ملتے رہے ۔ ۱۹۰۸ء میں دوبارہ مجھے یورپ جانا پڑا ۔ میرے ساتھ میری بہن رفیعہ سلطان نازلی بیگم اور بہنوئی نواب سیدی احمد خاں بھی تھے ۔ اس مرتبہ بھی اقبال ملنے کے لیے آئے اور انھوں نے میری بہن کے البم میں (۹ جون ۱۹۰۸ء کو) اپنی ایک نظم لکھی ۔ (اس نظم کا آخری شعر یہ ہے) :

شمعِ بزمِ اہلِ ملّت را چراغِ طور کن
یعنی ظلمت خانۂ ما را سراپا نور کن

اس کے بعد ہم لوگ ہندوستان آ گئے کیونکہ میری والدہ کی بیماری کی اطلاع موصول ہوئی تھی جو بعد میں اسی بیماری میں فوت بھی ہوگئیں تھیں ۔

جب اقبال واپس ہندوستان آگئے تو ان سے خط و کتابت جاری نہ رہ سکی مگر وہ برابر اپنی نظمیں مجھے بھیجتے رہے ۔“

عطیہ بیگم نے اقبال کو جنجیرہ آنے کی دعوت بھی دی تھی

جس کا ذکر ۱۳ جنوری ۱۹۰۹ع کے ایک خط میں کیا گیا ہے ۔
جب عطیہ بیگم کو معلوم ہوا کہ اقبال نے علی گڑھ یونیورسٹی
میں فلسفے کا چیئرمین بننے سے معذرت کر دی ہے تو آنھوں نے
اس موقعے پر بھی اقبال کو ایک خط لکھا تھا ۔ اس کے بعد جب
اقبال حیدرآباد گئے تھے تو عطیہ بیگم نے انھیں مسٹر اور مسز حیدری
کے نام ایک تعارفی خط دیا تھا ۔ اپریل ۱۹۰۹ع میں بھی اقبال نے
عطیہ بیگم کو ایک خط لکھا تھا ۔

جب ۱۹۳۱ع میں اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کی
غرض سے لندن جا رہے تھے تو بمبئی میں ان کی ملاقات عطیہ بیگم
سے بھی ہوئی تھی ۔ عطیہ بیگم خود لکھتی ہیں کہ آنھوں نے اپنی
قیام گاہ ''ایوانِ رفعت'' میں ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ع کو اقبال کے اعزاز
میں ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں دیگر احباب بھی مدعو تھے
جن سے اقبال کا تعارف کرایا گیا ۔ اس موقعے پر اقبال نے ان سے
ایک کاغذ طلب کیا جس پر حسب ذیل شعر اپنے قلم سے انھوں نے
تحریر فرمایا :

بہ طوافِ کعبہ رفتم ، بہ حرم رہم نہ دادند
کہ برونِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

ایک اور شعر بھی آنھوں نے لکھا تھا جس پر خصوصیت سے لفظ
''پرائیویٹ'' تحریر کیا ۔ اس کا دوسرا مصرع یہ ہے :

کہیے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

ایک فارسی نظم کے حسب ذیل تین شعر بھی اس موقعے[٦] پر
ایوانِ رفعت میں بیٹھ کر آنھوں نے لکھے تھے جو اشاعت کی غرض سے

کسی رسالے کو بھیجے تھے کیونکہ ان پر ''برائے جریدہ'' تحریر ہے:

ترسم کہ تو می رانی زورق بہ سراب اندر
زادی بہ حجاب اندر، میری بہ حجاب اندر
بر کشت و خیابان پیچ، بر کوہ و بیابان پیچ
برقے کہ بہ خود پیچد، میرد بہ سحاب اندر
ایں صوت دلاویزے از زخمۂ مطرب نیست
مہجور جناں حورے نالد بہ رباب اندر

محمد اقبال

در دولت کدۂ عطیہ بیگم، بمبئی، ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ع''

اس سفر میں اقبال بمبئی کے افغان کونسل خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے اور وہیں سے عطیہ بیگم کی مذکورہ دعوت میں شرکت کی غرض سے گئے تھے۔ اس کے بعد آپ ملوجا جہاز کے ذریعے لندن پہنچے اور کانفرنس میں شرکت فرمائی۔ یہ کانفرنس یکم دسمبر ۱۹۳۱ع تک جاری رہی۔

اسی طرح جب ۱۹۳۲ع میں اقبال یورپ جا رہے تھے تو اس موقعے پر بھی بمبئی میں عطیہ بیگم کے ہاں وہ سرسری طور پر گئے تھے۔

عطیہ بیگم کا مذکورہ بالا طویل بیان نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عطیہ اور اقبال کی علمی رفاقت اور اقبال کے مقالۂ پی ایچ۔ ڈی کی تیاری میں عطیہ بیگم نے جو علمی تعاون کیا اسے قارئین کے سامنے پیش کیا جائے۔ اقبال اور عطیہ کی رفاقت دراصل دو صاحب علم ہستیوں کی علمی رفاقت تھی۔ ان کے تبحر علمی نے ہی انھیں ایک دوسرے کے قریب کیا تھا اور یہی علمی افادہ و استفادہ ان کے درمیان قدر مشترک تھی۔

علامہ اقبال کے علاوہ جس ہستی کو عطیہ بیگم کی علمیت نے متاثر کیا وہ مولانا شبلی نعمانی تھے ۔ ان کے درمیان جو خط و کتابت اور مراسلت ہوئی وہ چھپ چکی ہے ۔ مولانا کے خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عطیہ بیگم کے بہنوئی یعنی نواب جنجیرہ یا ان کی بہن یعنی بیگم جنجیرہ سے ندوۃ العلما کا سنگِ بنیاد رکھوانا چاہتے تھے ۔

اس تمام کیفیت سے یہی واضح ہوتا ہے اور یہی میرے نزدیک درست بھی ہے کہ عطیہ بیگم ایک غیر معمولی ذہین اور صاحبِ علم خاتون تھیں اور ان کی اسی ذہانت و علمیت نے اپنے وقت کی ان دونوں صاحبِ علم اور نابغۂ روزگار ہستیوں ـــــ علامہ اقبال اور مولانا شبلی ـــــ کو متاثر کیا ۔ ان کے ان علمی روابط کو صرف علمی نقطۂ نظر سے پرکھنے کی ضرورت ہے اور اس ضمن میں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے یا دور رس نتائج اخذ کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ۔

آخر میں ایک واقعہ اور بھی یاد پڑتا ہے ۔ ۱۹۲۹ء میں جب علامہ مدراس لیکچرز کے سلسلے میں بمبئی پہنچے تھے اور راقم الحروف بھی آپ کے ہمراہ تھا تو بمبئی میں انھوں نے عطیہ بیگم سے بھی ملنے کی خواہش کی تھی ۔ وہ اس زمانے میں خاصی عمر رسیدہ ہوچکی تھیں ۔ مگر وقت چونکہ کم تھا لہٰذا ان سے ملاقات نہ ہو سکی ۔

پاکستان بننے کے بعد عطیہ بیگم ہجرت کر کے پاکستان آ گئی تھیں اور کراچی میں رہائش اختیار کرلی تھی ۔ ان کی وفات سے قبل ، جب وہ ہسپتال میں زیرِ علاج تھیں ، علامہ کے قدیم خدمت گار علی بخش نے بھی ان سے ملاقات کی تھی ۔ بالآخر اسی ہسپتال میں ۱۹ اپریل ۱۹۵۶ء کو جمعہ کے روز اس نابغۂ روزگار خاتون نے

اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی ۔

پروفیسر آرنلڈ :

میں نے اپنے اس مضمون کے عنوان میں پروفیسر آرنلڈ کا نام بھی شامل کیا ہے - پروفیسر آرنلڈ وہ شخصیت تھی جنھوں نے شروع سے اقبال کی علمی سرپرستی کی تھی - وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر کی حیثیت سے آئے تھے اور اقبال بحیثیت ایک طالب علم کے اس کالج میں زیرتعلیم تھے - پھر جب اقبال حصولِ تعلیم کی غرض سے یورپ گئے اور آرنلڈ بھی انگلستان چلے گئے تو انھوں نے قدم قدم پر اقبال کی رہنمائی کی اور خاص کر ڈاکٹریٹ کی تیاری کے سلسلے میں تو انھوں نے مدد کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا ۔ چنانچہ جب اقبال کا مقالہ تیار ہوگیا اور میونک یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے دی تو لندن کے ایک اشاعتی ادارے نے بخوشی اسے شائع کر دیا ۔ اقبال نے اظہارِ تشکّر کے طور پر اپنے اس مقالے کو پروفیسر آرنلڈ کے نام معنون کیا اور اس کے انتساب میں لکھا :

"میرے پیارے مسٹر آرنلڈ !

یہ چھوٹی سی کتاب فلسفے کی اُس تعلیم کا نتیجہ ہے جو میں آپ سے گزشتہ دس برسوں میں حاصل کرتا رہا ۔ بطورِ اظہارِ تشکّر میں اپنی اس عاجزانہ کوشش کو آپ کے نام معنون کرتا ہوں ۔ آپ نے میرے ساتھ ہمیشہ نہایت فراخ دلی کا سلوک کیا ہے ۔ اُمید ہے کہ میری اس پیشکش کو بھی آپ اسی جذبے سے قبول فرمائیں گے ۔

آپ کا پیارا شاگرد ، محمد اقبال"

پروفیسر آرنلڈ سے اقبال کی محبت اور عقیدت کا اظہار اُس خط سے بخوبی ہوتا ہے جو انھوں نے پروفیسر موصوف کی وفات پر ان کی اہلیہ اور بیٹی کو لاہور سے ١٦ جولائی ١٩٣٠ع کو ارسال فرمایا۔ چنانچہ لکھتے ہیں (ترجمہ) :

''میری پیاری لیڈی آرنلڈ !

میرے لیے ناممکن ہے کہ میں آپ سے اور نینسی (دخترِ پروفیسر آرنلڈ) سے اُس سانحۂ جانکاہ کا اظہار کر سکوں جو ہم پر گزر گیا ہے —— اور وہ ہے ٹامس آرنلڈ کی وفات کی خبر جو ہندوستان میں پہنچی ہے۔ آپ کو علم ہے کہ وہ تمام لوگ جو ان سے واقف تھے اور ان کے تمام شاگرد ان سے محبت کرتے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ الفاظ جو اظہارِ غم میں استعمال کیے جائیں ، اگرچہ بہت تھوڑے سے افاقے کا سبب بنتے ہیں مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے غم میں انگلستان ، ہندوستان اور اُن تمام ممالک کے لوگ برابر کے شریک ہیں جو موصوف کی تصانیف سے واقفیت رکھتے ہیں۔ دراصل ان کی وفات برٹش اور اسلامی علمی حلقوں کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ ان کے تخیّلاتِ علمی ہم سب کا سرمایہ ہیں اور انھوں نے اخیر دم تک علم و ادب کی خدمت کی ہے۔ میرے لیے ان کی موت کا سانحہ ایک ذاتی حادثہ ہے کیونکہ میری روح کو شاہراہِ علم پر ڈالنے والے وہی تھے۔ بظاہر آج وہ شمع مدھم پڑ گئی ہے مگر میرا پختہ عقیدہ ہے کہ محبت اور خدمت کی جو مثال انھوں نے قائم کی اور جس شمع نے میری زندگی کو منوّر کیا وہ ہمیشہ روشن رہے گی۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ مرحوم کی روح کو
ہمیشہ امن و سکون میں رکھے اور آپ کو اور نینسی کو
زیادہ سے زیادہ صبر عطا فرمائے تاکہ آپ اس سانحے کو صبر
اور سکون سے برداشت کر سکیں ۔[1]

آپ کا خیرخواہ محمد اقبال"

پروفیسر آرنلڈ نے ۱۹۲۸ء میں ایک مقالہ "مذہبِ اسلام"
کے عنوان سے تحریر کیا تھا ۔ اس میں علامہ اقبال کی اسلامی خدمات
اور احیائے ملی کے سلسلے میں ان کی شاعری نے جو کارہائے نمایاں
انجام دیے ، اس کی بابت وہ لکھتے ہیں :

"ہندوستان میں جدید مذہبی تحریک سر محمد اقبال کی شاعری
کی بدولت نہایت شان سے نمودار ہوئی ہے ۔ اقبال فلسفے
کے ایک سنجیدہ اور مستعد طالب علم ہیں ۔ نطشے اور
برگساں کے افکار کو اقبال نے ترقی دے کر اپنے نظریات
کی بنیاد رکھی ہے ، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ
اقبال کا علم و فضل اور ان کا وسیع مطالعہ و تحقیق محض
دوسروں کی آوازِ بازگشت ہے ۔ یہاں ہمیں ان کے فلسفیانہ
افکار سے سروکار نہیں بلکہ صرف مذہب اسلام کی طرف
ان کا رجحان زیربحث ہے ۔ چنانچہ اپنی شاعری میں وہ
حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی ذات سے والہانہ
عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور وہ ان کی دوسری سب
باتوں سے زیادہ ان کے پیغمبرِ عمل ہونے کی حیثیت سے
ان کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں ۔ ان کا ایمان ہے کہ

1- Letters and Writings of Iqbal, ed. by Iqbal Academy Karachi, pp. 115 - 116.

آپؐ کی تعلیمات ایک مثالی معاشرے کی بنیاد بن سکتی ہیں
اور خودی کی قوت اور اس کے ارتقا سے ہی عالمِ اسلام
کی نشاۃ ثانیہ ہوگی ۔ جتنا کہ ایک مسلمان اپنے آپ کو
ایک مکمل و کامل انسان بنانے میں کامیاب ہوگا اتنا ہی
وہ دنیا میں اسلام کی سربلندی اور ترقی کا باعث بنے گا ۔
عمل کی عظمت کا جو سبق سیرتِ رسولؐ سے حاصل ہوتا
ہے اس میں بے عملی یا سکون کی کوئی گنجائش نہیں ہے
جو اسلامی تصوف کا ایک مخصوص پہلو ہے اور جس کے
اقبال شدید مخالف ہیں ۔ ہندوستان کے نوجوان مسلم طبقے
پر اقبال کا بہت زیادہ اثر ہے مگر جس فلسفیانہ شکل میں ان
کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں ، طبعاً یہ اثر کسی منظم مذہبی
تحریک کی بنیاد نہیں بن سکا اور نہ ہی ـــــ کسی حد تک
ـــــ مصنّف کا یہ مقصد ہے ۔''[1]

جب آرنلڈ ۱۹۰۳ع میں لاہور سے ریٹائر ہو کر انگلستان چلے
گئے تو اقبال نے ان کی یاد میں ایک نظم ''نالۂ فراق'' کے نام سے
تحریر کی جو ''بانگِ درا'' میں چھپ چکی ہے ۔ اس کا پہلا اور آخری
بند حسبِ ذیل ہے :

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں
آہ مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں
آ گیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقیں
ظلمتِ شب سے ضیاے روزِ فرقت کم نہیں

۱- دیکھیے ٹامس آرنلڈ کی کتاب The Faith of Islam ، ص ۷٦ - ۷۷-
نیز اقبالیات کا تنقیدی جائزہ ، اقبال اکیڈمی ، ۱۹۵۵ع ، ص ۱۱۳ -

تـا ز آغوشِ وداعش داغِ حسرت چیـده است
ہمچو شمعِ کشتہ در چشمِ نگہ خوابیدہ است

دیکھتـا ہے دیـدۂ حیراں تری تصویـر کو
کیـا تسلی ہـو مگـر گـرویـدۂ تـقـریـر کـو
تابِ گویـائی نہیں رکھتـا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ، ہے سخن تصویر کا

☆ ☆ ☆

۱۳

یورپ سے واپسی

۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو علامہ اقبال یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور آئے تو ان کا شان دار استقبال کیا گیا ۔ اُن دنوں گرمیوں کی وجہ سے تمام ادارے بند تھے ۔ علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے لڑکے مسٹر اعجاز لکھتے ہیں :

''انگلستان سے واپس آنے کے بعد اُنھوں نے لاہور میں بیرسٹری شروع کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ عرصے تک وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے اعلیٰ پروفیسر بھی رہے ۔ کالج کی ملازمت کی وجہ سے وہ صبح کے وقت کچہری نہیں جا سکتے تھے ۔ گورنمنٹ نے خاص طور پر ہائی کورٹ سے یہ انتظام کرایا تھا کہ ان کے تمام مقدمات دن کے پچھلے حصے میں پیش ہوا کریں ۔ چنانچہ قریباً ڈیڑھ سال تک اس پر عمل درآمد ہوتا رہا ۔ اُس زمانے میں انڈین ایجوکیشنل سروس میں پنجاب میں غالباً کوئی ہندوستانی نہ تھا اور یہ سروس زیادہ تر انگریزوں کے لیے مخصوص تھی ۔ گورنمنٹ نے اُنھیں اس سروس کی پیشکش بھی کی لیکن اُنھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا

اور بیرسٹری کے آزاد پیشے کو پسند کیا ۔"

ہائی کورٹ میں ایک قانون داں کی حیثیت سے علامہ کا نام درج ہوا اور اس طرح آپ کے نام کی جو فائل تیار ہوئی وہ اب تک ہائی کورٹ کے ریکارڈ میں موجود ہے ۔ اس فائل کے مندرجات کی تفصیل آیندہ مضمون میں ملاحظہ فرمائیے ۔

یورپ سے واپسی پر علامہ نے ۱۹۰۹ع میں "ہندوستان ریویو" الہ آباد کے دو شماروں میں انگریزی زبان میں ایک محققانہ مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان یہ تھا :

"Islam as a Moral and Political Ideal"

یہ مقالہ دو قسطوں میں شائع ہوا تھا مگر عام طور پر لوگوں کو اس مقالے کا علم نہیں ہے ۔

اسی رسالے میں ۱۹۱۱ع میں بھی آپ نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان یہ تھا :

"Political Thought in Islam"

غرض یورپ سے آنے کے بعد آپ نے اپنی خالص اسلامی تحقیقات کا دائرہ وسیع تر کردیا اور پھر زندگی کے آخری سانسوں تک اسلام کی برابر خدمت کرتے رہے ۔

☆ ☆ ☆

۱۴

لاہور ہائی کورٹ میں علامہ کی فائل

جب لاہور ہائی کورٹ میں علامہ اقبال نے بیرسٹر کی حیثیت سے پریکٹس شروع کی تو آپ کا نام باقاعدہ رجسٹر ہوا ۔ آپ کی ذاتی فائل کا نمبر 284-A-XIII تھا ۔ یہ فائل حسنِ اتفاق سے ہائی کورٹ کے رجسٹرار میاں محمد خلیل صاحب کے ہاتھ لگ گئی اور انھوں نے اسے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ضائع ہونے سے بچا لیا ۔ اس فائل میں حضرتِ علامہ کی تاریخ وفات ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء درج ہے ۔ نیز مندرجہ ذیل امور کی وضاحت بھی ہوتی ہے :

۱۔ اقبال نے ۱۸۹۸ء میں لاہور لا سکول کے تمام لیکچر سنے اور کورس مکمل کیا ۔

۲۔ انھوں نے ۱۸۹۸ء ہی میں ابتدائی امتحان بھی دیا تھا ۔

۳۔ مگر وہ علمِ قانون (Jurisprudence) کے پرچے میں فیل ہوگئے تھے ۔

۴۔ آپ نے لیکچروں میں شمولیت کے بغیر جون ۱۹۰۰ء میں ایک مرتبہ پھر آیندہ دسمبر کے امتحان میں شمولیت کی اجازت طلب کی مگر مسٹر جسٹس چیٹرجی نے قواعد کے تحت ان کی یہ درخواست نا منظور کردی ۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ آپ بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے لیے ۱۹۰۵ء میں یورپ تشریف لے گئے اور بالآخر ۱۹۰۸ء میں یہ امتحان پاس کر کے وطن واپس آئے۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں ایڈووکیٹ کی حیثیت سے ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی - مئی ۱۹۰۹ء میں آپ گورنمنٹ کالج میں فلسفے کے پروفیسر مقرر ہوئے مگر بالآخر یہ عارضی اسامی بھی آپ کو چھوڑنی پڑی ، کیونکہ چیف کورٹ کے جج صاحبان اس بات پر راضی نہ ہوئے کہ آپ کے مقدمات ہمیشہ کے لیے کالج کے لیکچروں کے بعد لیے جاتے رہیں -

☆ ☆ ☆

۱۵

انجمن ِ حمایت ِ اسلام اور علامہ اقبال

یہ ادارہ انجمن ِ حمایت ِ اسلام لاہور کے نام سے چند اہل ِ دل مسلمانوں نے ۱۸۸۴ع میں قائم کیا تھا ۔ سید محمد لطیف نے بھی اپنی ''تاریخ لاہور'' میں اس انجمن کی ابتدا کا ذکر کیا ہے ۔ اس انجمن سے علامہ اقبال کا تعلق ۱۸۹۹ع سے قائم ہوا جب آپ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم ۔ اے کا امتحان پاس کر چکے تھے ۔ چنانچہ ۱۹۰۰ع میں آپ نے ایک نظم بعنوان ''نالہ ٔ یتیم'' انجمن حمایت ِ اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی تھی ۔ اس کے بعد آپ کا تعلق انجمن ھذا سے ایک طرح اخیر تک رہا ۔ میں نے ان صفحات میں مختلف عنوانوں کے تحت اس ضمن میں لکھا ہے ۔ ابتدا میں انجمن ِ حمایت ِ اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ عام طور پر اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ میں ہوا کرتا تھا جس میں عموماً اقبال اپنی کوئی تازہ نظم پڑھا کرتے تھے ۔ ان سالانہ جلسوں میں ڈاکٹر مولوی نذیر احمد دہلوی ، سید سلیمان شاہ پھلواری ، مولانا شبلی نعمانی ، مولانا الطاف حسین حالی اور دیگر مشاہیر بھی اکثر حصہ لیا کرتے تھے اور لاہور کے لوگ ان کے خیالات اور پند و نصائح سے مستفید ہوتے تھے ۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد مرحوم ہم سب بچوں کو وعظ سنانے کے لیے لے جایا کرتے تھے ۔

۱۹۱۰ء کے بعد یہ جلسے اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں منعقد ہونا شروع ہوگئے تھے ۔ علامہ اقبال نے مندرجہ ذیل نظمیں انجمن کے حسب ذیل جلسوں میں پڑھی تھیں :

(۱) ۱۹۰۰ء میں آپ نے اپنی نظم ''نالۂ یتیم'' پڑھی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ۔

(۲) ۱۹۰۱ء میں آپ نے ''یتیم کا خطاب ہلال عید سے'' نظم پڑھی تھی ۔

(۳) ۱۹۰۲ء میں ''دین و دنیا'' اور ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے'' دو نظمیں پڑھی تھیں ۔

(۴) ۱۹۰۳ء میں نظم ''ابرِ گوہربار'' (فریادِ اُمت) پڑھی ۔ اس جلسے کی صدارت خان غلام محمد خان مشیرِ مال کشمیر و جموں نے کی تھی ۔ اس موقع پر خواجہ عبدالصمد ککرو کشمیر سے ایک نقرئی تمغہ بنوا کر لائے تھے تاکہ اقبال کو ان کی نظم کے صلے میں پہنائیں ۔ میں نے خود بھی خواجہ صاحب کو جلسے میں اقبال کی یہ عزت افزائی کرتے ہوئے دیکھا تھا ۔ چنانچہ اُنھوں نے علامہ اقبال کو وہ تمغہ پہنا دیا تھا ۔

(۵) ۱۹۰۴ء میں علامہ نے نظم ''تصویرِ درد'' پڑھی تھی ۔ اس جلسے میں بڑے بڑے علما اور رؤسا بیٹھے ہوئے تھے ۔ جب مولانا الطاف حسین حالی کی باری آئی تھی تو ان کی آواز ساتھ نہ دے سکی تھی ۔ چنانچہ ان کی نظم بھی علامہ اقبال نے پڑھی تھی اور اس نظم سے قبل آپ نے مندرجہ ذیل رباعی فی البدیہ پڑھی تھی :

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی

معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی

میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالی

۱۹۰۳ء میں یا ۱۹۰۴ء میں علامہ نے انجمن کے جلسے میں جب یہ دیکھا کہ انجمن کی دو پارٹیاں ـــــ باغبان پورہ اور مزنگ ـــــ ایک دوسرے پر طعن کرتی ہیں تو آپ نے بطورِ طنز یہ کہا تھا:

''دو عملی میں ٹھہرا ہے آشیاں ہمارا''

اس کے بعد علامہ اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے اور وہاں سے ۱۹۰۸ء میں واپس آئے۔ اس عرصے میں اسلامیہ کالج کی عمارت بھی تیار ہوگئی تھی اور ساتھ ہی اس کا ہوسٹل بھی، جسے عام طور پر رواز ہوسٹل کہتے ہیں، اس کی عمارت بھی زیر تعمیر تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء کے بعد انجمن کا سالانہ اجلاس اسی رواز ہوسٹل میں ہونا شروع ہوگیا تھا۔

یورپ سے واپسی پر ۱۹۱۱ء میں آپ نے اپنی نظم ''شکوہ'' رواز ہوسٹل ہی میں پڑھی تھی۔ چونکہ یہ ہوسٹل ابھی زیرِ تعمیر تھا اس لیے اس جلسے کا انتظام پچھلے صحن میں کیا گیا تھا۔ میں بھی اس جلسے میں شریک تھا۔ آپ معمولی لباس میں ملبوس، سر پر ترکی ٹوپی پہنے ہوئے اپنے والد کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ یہ نظم ابھی طبع نہیں ہوئی تھی۔ سر عبدالقادر نے بھی اس کیف کا حال، جو جلسے پر چھایا ہوا تھا، لکھا ہے۔ اس موقع پر بے حد ہجوم تھا۔ جب اقبال ڈائس پر آئے تو چاروں طرف سے اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے۔ باوجود سامعین کے اصرار کے آپ نے ترنم سے پڑھنے سے اظہارِ معذرت کردیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ نظم کا عنوان ''شکوہ'' ہے۔ آپ

نے نظم کا پہلا بند پڑھا:

کیوں زیاں کار بنوں ، سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں ، محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے ــ خاکم بدہن ــ ہے مجھ کو

ہزاروں کے مجمع میں ایسا سناٹا چھا گیا کہ کیا مجال ہے کسی کی سانس کی آواز تک سنائی دے۔ غرضکہ جوں جوں نظم آگے بڑھتی گئی ، ہر شعر کے بعد تالیوں اور نعروں کا طوفان برپا ہوتا گیا۔

اس سے اگلے سال ۱۹۱۲ء میں آپ نے ''جوابِ شکوہ'' موچی دروازے کے باہر باغ میں جنگِ بلقان کے موقع پر پڑھی تھی۔ اس جلسے کی صدارت چودھری شہاب الدین نے کی تھی۔ جب آپ نے اس نظم کا یہ شعر پڑھا :

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں

تو چونکہ چودھری صاحب سیاہ فام تھے اس لیے آپ نے یہ شعر پڑھتے ہوئے ان کی طرف معنی‌خیز نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کے بعد آپ نے یہ شعر پڑھا :

رہ گئی رسمِ اذاں ، روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا ، تلقینِ غزالی نہ رہی

غالباً ۱۹۱۲ء ہی کا سال تھا جب علامہ نے اپنی نظم ''شمع و شاعر'' پڑھی تھی۔ اس جلسے کی صدارت فقیر سید افتخار الدین نے کی تھی۔ جب علامہ نظم پڑھنے کے لیے تشریف لائے تو اس وقت

گوجرانوالہ کے حافظ جھنڈا اپنی پنجابی نظم پڑھ رہے تھے ۔ مولانا ظفر علی خاں بھی اس جلسے میں موجود تھے مگر وہ حافظ جھنڈا کی پنجابی نظم کو اچھی طرح نہیں سمجھ رہے تھے ۔ چنانچہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ، جو مولانا کے پاس ہی بیٹھے تھے ، اردو میں اس پنجابی نظم کے مطالب کی وضاحت کرتے جا رہے تھے ۔ اس اثنا میں علامہ اپنی نظم پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے اور انھوں نے نظم کا آغاز ایک فارسی قطعے سے کیا جس کا پہلا شعر یہ ہے :

دوش می گفتم بہ شمعِ منزلِ ویرانِ خویش
گیسوے تو از پرِ پروانہ دارد شانۂ

چونکہ اس زمانے میں لاؤڈ سپیکر رائج نہیں ہوئے تھے لہٰذا مجمع میں سے کسی شخص نے ، جو دور کھڑا تھا اور پشاور سے آیا تھا ، علامہ سے فارسی اشعار میں درخواست کی کہ بلند آواز میں پڑھیں ۔ اس پر علامہ نے نظم کا پڑھنا بند کردیا اور اس آدمی کو شعر کی زبان میں ہی جواب دیا کہ اگر تمھارے کان سنتے ہیں تو سنو ، دوسروں کو بد مزہ مت کرو ۔ اس پر مجمع میں کچھ شور ہوا مگر پھر سناٹا چھا گیا اور علامہ نے نظم پھر شروع کی ۔ اس نظم کے آخری حصے کے دوران جلسے کی صدارت مرزا غلام احمد قادیانی کے بیٹے مرزا سلطان احمد نے کی تھی جس کو دیکھ کر علامہ نے یہ شعر فی البدیہ پڑھا تھا :

درمیانِ انجمن معشوقِ ہرجائی مباش
گاہ با سلطان باشی ، گاہ باشی با فقیر

۱۹۱٦ع کے اجلاس میں علامہ نے نظم ''بلال'' پڑھی تھی ۔ اس جلسے کی صدارت علامہ کے دوست نواب سر ذوالفقار علی خاں کے سپرد تھی ۔

اس سے پیشتر ۲۲ جولائی ۱۹۱۳ء کو حیدر آباد دکن کے وزیراعظم مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد جب لاہور میں آئے تھے تو انجمن کا ایک وفد علامہ کی سرکردگی میں ان سے ملا تھا اور انھوں نے ایک ہزار روپیہ انجمن کو عطیہ دیا تھا ۔ انجمن کی خواہش تھی کہ کسی طرح نظامِ دکن کو انجمن کے کسی جلسے کی صدارت پر آمادہ کیا جا سکے مگر وہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے نہ آ سکے ۔

اسی طرح علامہ نے نواب صادق والیِ بہاولپور کو بھی انجمن کے ایک جلسے کی صدارت کی دعوت دی تھی جو انھوں نے منظور کر لی تھی ۔ چنانچہ انجمن کے چھیالیسویں جلسے کی صدارت نواب بہاولپور نے کی تھی جو دسمبر ۱۹۳۰ء کو ہوا تھا ۔ علامہ نے ایک ایڈریس بھی پیش کیا تھا ۔ اس جلسے میں نواب صاحب خیرپور (سندھ) اور نواب صاحب ڈھاکہ بھی موجود تھے ۔

۱۹۲۰ء کے سالانہ جلسے کی صدارت نواب حمیداللہ خاں نے کی تھی ۔ اس جلسے میں پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ امرسن موجود تھے جنھوں نے ایک تقریر بھی کی تھی ۔ علامہ علالت کی وجہ سے اس جلسے میں شریک نہ ہو سکے ، تاہم گورنر کی اس تقریر پر انھوں نے ایک چٹھی میں تبصرہ کیا تھا جس میں قادیانیت اور پنجاب کے زمینداروں کے مسائل کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی تھی ۔ علامہ کی یہ چٹھی اخبار میں بھی شائع ہوئی اور بعد میں ایک الگ رسالے کی شکل میں بھی طبع ہوئی ۔ صدرِ جلسہ نواب حمیداللہ خاں نے دس ہزار روپے انجمن کو بطور عطیہ دیے تھے ۔

غرضکہ علامہ اقبال نے شروع سے ہی انجمن کے لیے اپنی خدمات

وقف کر دی تھیں ۔ وہ نہ صرف اس کے جلسوں میں باقاعدگی سے نظمیں پڑھتے تھے بلکہ انھوں نے بعض ایسے بلند پایہ لیکچر بھی دیے جو ہمیشہ یادگار رہیں گے ۔ آپ نے انجمن کی جنرل کونسل میں ایک ممبر کی حیثیت سے اکثر شمولیت فرمائی اور اس کے مختلف عہدوں پر بھی فائز رہے ۔ چنانچہ ۱۹۳۴ع سے ۱۹۳۷ع تک آپ نے صدر انجمن کی حیثیت سے فرائض انجام دیے مگر بالآخر بوجہ علالت ۱۹۳۷ع میں اس عہدے سے استعفا دے دیا ۔

میں نے مختصر طور پر انجمن سے علامہ کی وابستگی کی داستان بیان کی ہے ۔ اگر کوئی صاحب اس موضوع پر کام کرنا چاہیں تو انجمن کے ریکارڈ کی مدد سے اس موضوع پر ایک طویل مقالہ لکھا جا سکتا ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ انجمنِ حمایتِ اسلام ہی کی سٹیج سے علامہ کی شہرت و مقبولیت کا آغاز ہوا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ نے انجمن کے لیے بےمثال کام کیا اور ان کی ذات سے اس ادارے کو بے شمار فوائد حاصل ہوئے ۔

انجمنِ حمایتِ اسلام کا چوبیسواں سالانہ جلسہ ۱۱ - اپریل ۱۹۰۹ع کو ایسٹر کی تعطیلات میں کالج گراؤنڈ میں منعقد ہوا ۔ اس جلسے کی صدارت شیخ عبدالحق وائس پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی ملتان کر رہے تھے ۔ صاحبِ صدر نے سب سے پہلے انگریزی میں علامہ کا تعارف کرایا اور اس کے بعد علامہ سے درخواست کی کہ وہ اپنی تقریر شروع کریں ۔ یہ لیکچر علامہ نے انگریزی زبان میں دیا تھا جو بعد میں لاہور کے انگریزی روزنامے ''آبزرور'' میں شائع ہوا ۔ پڑھے لکھے سامعین تو براہِ راست علامہ کے لیکچر سے

محظوظ ہوئے مگر جو حضرات انگریزی زبان سے واقف نہیں تھے ان کے لیے میاں فضل حسین بیرسٹرایٹ لا نے لیکچر کا خلاصہ اردو زبان میں پیش کیا جو بہت پسند کیا گیا اور سامعین نے دل کھول کر داد دی ۔ اس کارروائی کے بعد یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا ۔[1]

۱۔ روداد چوبیسواں سالانہ جلسہ انجمن حمایت اسلام لاہور (بطور رسالہ) بابت شعبان المعظم ۱۳۲۷ھ ، مطابق ستمبر ۱۹۰۹ع ، ص ۳۲ ۔

۱۶

خواجہ عبدالصمد ککڑو

خواجہ عبد الصمد ککڑو کو میں نے عام طور پر انجمن حمایت اسلام کے اُن جلسوں میں دیکھا تھا جو اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ میں منعقد ہوتے تھے - چھوٹا قد ، جسم گول مٹول ، کشمیری طرز کا لباس اور اس پر چوغہ اور دستار پہنتے تھے - باریش تھے اور عام طور پر ہاتھ میں تسبیح رکھتے تھے جو ان کا امتیازی نشان تھا - وہ بارہ مُولا (کشمیر) کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے -

بارہ مُولا کشمیر کا وہ قصبہ ہے جو راولپنڈی سے کشمیر جاتے ہوئے سری نگر کے قریب واقع ہے - یہ نہایت حسین اور سرسبز علاقہ ہے - خواجہ عبدالصمد انجمن کے جلسوں میں شرکت کے لیے خصوصی طور پر تشریف لایا کرتے تھے - ان کے والد خواجہ عزیز ککڑو بھی اپنے زمانے میں کشمیری مسلمانوں میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے - وہ سلسلۂ نقشبندیہ سے متعلق تھے ، جیسا کہ کشمیری مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ اس سلسلے سے وابستہ تھا - خواجہ عزیز ککڑو گذشتہ صدی میں لاہور تشریف لائے تھے اور حضرت شاہ محمد غوث کی درگاہ میں قیام کیا تھا کیونکہ حضرت

شاہ محمد غوث بھی سلسلۂ نقشبندیہ سے وابستہ تھے - آپ نے یہیں انتقال فرمایا اور حضرت شاہ محمد غوث کی درگاہ میں دفن ہوئے - اس سے پہلے وہ اس درگاہ کی تعمیر میں عملی طور پر حصے لے چکے تھے -

خواجہ عبدالصمد ککڑو خود بھی ایک عالمِ دین تھے اور اُنھوں نے سری نگر کی انجمن نصرتِ اسلام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا - یہ انجمن ۱۹۰۵ء میں سری نگر میں قائم ہوئی تھی - وہ انجمن نصرتِ اسلام کے جلسوں میں اپنی نظمیں بھی سناتے اور افتتاحی تقاریر بھی کیا کرتے تھے - ان کی تقریر بڑی عالمانہ ہوتی تھی - ان کی وہ تقریر ، جو اُنھوں نے ۱۹۱۰ء کے جلسۂ انجمن میں کی تھی ، بہت مشہور ہے - اس کی ابتدا ان اشعار سے ہوئی تھی :

افتتاح الکلام بسم اللہ   الذی لیس فی الوجود سواہ
قل ھواللہ واحد احد   الّذی لم یلد و لم یولد
بعد حمدِ خداست نعتِ رسول   کہ ازوئیم مقبل و مقبول

اسی طرح کی ایک اَور تقریر بھی اُنھوں نے کی تھی جس کی ابتدا میں یہ شعر پڑھا تھا :

پھر بہار آئی چمن میں ، زخمِ گل آلے ہوئے
پھر مرے داغِ جگر آتش کے پرکالے ہوئے

تقریر کا خاتمہ اس شعر پر کیا تھا :

مصطفیٰؐ ماہ و صحابہ انجم   رضی اللہ تعالیٰ عنہم

وہ فارسی میں مقبل اور اُردو میں صمد تخلص کرتے تھے -

خواجہ عبدالصمد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی‌گڑھ کے بھی سرگرم رکن تھے - وہ اس کے جلسوں میں ہمیشہ شرکت فرماتے تھے اور کشمیری مسلمانوں کے حالات سے دوسرے مسلمانوں کو باخبر رکھتے تھے - وہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے کشمیر کی سیاست میں

اسلامی تحریک کا آغاز کیا تھا اور اپنا نصب العین اشاعتِ اسلام ٹھہرایا تھا ۔ بارہ مُولا کی جامع مسجد بھی اُنھوں نے تعمیر کرائی تھی اور جامع مسجد سری نگر کی مرمت کے موقعے پر بھی کسی سے پیچھے نہ رہے تھے ۔ علاوہ ازیں بارہ مُولا میں انجمن اسلامیہ کی بنیاد بھی اُنھوں نے رکھی تھی ۔ سری نگر ہائی سکول کے بانی بھی آپ ہی تھے ۔ جب تک زندہ رہے ، مسلمانانِ قلمروِ جموں کی امداد کرتے رہے ۔

انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں جب علامہ اقبال اپنی نظم سناتے تو خواجہ عبدالصمد کھڑے ہوکر اس طرح مجمع کو مخاطب کرتے "اقبال میرا ہے ــ مجھے چندہ دو ۔ میں اُس کی طرف سے انجمن کو دوں گا" ۔ یہ حقیقت ہے کہ اُن کے اس طرح کے طرزِ عمل سے خوب چندہ جمع ہو جاتا تھا ۔

ابتدا میں حضرت مولانا سیّد انور شاہ جیسے مشہور عالمِ دین بھی مدرسہٴ فیضِ عام بارہ مولا میں پڑھاتے رہے تھے ۔ بعد میں وہ دیوبند تشریف لے گئے ۔ غالباً اقبال کے شیدائی ہونے کی ایک وجہ خواجہ عبدالصمد ککڑو کی وہ تعلیم و تربیت تھی جس میں سیّد انور شاہ جیسے بزرگوں کا بھی حصہ تھا اور سیّد انور شاہ سے ان کی وابستگی کی بدولت علامہ اقبال بھی ان کے گرویدہ تھے ۔ ان دونوں بزرگوں کے تعلقات انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسوں کی رودادوں سے واضح ہیں۔

خواجہ عبدالصمد ککڑو کا فرزند ، خواجہ غلام حسن ، ایک پابندِ صوم و صلواۃ اور ذہین نوجوان تھا ۔ اس کا انتقال عالمِ شباب ہی میں ہوگیا تھا جس سے خواجہ عبدالصمد کو ایک ناقابلِ برداشت صدمے سے دوچار ہونا پڑا ۔ اقبال کو جب اس نوجوان کی وفات کی

اطلاع ملی تو آپ نے مندرجہ ذیل مرثیہ لکھا :

اندھیرا صمد کا مکاں ہوگیا
وہ خورشیدِ روشن نہاں ہوگیا

بیاباں ہماری سرا بن گئی
مسافر وطن کو رواں ہوگیا

گیا اڑ کے وہ بلبلِ خوش نوا
چمن پائمالِ خزاں ہوگیا

نہیں باغِ کشمیر میں وہ بہار
نظر سے جو وہ گل نہاں ہوگیا

گیا کارواں اور میں راہ میں
غبارِ رہِ کارواں ہوگیا

گرا کٹ کے آنکھوں سے لختِ جگر
مرے صبر کا امتحاں ہوگیا

بڑھا اور اک دشمنِ جاں ستاں
دھؤاں آہ کا آسماں ہوگیا

ستم اس غضب کا خزاں نے کیا
بیاباں مرا بوستاں ہوگیا

ہوئی غم سے عادت کچھ ایسی مجھے
کہ غم مجھ کو آرامِ جاں ہوگیا

جدائی میں نالاں ہوں بلبل نہ کیوں
وہ گل زیبِ باغِ جناں ہوگیا

وہ سرخی ہے اشکِ شفق رنگ میں
حریفِ مئے ارغواں ہوگیا

بنایا تھا ڈر ڈر کے جو آشیاں
وہی نذرِ برقِ تپاں ہوگیا

کروں ضبط اے ہم نشیں کس طرح
کہ ہر اشک طوفاں نشاں ہوگیا

غضب ہے غلامِ حسن کا فراق
کہ جینا بھی مجھ کو گراں ہوگیا

دیا چن کے وہ غم فلک نے اسے
کہ مقبل سراپا فغاں ہوگیا

اقبال کا یہ مرثیہ ماہنامہ ''مخزن'' لاہور میں ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا تھا جس پر مدیرِ ''مخزن'' شیخ عبدالقادر نے مندرجہ ذیل نوٹ لکھا تھا:

''ہمارے ایک عنایت فرما رئیسِ بارہ مولا خواجہ عبدالصمد ککڑو ہیں۔ انھیں چند روز ہوئے اپنے چہیتے اور ہونہار بیٹے کی مرگِ ناگہانی کا داغ دیکھنا پڑا۔ خواجہ صاحب خود عالم اور علم دوست رئیس ہیں جو فارسی زبان کے طبّاع شاعر ہیں اور مقبل تخلص کرتے ہیں۔ مگر اس رنج نے ان کی طبّاعی اور زندہ دلی پر پانی پھیر دیا ہے اور انھیں تصویرِ غم بنا دیا ہے۔ شیخ محمد اقبال صاحب نے ان کی طرف سے مرحوم کا نوحہ لکھا ہے جو اوپر درج کیا گیا۔''

خواجہ عبدالصمد ککڑو سے اقبال کے تعلقات کا ثبوت مندرجہ بالا نوحے سے بھی ملتا ہے۔

☆ ☆ ☆

۱۷

میر منشی سراج الدین احمد

لاہور ہمیشہ سے علم و ادب کا مرکز رہا ہے ۔ یہاں متعدد ادبی انجمنیں قائم تھیں اور علم و ادب کی اشاعت کے لیے طرح طرح کے علمی اور ثقافتی نوعیت کے جرائد جاری تھے ۔ ادبی جلسے اور مشاعرے بھی اکثر منعقد ہوتے رہتے تھے جن میں لاہور کے اہلِ ذوق اور سرکردہ شعرا بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے ۔

بزمِ ادب پنجاب کی سرگرمیوں نے ، جس کے صدر سالک صاحب اور سیکرٹری حفیظ جالندھری صاحب تھے ، مولانا تاجور کی انجمنِ اربابِ علم کا چراغ گل کر رکھا تھا ۔ اچھے اچھے شاعر اسی انجمن کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے ۔ ایک دفعہ کشمیر ریزیڈنسی کے میر منشی سراج الدین لاہور آئے ۔ یہ صاحب پنجاب کے نہایت ممتاز اہلِ ذوق حضرات میں سے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے بے تکلف دوست بھی تھے ۔ یہ بات ڈاکٹر صاحب کے اُن خطوط سے بھی واضح ہے جو اُنھوں نے خود منشی سراج الدین احمد کو لکھے تھے ۔ منشی صاحب کو اُردو اور فارسی کے ہزارہا اشعار ازبر تھے جنھیں وہ خوب صورت ادائگی کے ساتھ اور نہایت برمحل استعمال کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ لاہور میں ان کی موجودگی کے موقع پر ایک مشاعرہ ایس ۔ پی ۔ ایس ہال

بیرون موری دروازہ میں منعقد ہوا ۔ حفیظ جالندھری نے منشی صاحب کو اس مشاعرے کی صدارت پر آمادہ کر لیا اور انھوں نے نہایت عالمانہ اور دلچسپ خطبۂ صدارت پیش کیا ۔ شعرا نے کلام سنایا اور انھوں نے ہر اچھے شعر پر نہایت دل کھول کر داد دی ۔ آپ نے خود بھی اپنا کلام سنایا ۔ وہ اس قدر ڈوب کر ذوق سے شعر پڑھتے تھے کہ فنا فی الشعر ہو جاتے تھے ۔ آخر میں فرمانے لگے کہ میں اپنی بے بضاعتی کو دیکھتا ہوں اور پھر اس شرفِ صدارت کو دیکھتا ہوں تو خواجہ حافظ کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے :

به صدر مصطبه ام می نشاند اکنون دوست
گدائے شہر نگہ کن کہ میرِ مجلس شد

حافظ کی غزل کے اشعار کو انھوں نے اس قدر برمحل ادا کیا کہ سارا مشاعرہ داد و تحسین کا ہنگامہ زار بن گیا ۔

علامہ اقبال نے منشی سراج الدین صاحب کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں سے چند چھپ بھی چکے ہیں ۔ پہلے ہی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ منشی صاحب نے حضرتِ علامہ کو ایک انگوٹھی بطورِ تحفہ ارسال کی تھی جس سے متاثر ہو کر علامہ نے شکریے کے طور پر ۱۹۰۲ء میں ایک طویل نظم لکھی جس کا مطلع یہ ہے :

آپ نے مجھ کو جو بھیجی ارمغاں انگشتری
دے رہی ہے مہر و الفت کا نشاں انگشتری

ممکن ہے یہ نظم ''مخزن'' میں بھی شائع ہو چکی ہو کیونکہ علامہ نے خود خواہش کی تھی کہ اسے ''مخزن'' میں بھیج دیجیے ۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں حضرتِ علامہ نے انھیں ایک خط لکھا جو

یوں شروع ہوتا ہے :

''آپ کا خط ملا ۔ الحمد للہ آپ خیریت سے ہیں ۔ آج عید کا دن ہے اور بارش ہو رہی ہے ۔ گرامی صاحب تشریف رکھتے ہیں اور شعر و سخن کی محفل گرم ہے ۔ شیخ عبدالقادر ابھی اٹھ کر کسی کام کو گئے ہیں اور بشیر حیدر بیٹھے ہیں ۔ ''ابرِ گہربار'' کی اصل علّت کی آمد آمد ہے ۔ یہ جملہ شاید آپ کو بےمعنی معلوم ہو مگر کبھی بوقتِ ملاقات آپ پر اس کا مفہوم واضح ہو جائے گا ۔ . . . ''ابرِ گہربار'' شروع کرنے سے پیشتر میں نے اس خیال سے کہ کوئی وہابی اس کے بعض اشعار پر کوئی فتویٰ نہ دے دے . . . ۔''

''ابرِ گہربار'' چوتھی نظم تھی جو علامہ اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام کے اٹھارھویں سالانہ جلسے (منعقدہ یکم مارچ ۱۹۰۲ع) میں ظہر اور عصر کے درمیان پڑھی تھی ۔ یہ ایک طرح کی عاشقانہ نعت تھی جو حضور سرور کائناتؐ کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت کے طور پر پیش کی گئی تھی ۔ انجمن کے اس جلسے کی صدارت خان بہادر غلام احمد خان مشیرِ مال ریاست جموں و کشمیر نے فرمائی تھی ۔ اس نظم کا مطلع یہ ہے :

دل میں جو کچھ ہے زباں پر لاؤں کیونکر
ہو چھپانے کی جو بات چھپاؤں کیونکر

غرضیکہ منشی سراج الدین احمد کے نام حضرتِ علامہ کے متذکرہ خط میں اسی نظم کی طرف اشارہ ہے جسے وہ ان دنوں انجمن کے مذکورہ جلسے کے لیے لکھ رہے تھے ۔ ''لفظ وہابی'' سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے آنحضرتؐ کی شان میں جو والہانہ

اشعار لکھے ہیں ، ممکن ہے بعض حضرات کی طبعِ نازک پر ناگوار گزریں ۔

اس خط میں حضرتِ علامہ نے اپنی محفل کے بعض احباب کا بھی ذکر کیا ہے ۔ باقی حضرات کا ذکر تو کہیں نہ کہیں مل جاتا ہے مگر بشیر حیدر کا نام بعض لوگوں کے لیے نیا ہے ۔ یہ صاحب سیالکوٹ کے رہنے والے اور علامہ کے نہایت بے تکلف دوست تھے ۔

منشی سراج الدین کے ایک خط کے جواب میں علامہ لکھتے ہیں ـــــ مثنوی "اسرار خودی" کا ذکر ہو رہا ہے :

"الحمد للہ کہ مثنوی آپ کو پسند آئی ۔ آپ ہندوستان کے اُن چند لوگوں میں سے ہیں جن کو شاعری سے طبعی مناسبت ہے ، اور اگر نیچر ذرا فیاضی سے کام لیتی تو آپ کو زمرۂ شعرا میں پیدا کرتی ۔ بہرحال شعر کا صحیح ذوق شاعری سے کم نہیں ، بلکہ کم از کم ایک اعتبار سے اس سے بہتر ہے ۔ محض ذوقِ شعر رکھنے والا شعر کا ویسا ہی لطف اُٹھا سکتا ہے جیسا کہ خود شاعر اور تصنیف کی شدید تکلیف اسے اُٹھانی نہیں پڑتی . . . ۔"

آگے چل کر اقبال وضاحت کرتے ہیں :

"یہ مثنوی گزشتہ دو سال کے عرصے میں لکھی گئی ہے ۔ اس طرف کئی ماہ کے وقفوں کے بعد طبیعت مائل ہوتی ہے اور یہ ثمر ہے اتوار کے چند فارغ دنوں اور بعض بے خواب راتوں کا ۔ اگر مجھے مکمل فرصت نصیب ہوتی تو یہ مثنوی موجودہ صورت سے کہیں بہتر ہوتی ۔ اس کا دوسرا حصہ بھی ہوگا جس کے مضامین میرے ذہن میں محفوظ ہیں اور یہ حصہ پہلے حصے سے کہیں بہتر ہوگا :

کم از کم مطالب کے اعتبار سے ، گو زبان اور تخیّل کے اعتبار سے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہوگا ۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے ، اپنے اختیار کی بات نہیں ۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کر دوں جس کی اشاعت رسول کریمؐ کی زبانِ مبارک سے ہوئی ۔ صوفی لوگوں نے اسے تصوّف پر حملہ قرار دیا ہے اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے ۔ انشاء اللہ دوسرے حصے میں دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے اور کہاں سے آیا اور صحابہؓ کرام کی زندگی سے کہاں تک اُن تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جن کا تصوف حامی ہے ۔"

اقبال کے اس خط کے مذکورہ اقتباسات سے دو امور پر روشنی پڑتی ہے : ایک تو منشی سراج الدین احمد کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسرے علامہ کے عقیدۂ تصوف کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے ۔ اس خط میں اقبال نے نہایت وضاحت سے تصوّف سے متعلق اپنے عقیدے کو لوگوں پر عیاں کر دیا ہے ۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے : ایک مرتبہ جلیل لکھنوی ، نواسہؓ حضرت میر انیس ، لاہور میں تشریف لائے ہوئے تھے ۔ محلہ چہل بیبیاں کی ناصر حویلی میں مجلس تھی اور اس کے قریب ہی منشی سراج الدین احمد کی رہائش تھی ۔ اس مجلس میں اقبال ، سر عبدالقادر ، ڈاکٹر تاثیر اور سالک مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے ۔ اس محفل میں جس انداز سے منشی سراج الدین نے اپنی سخن فہمی کے جوہر دکھائے اور شاعر کو داد دی اس پر ساری محفل عش عش کر اٹھی ۔

غرض جس محفل میں بھی منشی صاحب ہوتے اس میں شعر و

سخن کے ایسے ایسے نکات سامنے آتے کہ اہلِ سخن دنگ رہ جاتے۔

میں ۱۹۳۷ء میں پیرس میں تھا۔ وہاں اکثر منشی سراج الدین کی شعرفہمی کا ذکر اقبال شیدائی سے ہوتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ کسی طرح ان سے غالب کے اُردو دیوان کی شرح لکھوائی جائے کیونکہ جس طرح وہ شعر کے اندر ڈوب جاتے ہیں، اس معاملے میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

☆ ☆ ☆

۱۸

شکوہ اور جوابِ شکوہ

(جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان)

۱۹۱۰ء - ۱۹۱۱ء میں جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان کی وجہ سے ملک کی فضا اچھی نہیں تھی - اس وقت دفعہ ۳۰ کا نفاذ تھا جس کی وجہ سے کوئی پبلک جلسہ نہیں ہو سکتا تھا - ممالکِ اسلامیہ میں مسلمانوں پر کھلے عام مظالم ہو رہے تھے اور ہر شخص اس صورت حال سے پریشان تھا - چنانچہ ٦ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو مسلمانانِ لاہور شاہی مسجد میں نمازِ عصر کے لیے جمع ہوئے اور ایک جلسہ کیا - اس جلسے میں علامہ اقبال بھی موجود تھے - انھوں نے اس موقع پر اپنی ایک نظم ''حضورِ رسالت مآب میں'' ترنم سے پڑھی تھی - یہ نظم سننے کے لیے کثیر تعداد میں لوگ جمع ہوئے جن میں سربرآوردہ مسلمان بھی خاصی تعداد میں موجود تھے - میاں سر محمد شفیع ، شیخ عبدالقادر اور انجمنِ حمایتِ اسلام سے تعلق رکھنے والے بیشتر سرکردہ ارکان اس موقع پر موجود تھے - جب علامہ نے یہ بند پڑھا تو لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے :

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے ، وہ زندگی نہیں ملتی

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے، جنّت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمّت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اس نظم نے مسلمانانِ لاہور کے دلوں میں ایک قیامت برپا کر دی تھی ۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو آنسوؤں سے لبریز نہ ہو اور کوئی دل ایسا نہ تھا جو مسلمانانِ طرابلس و بلقان کی مصیبت پر تڑپ نہ اٹھا ہو ۔

اس سے قبل علامہ نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے منعقدہ رواز ہوسٹل میں اپریل سنہ ۱۹۱۱ع میں پڑھی تھی ۔ اس موقع پر آپ کے والدِ گرامی بھی موجود تھے ۔ پھر اکتوبر ۱۹۱۲ع میں آپ نے اپنی دوسری نظم "جوابِ شکوہ" موچی دروازے کے باہر باغ میں منعقدہ ایک جلسے میں سنائی تھی ۔ اس جلسے میں جس قدر چندہ جمع ہوا تھا وہ ساری رقم جنگ بلقان کے مجاہدین کی امداد کے لیے ارسال کر دی گئی تھی ۔ میں اس جلسے میں موجود تھا ۔ اس کی صدارت چودھری شہاب الدین مرحوم نے کی تھی ۔ مولانا ظفر علی خاں بھی جلسے میں شریک تھے ۔ علامہ کی نظم سے پیشتر آغا حشر نے بھی اپنی نظم سنائی تھی ۔

اس جلسے سے چند دن پیشتر ایک اور جلسہ محمڈن ہال بیرون موچی دروازہ میں منعقد ہوا تھا جس میں اٹلی کی بنی ہوئی ترکی ٹوپیوں کو اظہارِ ناراضگی کے طور پر ترک کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا کیونکہ جنگِ طرابلس و بلقان اٹلی نے چھیڑی تھی اور مسلمانوں پر

مظالم ڈھائے جا رہے تھے ۔ مجھے یاد ہے سب سے پہلے بٹالہ کے رہنے والے اور گورنمنٹ کالج کے ایک طالب علم قاضی محمد حسین نے اپنی ٹوپی اتار کر زمین پر پھینکی تھی ۔ اس کے بعد تمام حاضرین نے ، جنھوں نے اٹلی کی بنی ہوئی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں ، اپنی ٹوپیاں اتار کر پھینک دیں اور ہال میں ان ٹوپیوں کا ڈھیر لگ گیا ۔ اس جلسے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم کثیر تعداد میں شریک ہوئے تھے ۔

انھی ایام میں محمڈن ہال میں ایک اور جلسہ بھی ہوا تھا جس میں علامہ نے کسی بیرونی یونیورسٹی کے پروفیسر کی آمد پر فلسفے پر انگریزی زبان میں ایک لیکچر دیا تھا ۔ یہ لیکچر زبانی دیا گیا تھا، یہاں تک کہ اس سلسلے میں لکھے ہوئے اشارات بھی علامہ کے سامنے نہیں تھے ۔ اس کا عنوان یہ تھا : Subjective mind and Objective mind [1] اس لیکچر میں فلسفے کے چند نوجوان طلبہ نے بھی حصہ لیا تھا اور مولوی صدر الدین صاحب نے بھی چند اشارات پیش کیے تھے ۔ علامہ نے اس لیکچر میں یورپ کے بعض مشہور اساتذۂ فلسفہ کی اغلاط کی نشان دہی فرمائی تھی اور منطق کی شکلِ اوّل پر بھی اعتراض کیے تھے ۔ یہ لیکچر چونکہ جنگِ طرابلس کے زمانے میں دیا گیا تھا لہٰذا علامہ نے دورانِ تقریر میں اس جنگ کو بھی موضوعِ سخن بنایا تھا ۔

☆ ☆ ☆

۱۔ میرے نزدیک اس انگریزی عنوان کا ترجمہ ''نفسی یا اندرونی کیفیت اور خارجی یا نظری کیفیت'' ہو سکتا ہے ۔

۱۹

اسرارِ خودی

سب سے پہلے ''اسرارِ خودی'' ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی ۔ یہ ایک چھوٹے سائز کا نہایت دیدہ زیب ایڈیشن تھا ۔ اس کے شروع میں اردو کا ایک مقدمہ بھی شامل تھا اور اسے سر علی امام کے نام منسوب کیا گیا تھا ۔ اس میں چونکہ تصوف کے ایک خاص مسلک پر تنقید کی گئی تھی لہٰذا ملک بھر میں اس کے خلاف احتجاج شروع ہو گیا ۔ تصوف کے جس مسلک کی علامہ نے مخالفت کی تھی اس کی وضاحت ان اشعار سے ہوگی :

هوشیار از حافظِ صهبا گسار
جامش از زهرِ اجل سرمایه دار

بے نیاز از محفلِ حافظ گذر !
الحذر ! از گوسفندان الحذر !

صدیوں سے مسلمان حافظ کے مسلکِ تصوف پر چل رہے تھے اور اس کی سچائی کو شک و شبہہ سے بالا سمجھتے تھے ۔ جب علامہ نے اس پر تنقید کی تو مخالفت کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا اور علامہ کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی لوگ ان کے اس نقطۂ نظر سے

کسی طرح اتفاق نہ کر سکے ۔ چنانچہ اس سلسلے میں علامہ پر تنقید اور اعتراضات کا ایک ایسا سلسلہ چل نہ نکلا جو اُس وقت تک جاری رہا جب تک علامہ ان متنازعہ اشعار کو خارج کرنے پر مجبور نہ ہو گئے ۔ ذیل میں ان تنقیدات کی تفصیل دی جا رہی ہے :

(۱) حافظ محمد اسلم جیراجپوری نے حافظ پر علامہ کی تنقید کو ناپسند کیا اور "جوہرِ اقبال" نامی رسالے میں اس کے خلاف مضمون لکھا ۔

(۲) شیخ مشیر حسین قدوائی نے ، جو انگلستان میں تھے ، علامہ کے نظریات کے خلاف ایک زوردار مضمون ۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کے "زمیندار" میں لکھا ۔ علاوہ ازیں دوسرے رسائل میں بھی انھوں نے "اسرارِ خودی" کے خلاف مضامین شائع کرائے ۔

(۳) حکیم فیروز الدین طغرائی نے "لسان الغیب" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا جس میں اسلم جیراجپوری کے اعتراضات کی تائید کی ۔

(۴) پروفیسر محمود علی نے ، جو اپنی کتاب "دین و دانش" کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے اور رندھیر کالج کپورتھلہ میں پڑھاتے تھے ، علامہ کے خلاف ایک مضمون لکھا ۔

(۵) ملک محمد کاشمیری ، جو جہلم کے باشندے تھے ، انھوں نے حافظ کی تائید اور تعریف میں ایک مثنوی لکھی ۔

(۶) خان بہادر مظفر احمد فضلی پینشنر ڈپٹی کلکٹر نے "اسرارِ خودی" کے جواب میں ایک نظم لکھی اور حافظ کی مدح سرائی کی ۔

(۷) خواجہ حسن نظامی دہلوی ، جو علامہ اقبال کے بہت بڑے مداح تھے ، حافظ پر علامہ کی تنقید برداشت نہ کر سکے اور ان کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے ۔ چنانچہ انھوں نے اخبار ''وکیل'' امرتسر میں ایک مخالفانہ مضمون لکھا جو ۲۹ دسمبر ۱۹۱۵ع کو شائع ہوا ۔ وہ علامہ کے ساتھ اس مسئلے پر خط و کتابت بھی کرتے رہے ۔

(۸) ایک صاحب ، جو علامہ کے احباب میں سے تھے ، انھوں نے درپردہ علامہ کی مخالفت شروع کر دی اور کشّاف کے نام سے ایک مضمون ۲۲ دسمبر ۱۹۱۵ع کے اخبار ''وکیل'' امرتسر میں شائع کرایا ۔

(۹) سید سلیمان پھلواری بھی علامہ کے مداح تھے مگر اس موقع پر وہ بھی علامہ کی مخالفت پر اتر آئے اور مسئلۂ وحدت الوجود کو قرآن مجید سے ثابت کرنے کی کوشش کی ۔

(۱۰) ذوق شاہ نے ایک طویل مضمون لکھا جس میں تصوّف کو عینِ اسلام ثابت کرنے کی سعی کی ۔

(۱۱) مولانا عبدالمجید سالک نے بھی اس مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک مضمون بعنوان ''اسرارِ خودی'' ہفت روزہ ''قندیل'' میں لکھا ۔

بالآخر علامہ اقبال نے اپنے نظریات کی وضاحت ایک مضمون میں کی جو امرتسر کے اخبار ''وکیل'' میں ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ع کو شائع ہوا ۔ اس کے علاوہ دو مضامین اور بھی اس ضمن میں علامہ نے لکھے تھے ۔ ان میں سے ایک کا عنوان ''تصوّفِ وجودیہ'' تھا اور

یہ بھی اخبار ''وکیل'' میں ۲۳ دسمبر ۱۹۱۶ع کو شائع ہوا تھا ۔

تاہم علامہ کے ان تمام مضامین اور علمی دلائل کے باوجود معترضین اپنے نقطۂ نظر پر اڑے رہے اور بالآخر علامہ کو اندھی عقیدت اور تقلید پرستی کے اس طوفان کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا ۔ نتیجتاً تصوّف کے اس خاص مسلک کے خلاف جو اشعار انھوں نے ''اسرارِ خودی'' کے پہلے ایڈیشن میں شامل کیے تھے انھیں دوسرے ایڈیشن سے خارج کر دیا اور یوں یہ طوفان تھم گیا ۔ جو مقدمہ علامہ نے ''اسرارِ خودی'' کے پہلے ایڈیشن میں اپنے نظریات کی تائید میں شامل کیا تھا ، وہ بھی انھوں نے دوسرے ایڈیشن میں حذف کردیا ۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ۔

☆ ☆ ☆

۲۰

ایک مشاعرہ

میں نے قبل ازیں بیان کیا ہے کہ علامہ اقبال نے جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان کے موقع پر نظمیں بعنوان ''حضورِ رسالت مآبؐ میں'' اور ''جوابِ شکوہ'' مسلمان پبلک کو بیدار کرنے کی غرض سے پڑھی تھیں ، کیونکہ یہ جنگیں دراصل اسلامی ممالک کے خلاف تھیں جن کے ساتھ ہم لوگ مذہبی حیثیت سے تعلق رکھتے تھے۔ جنگِ بلقان کے فوراً بعد ۱۹۱۴ء سے یورپ میں جنگ عظیم اول شروع ہو گئی ۔ اس میں برٹش نے بھی حصہ لیا تھا یا اسے ملوث کر لیا گیا تھا ۔ جنگ کا خاتمہ ۱۹۱۸ء میں ہوا تو فتح کے جشن کے لیے ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۸ء کی تاریخ مقرر کی گئی ۔ اس وقت پنجاب کے گورنر سر مائکل اوڈوائر تھے جنھوں نے اس جشن کا انتظام کیا تھا اور اس سلسلے میں ایک مشاعرے کا انتظام بھی لاہور کے بریڈلا ہال میں کیا گیا تھا ۔ سرکاری طور پر علامہ اقبال کو اشعار پڑھنے کی دعوت دی گئی تھی ۔ راقم نے اس مشاعرے میں بطور ایک سامع کے شرکت کی تھی ۔

پنجاب کے سب چیدہ چیدہ شاعر اس مشاعرے میں مدعو تھے اور اس کی صدارت خود گورنر پنجاب نے کی تھی ۔ علامہ چونکہ خاص

طور پر اس میں مدعو تھے لہٰذا انھوں نے دو نظمیں آردو کی پڑھی تھیں جو براہِ راست اس جنگ سے متعلق نہ تھیں ۔ پھر آپ نے ایک فارسی نظم بھی پڑھی تھی جس کا اول شعر یہ ہے :

هیچ می دانی که صورت بندِ هستی با فرانس
فکرِ رنگین و دلِ گرم و شرابِ ناب داد

علامہ کو اس مشاعرے کا جج بنایا گیا تھا اور آپ نے اول انعام تلوک چند محروم کو دیا تھا ۔ اس تمام مشاعرے کی رپورٹ گورنمنٹ کے اپنے ہفتہ وار اخبار "حق" میں طبع ہوئی تھی ۔ اس کے علاوہ ہاتھی پر ایک جلوس بھی نکلا تھا جس پر پنجاب کے گورنر سوار تھے اور پیچھے عبدالعزیز (ماما جیجی) بیٹھا تھا ۔ اسی قسم کے جلسے جنگ کے خاتمے پر پنجاب کے دوسرے اضلاع میں بڑی ہوئے تھے ۔

☆ ☆ ☆

۲۱

اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ

یہ مسلّمہ امر ہے کہ یورپ میں اقبال کی معرکۃ الآرا تصنیف "اسرار خودی" کا ترجمہ، جو ڈاکٹر نکلسن نے بعنوان "سیکرٹ آف دی سیلف" کیا تھا، ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور ڈاکٹر نکلسن اس کارنامے کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یورپ کے لیے چونکہ یہ تصنیف غیر معمولی اہمیت کی حامل تھی لہٰذا ہر پڑھا لکھا آدمی اس ترجمے کی طرف متوجہ ہوا اور اس کا مطالعہ ضروری سمجھا۔ اس کے بعد یورپ کے مختلف جرائد میں جو تبصرے شائع ہوئے چونکہ وہ اہل ہندوستان کے لیے غیر معمولی اہمیت کے حاصل تھے لہٰذا یہاں کے اہلِ علم نے فوراً ان تبصروں کے تراجم پر اپنی توجہ مبذول کی اور مولوی سجاد علی انصاری صاحب نے "معارف" اعظم گڑھ میں ان تبصروں کی اشاعت کا آغاز کیا۔ چنانچہ سب سے پہلا تبصرہ، جو ہفتہ وار "اینتھم" میں ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا تھا، اس کا ترجمہ جون ۱۹۲۱ء کے "معارف" میں طبع ہوا۔ یہ تبصرہ مسٹر ای۔ ایم۔ فارسٹر نے کیا تھا۔ اردو ترجمے کی ابتدا میں مندرجہ ذیل سطور بطورِ تمہید شائع ہوئی تھیں:

"پروفیسر نکلسن کے ترجمۂ 'اسرار خودی' کے بعد یورپ

میں کلامِ اقبال پر خاص توجہ ہونے لگی ہے ۔ 'ٹائمز
لٹریری سپلیمنٹ' لندن ایک سے زائد ریویو کر چکا ہے ۔
ذیل میں اُس ریویو کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے جو مسٹر
ای ۔ ایم فارسٹر کے قلم سے انگلستان کے مشہور ہفتہ وار
'اینتھم' میں شائع ہوا ۔"

پھر جب کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ڈکنسن کا تبصرہ
ایک ہفتے بعد لندن کے ہفتہ وار رسالے "نیشن" میں شائع ہوا تو اس
کا اردو ترجمہ بھی سجاد علی انصاری نے کیا اور یہ بھی "معارف"
کے ستمبر ۱۹۲۱ع کے شمارے میں شائع ہوا ۔ تمہید کے الفاظ یہ ہیں :

"اقبال کی کتاب 'اسرار خودی' پر انگلستان کے ادبی رسالے
'اینتھم' نے جو ریویو کیا تھا اُس کا ترجمہ جون کے 'معارف'
میں دیا چکا ہے ۔ ذیل میں ایک دوسرے ہفتہ وار رسالے
'نیشن' کے ریویو کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے جو کیمبرج
کے پروفیسر ڈکنسن کے قلم سے نکلا ہے ۔"

مولوی سجاد علی صاحب نے فارسٹر کے تبصرے کے متعلق جو
رائے ظاہر کی تھی وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے :

"ڈاکٹر اقبال پر فارسٹر صاحب کا ریویو مغربی تنقید کی
گہرائیوں کی بیّن مثال ہے ۔ ناقد پر اس بات کی کوئی
ذمہ داری نہیں کہ شعر کو صحیح طور پر سمجھے یا شاعر
کو ۔ انصاف پسندی بس یہی چاہتی ہے کہ تعریف اور
مذمّت ساتھ ساتھ ہو ۔"

البتہ اقبال نے ڈکنسن کے تبصرے کی تعریف کی ہے اور اسے
سب سے دلچسپ بتایا ہے ۔

ڈاکٹر ملک راج انند نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں ، جو رائل

اکیڈمی جرنل میں شائع ہوا تھا، نکلسن کے ترجمۂ 'اسرار خودی' کے متعلق لکھا ہے :

''مسٹر ہربرٹ ریڈ نے مغربی شعرا کے کلام سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا تھا : ''اقبال کی دو نظموں پر والٹ وہٹمین کے فلسفۂ اقدام و عمل کا اثر پڑا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ وہٹمین کا نصب العین اس اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ وہ نظری نہیں بلکہ عملی ہے۔ صرف ایک شاعر ایسا ہے جس کے ہاں یہ چیز نظر آتی ہے اور وہ بھی ہماری نسل اور ہماری قوم سے نہیں ہے۔ میری مراد محمد اقبال سے ہے جن کی نظم 'اسرار خودی' کا ترجمہ ڈاکٹر رینالڈ نکلسن نے کیا ہے اور میکملن کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ ادھر ہمارے ملک کے متشاعر تو کیٹس کے زمانے کی پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں اور بلّیوں اور پرندوں یا دوسرے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر نظمیں لکھ رہے ہیں اور آدھر لاہور میں ایک ایسی نظم شائع ہو رہی ہے جس نے ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں پر پوری طرح تسلّط کر لیا ہے۔ ایک مسلم نوجوان لکھتا ہے کہ ''اقبال اس عہد کا مسیح ہے جس کی آتش نفسی نے مُردوں کو زندہ کر دیا ہے۔'' تم پوچھو گے کہ آخر اس میں کون سی ایسی ظاہری کشش ہے جس نے لوگوں کے دل اپنی طرف کھینچ لیے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معجزہ اس قسم کی کسی ظاہری کشش کا مرہونِ منّت نہیں ہے جو مبلّغوں اور دنیا کو نجات کا پیغام دینے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہ اعجاز ایک نظم نے دکھایا ہے جس کے حسن و

جمال کے آئینے میں فلسفۂ جدید کے اکثر مسائل منعکس
نظر آتے ہیں ۔ اس میں خیالات کی فراوانی ہے لیکن ان میں
اتحاد پایا جاتا ہے اور اس کی منطق ساری کائنات کے لیے
آوازِ غیب کا حکم رکھتی ہے ۔''

مسٹر ریڈ کا شمار مغرب کے بہترین شاعروں اور نقادوں میں
ہوتا ہے ۔ اس کا یہ خراجِ تحسین ایسا ہے جسے اقبال کو
اپنی کلاہ کا فخر اور طرّۂ امتیاز تصوّر کرنا چاہیے ۔''

مسٹر ای ۔ ایم ۔ فارسٹر کا تبصرہ ۱۹۲۱ع میں ''اینتھم'' کے
جس شمارے میں شائع ہوا تھا وہ اتفاق سے مجھے لاہور کی پنجاب
پبلک لائبریری میں نظر آیا ۔ میں نے اُسے کسی طرح مستعار حاصل
کیا اور اپنے بھائی عبدالرحمٰن چغتائی مرحوم کے ہمراہ سیدھا علامہ
کی خدمت میں پہنچا ۔ رسالہ ان کی خدمت میں پیش کیا تو بہت
خوش ہوئے کیونکہ ابھی تک انھوں نے یہ رسالہ نہیں دیکھا تھا ۔

اسی طرح پروفیسر براؤن نے ۱۹۲۱ع کے رسالۂ ایشیاٹک
سوسائٹی لندن میں ''اسرارِ خودی'' کے اس ترجمے پر تبصرہ کیا
تھا جس کا ذکر پروفیسر نکلسن کے تبصرۂ ''پیامِ مشرق'' کے ضمن
میں کیا گیا ہے ۔

ڈاکٹر نکلسن کے ترجمۂ ''اسرارِ خودی'' کو اطالوی زبان میں
بھی منتقل کیا گیا تھا ۔ یہ ترجمہ اٹلی کے ایک فاضل اے ۔ بونوجی
(A. Bonncci) نے کیا اور ۱۹۲۱ع میں شائع ہوا ۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ''اسرارِ خودی'' کی اوّلین اشاعت پر
ہندوستان کے بعض علمی حلقوں میں اچھا خاصا ہیجان پایا جاتا تھا ۔
چنانچہ اس سلسلے میں کئی مخالفانہ تبصرے بھی شائع ہوئے ۔ یہ
مخالفانہ فضا دراصل حضرت علامہ کے اُن نظریات کے خلاف ردِ عمل

کے طور پر پیدا ہوئی جو انھوں نے حافظ شیرازی کے فلسفۂ تصوف کے متعلق ''اسرارِ خودی'' میں ظاہر کیے تھے۔ اس سلسلے میں تبصروں پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ بعض حضرات نے تو کتابیں بھی لکھ ڈالی تھیں۔ بالآخر ''اسرارِ خودی'' کی دوسری اشاعت کے موقعے پر حافظ کے متعلق تمام مواد حضرت علامہ نے خارج کر دیا اور وہ مقدمہ بھی حذف کردیا جو اپنے نظریات کی تائید میں انھوں نے ''اسرارِ خودی'' کی پہلی اشاعت میں شامل کیا تھا۔

غیر ملکی تنقید نگاروں میں سے فارسٹر برابر علامہ کے نظریات پر لکھتے رہے۔ انھوں نے ۱۹۵۳ع کے ''پاکستان ریویو'' میں اور پھر ۲۱ اپریل ۱۹۵۹ع کے ''پاکستان ٹائمز'' میں ''یومِ اقبال'' کے موقعے پر مضامین لکھے۔

راقم کا کام اس سلسلے میں فقط اس قدر تھا کہ ''اسرارِ خودی'' کے ضمن میں شائع ہونے والے تبصرے، مضامین اور کتابیں بیشتر راقم نے فراہم کر کے علامہ کی خدمت میں پیش کیں اور اس سلسلے کی خط و کتابت میں بھی برابر ان کے ساتھ تعاون کیا۔

یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب علامہ نے نکلسن کے ترجمۂ ''اسرارِ خودی'' کا مطالعہ کیا تو انھیں کئی جگہ نکلسن کے ترجمے میں سقم نظر آئے۔ چنانچہ انھوں نے کئی بار احباب کی محفلوں میں نکلسن کی ان اغلاط کا ذکر فرمایا تھا۔ میں چونکہ علامہ کی خدمت میں اکثر حاضر رہتا تھا لہٰذا مجھے ان اغلاط کا علم تھا اور ان کا ذکر میں نے اپنے ایک مضمون میں بھی ضمناً کیا تھا۔ اس ترجمے پر مختلف اخبارات و رسائل میں جو تبصرے شائع ہوئے، علامہ نے ان کا مطالعہ بھی کیا اور بالآخر پروفیسر نکلسن کو ایک مفصّل خط لکھا جس کا اُردو ترجمہ

''فلسفۂ سخت کوشی'' کے عنوان سے ''نیرنگِ خیال'' کے سالنامے میں شائع ہوا۔

پھر علامہ نے ''اسرارِ خودی'' کے ایک نسخے پر وہ تمام تصحیحات درج کیں اور پروفیسر نکلسن کو وہ نسخہ بھیج دیا جو کافی عرصہ ان کے کتب خانے میں پڑا رہا۔ جب ۱۹۴۵ء میں پروفیسر نکلسن کا انتقال ہوگیا تو ان کی لائبریری کا کچھ حصہ کیمبرج کے ایک کتب فروش کے پاس فروخت کی غرض سے پہنچ گیا۔ اتفاقاً ایک روز پروفیسر آربری مذکورہ کتب فروش کی دکان پر پہنچے تو مختلف کتابوں کی ورق گردانی کے دوران میں ''اسرار'' کا وہ نسخہ بھی ان کے ہاتھ لگ گیا جو علامہ نے اپنی تصحیحات کے ساتھ نکلسن کو بھیجا تھا۔ پروفیسر آربری نے وہ نسخہ ڈاکٹر جاوید اقبال کو دکھایا جو ان دنوں کیمبرج میں تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر ایک مختصر مضمون لکھا اور پھر یہ مواد ''نوٹس آف اقبالز اسرارِ خودی'' کے نام سے چھپ گیا۔ اسے لاہور کے ناشر شیخ محمد اشرف نے شائع کردیا ہے۔

۱۹۳۲ء میں راقم الحروف لندن میں تھا جبکہ علامہ اقبال بھی گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن آئے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہم کچھ احباب علامہ کے مشورے سے کیمبرج گئے اور پروفیسر نکلسن سے مل کر ان سے درخواست کی کہ وہ علامہ کے چیدہ چیدہ اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کر کے دیں تاکہ ہم انہیں عبدالرحمٰن چغتائی کی تصاویر سے مزیّن کر کے شائع کردیں۔ ہم نے انہیں چغتائی کا تیار کردہ مصوّر کلامِ غالب بھی دکھایا جو ''مرقّعِ چغتائی'' کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔ مگر پروفیسر نکلسن نے اپنی دیگر مصروفیات اور خصوصاً بڑھاپے کی وجہ سے

معذرت کر دی ۔ ہم مایوس لوٹ آئے اور علامہ کو صورت حال سے مطلع کر دیا ۔

''اسرارِ خودی'' نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ یورپ میں بھی ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور اس پر طرح طرح کے اعتراضات ہوئے ۔ ہندوستان میں جو ردِ عمل ہوا اس کا ذکر قبل ازیں ہوچکا ہے ۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ علامہ کو ''اسرارِ خودی'' کی اشاعت سے پہلے اس بات کا احساس تھا کہ اس کتاب کی اشاعت کے موقع پر منفی ردِ عمل ظاہر ہوگا ۔ چنانچہ اس کی اشاعت سے پہلے آپ نے اپنے دوست محمد دین فوق کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ''طریقت'' کے نام سے ایک رسالہ شائع کریں ۔ اس پر انہوں نے اپنے رسالے ''کشمیری میگزین'' کی جگہ اگست ۱۹۱۴ء کو یہ رسالہ شائع کیا جس میں تصوّف کے متعلق علامہ کا مفصّل تبصرہ بھی شائع ہوا ۔ یہ تبصرہ سوال و جواب کی شکل میں ہے جو پڑھنے کے لائق ہے ۔ اس میں علامہ کے وہ تمام نظریات موجود ہیں جو ''اسرارِ خوی'' کی بنیاد بنے تھے مگر کہیں بھی اس بات کا اشارہ نہیں کیا گیا کہ ''اسرارِ خودی'' شائع ہو رہی ہے ۔ یہ درست ہے کہ علامہ نے غلط قسم کے تصوّف اور وحدت الوجود جیسے نظریات کے مضر اثرات سے لوگوں کو حتی الامکان بچانے کی کوشش کی اور انہوں نے ''اسرارِ خودی'' کے لیے راستہ بھی ایک حد تک ہموار کیا مگر نتیجہ وہی نکلا جس کی انہیں توقع تھی اور ''اسرارِ خودی'' کی اشاعت پر مخالفت کا طوفان کھڑا ہوگیا ۔ ایک خط وہ اپنے دوست محمد دین فوق مدیرِ ''طریقت'' کو لکھتے ہیں ۔ اس میں پیر

جماعت علی شاہ کا ذکر ملاحظہ فرمائیے :

''ڈیر فوق !

آپ کبھی ملتے بھی نہیں ۔ اب تو آپ ''پیرِ طریقت'' بھی بن گئے ہیں ۔ خدا کرے جلد حافظ جماعت علی شاہ صاحب کی طرح آپ کے ورودِ کشمیر کے متعلق بھی اطلاعیں شائع ہوا کریں ۔''

۲۲ جولائی ۱۹۱۵ع　　　آپ کا خادم ، محمد اقبال''

☆ ☆ ☆

۲۲

ترکِ موالات

(۱۹۲۰ء)

ہندوستان میں ترکِ موالات کے اعلان کے بعد جس قوم نے سب سے پہلے اس میں حصہ لیا اور سب سے شدید اثر اس تحریک کا قبول کیا وہ مسلمان تھے ۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا محمد علی جوہر نے علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ سے اس تحریک میں شمولیت کی اپیل کی تو باوجود یونیورسٹی سے جذباتی لگاؤ اور جوش و خروش کے مسلمان طلبہ نے انگریزی پروفیسروں کا بائیکاٹ کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی غیر معینہ عرصے کے لیے بند ہو گئی ۔ اس کے مقابلے میں گاندھی جی نے سرتوڑ کوشش کی کہ کسی طرح بنارس کی ہندو یونیورسٹی بند ہو جائے مگر مدن موہن مالوہ نے ان کی ایک نہ چلنے دی اور بالآخر انھیں بے نیلِ مرام واپس آنا پڑا ۔

اسی طرح لاہور کے اسلامیہ کالج کو بند کرنے کی سرتوڑ کوشش ہوئی ۔ راقم ان دنوں کالج کے سٹاف میں شامل تھا ۔ میاں فضل حسین جیسے مدبّر سیکرٹری تھے اور علامہ اقبال جنرل سیکرٹری تھے ۔ کالج میں طلبہ کا ایک خاص گروپ اس بات پر مصر تھا کہ کالج کو

بند کر دیا جائے ۔ مجھے حبیبیہ ہال کا جلسہ اچھی طرح یاد ہے جس میں پروفیسر مظفر الدین قریشی اور طالب علم عبدالباری نے ایسی دھؤاں دھار تقریریں کی تھیں کہ برطانیہ کی پارلیمنٹ میں بھی ایسی تقریریں نہیں ہوئی ہوں گی ۔ یہ تمام تقریریں انگریزی زبان میں ہوئی تھیں جن میں انگریزوں کے خلاف اور ترکِ موالات کے حق میں پورا زورِ خطابت مقررین نے صرف کردیا تھا ۔ اس کے علاوہ روزنامہ ''زمیندار'' نے بھی ایک مقالۂ افتتاحیہ سپرد قلم کیا جس میں اسلامیہ کالج کو غیرت دلائی گئی تھی کہ وہ بھی تحریکِ ترکِ موالات میں شامل ہو کر اتحادِ ملتی کا ثبوت دے ۔ اس مقالۂ افتتاحیہ کا عنوان یہ شعر تھا :

بر درِ مدرسہ تاچند نشینی حافظ
خیز تا از درِ میخانہ کشادی طلبیم(؟)

اس کا یہ اثر ہوا کہ کالج میں مکمل طور پر ہڑتال ہوگئی جس سے میاں فضل حسین سخت برہم ہوئے ۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن ، جبکہ ہڑتال پورے شباب پر تھی ، ایک ٹرک کا انتظام کیا گیا اور تمام شوریدہ سر لڑکوں کو پکڑ کر ٹرک میں ڈال دیا گیا ۔ پھر یہ ٹرک لڑکوں کو دور دراز مقامات پر چھوڑ آیا جہاں سے وہ دوسرے تیسرے روز پیدل چل کر پہنچے ۔ ان میں ایک شخص مسٹر نیلسن (ایک آنکھ والا) یعنی مسٹر غلام حسین بھی شامل تھا جو سب سے زیادہ شوریدہ سر تھا ۔ اسی زمانے میں دہلی میں جامعہ ملیہ قائم ہوئی تھی ، اگرچہ اس کی مالی حالت سخت خراب تھی ۔

پروفیسر خواجہ عبدالحمید لکھتے ہیں : ''نومبر ۱۹۲۰ء میں ہندوستان بھر میں تحریکِ عدمِ تعاون زوروں پر تھی ۔ لاہور میں کانگریس کے کارکنوں کی خاص توجہ اسلامیہ کالج پر تھی ۔ ہندو اور

مسلمان اکابر لاہور میں جمع تھے اور ان کی ہدایات پر کانگریسی کارکنوں نے اسلامیہ کالج میں پڑھائی کا کام تقریباً ناممکن بنا دیا تھا ، یہاں تک کہ اسلامیہ کالج کا وجود معرضِ خطر میں پڑ گیا تھا ۔ ڈاکٹر اقبال ان دنوں انجمن حمایت اسلام کے جنرل سیکرٹری تھے ۔ چنانچہ ایک روز کالج کے چند پروفیسروں نے (جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا) یہ فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان متضاد فتووں اور قراردادوں کے متعلق ، جن کی بارش ہر سمت سے کالج میں ہو رہی تھی ، ان کی رائے دریافت کی جائے ۔ ڈاکٹر صاحب اُن دنوں انارکلی والے مکان میں رہتے تھے ۔ جب ہم پہنچے تو حسبِ عادت آرام کرسی پر بیٹھے تھے اور حُقّے سے شغل فرما رہے تھے (میں نے انھیں ان کی قیام گاہ میں حُقّے کے بغیر کبھی نہیں دیکھا) ۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک تحریکِ عدمِ تعاون کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوتی رہی ۔ معلوم ہوا کہ ابھی انھوں نے اس تحریک کی ضرورت اور اہمیت کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی ۔ گاندھی جی کی انھوں نے بہت تعریف کی اور جو کام وہ ہندو قوم کے لیے کر رہے تھے اسے مدِنظر رکھتے ہوئے فرمانے لگے کہ کوئی تعجب نہ ہوگا اگر ہندوؤں کی آیندہ نسلیں انھیں اوتار تسلیم کر لیں ۔ آخر میں ہم لوگوں نے دریافت کیا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے ؟ ظریفانہ انداز میں فرمانے لگے کہ جس قدر کام کالج میں ہو سکتا ہے ، کرتے جاؤ ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کالج ٹوٹ جائے اور آپ لوگوں کو تلاشِ روزگار کی زحمت اٹھانا پڑے ۔ بلکہ میرا مشورہ ہے کہ ایک وقت کا کھانا چھوڑ دو ۔ میں نے بھی یہ کام شروع کردیا ہے اور میری صحت پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا ہے ۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا اور ہم لوگ سلام کر کے واپس آ گئے ۔“

یہ بہت ہی ابتلا اور آزمائش کا زمانہ تھا جس میں ہر شخص پریشان تھا ۔ راقم بھی اُن دنوں ڈی ۔ پی سکول لدھیانہ سے طویل چھٹی لے کر لاہور آ گیا تھا ۔ لاہور میں پارٹ ٹائم ملازمت تو مل گئی مگر یہاں بھی روز بروز کالج کو بند کر دینے کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا ۔ تاہم یہ کالج محض میاں سر فضل حسین کے مدبّرانہ رویے کی بدولت اس طوفان کی نذر ہونے سے بچ گیا ۔

جب تحریکِ ترکِ موالات میں شریک ہونے اور کالج کو بند کر دینے کا مطالبہ زور پکڑ گیا تو ۱۹۲۰ع میں انجمن حمایتِ اسلام کے زیرِ اہتمام مناظرانہ نوعیت کے ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا ۔ اس میں تمام سرکردہ ارکان مثلاً میاں سر فضل حسین ، شیخ عبدالقادر ، علامہ اقبال اور سزنگ پارٹی نے شرکت کی ۔ کل تیس ارکان اس مذاکرے میں شریک ہوئے ۔ علاوہ ازیں مونالا محمد علی جوہر ، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو بطور خاص اس جلسے میں مدعو کیا گیا تھا جنھوں نے پورے زور شور سے ترکِ موالات کے حق میں تقریریں کیں ۔ مولانا آزاد نے ترکِ موالات کے حق میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ مسلمانوں کے دشمن ہیں ان سے ترکِ موالات کرنا عین ایمان ہے ۔ اُن لوگوں کی طرف سے ، جو ترکِ موالات کے حق میں نہیں تھے ، خان بہادر شیخ عبدالقادر نے تقریر کی اور کہا کہ مسلمان پہلے ہی تعلیمی لحاظ سے خاصے پس‌ماندہ ہیں ۔ اگر ترکِ موالات میں حصہ لے کر مسلمان طلبہ کو تعلیم سے محروم کیا گیا تو اس سے ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا ۔ پھر مولانا محمد علی نے ایک طویل تقریر ترکِ موالات کے حق میں کی جس کے بعد ممبران کی تحریک سے ایک ریزولیوشن پیش کیا گیا ۔ اس میں تحریر تھا کہ گورنمنٹ سے آئندہ کوئی مالی امداد نہ لی جائے اور یہ مالی بوجھ مسلمان

قوم خود اٹھائے۔ نیز اگر طلبہ کثرتِ رائے سے منظور کر لیں تو کالج کا الحاق یونیورسٹی سے ختم کر دیا جائے۔

جب یہ ریزولیوشن پیش ہوا تو علامہ اقبال اور دوسرے تمام ہم خیال ارکان نے اس کی سخت مخالفت کی۔ کیونکہ سوال امداد کا نہیں تھا اور نہ ہی مالی امداد کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ اصل مسئلہ طلبہ کی تعلیم اور مستقبل کا تھا جو کالج بند ہونے سے یقیناً خطرے میں پڑ جاتا۔

اس موقع پر علامہ نے خود بھی ایک خط روزنامہ ''زمیندار'' کو اسلامیہ کالج کے یونیورسٹی سے الحاق کے بارے میں ۱۵ نومبر ۱۹۲۰ء کو لکھا جو ''زمیندار'' میں ۱۸ نومبر ۱۹۲۰ء کو طبع ہوا۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

''السلام علیکم! آج کے ''زمیندار'' میں جنرل کونسل انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے جلسہ منعقدہ ۱۴ نومبر ۱۹۲۰ء کی کارروائی پر آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ایک آدھ فروگذاشت ہوگئی ہے جس کا ازالہ عام مسلمانوں کی آگاہی کے لیے ضروری ہے، لہٰذا یہ چند سطور لکھتا ہوں۔ مہربانی کر کے اپنے اخبار میں درج فرما کر ممنون کیجیے۔ اراکینِ کونسل کے سامنے تین تجویزیں تھیں:

(۱) اسلامیہ کالج کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے جاری رکھا جائے۔ محرک میاں فضل حسین صاحب سیکرٹری کالج، مؤید مولوی فضل الدین صاحب وائس پریذیڈنٹ انجمن۔

(۲) انجمنِ حمایتِ اسلام اپنے طور پر علمائے پنجاب و

ہندوستان کی ایک کانفرنس بلائے جس میں حالاتِ
حاضرہ سے واقف کار لوگ بطورِ مشیر کام کریں
تاکہ حضراتِ علما مسائلِ متنازعہ فیہ کے ہر پہلو
پر پوری بحث و تمحیص کے بعد نتائج پر پہنچیں۔
علما کی اس بحث میں مشیروں کو رائے دینے کا کوئی
حق نہ ہوگا اور فیصلہ کثرتِ آراء سے ہوگا۔
اختتامِ کانفرنس تک اسلامیہ کالج کا الحاق یونیورسٹی
سے قائم رہے۔ محرک مولوی ابراہیم سیالکوٹی۔

(۳) جمعیتِ علما کا اجلاس دہلی میں عنقریب ہونے والا
ہے۔ ان کے فتوے کا انتظار کیا جائے اور چند
حضرات انجمن کی طرف سے بطورِ وفد اس جلسے کے
بحث و مباحثہ میں شریک ہوں۔

محرک ڈاکٹر کچلو

اس طویل خط میں کئی امور زیرِ بحث آ گئے ہیں۔ ویسے یہ
ضروری بھی نہیں کہ ہم اس طویل خط کو مکمل طور پر یہاں نقل
کردیں، تاہم اس خط میں لکھا ہے کہ:

سولانا محمود حسن کے فتویٰ میں الحاق کے متعلق کوئی سوال
نہیں کیا گیا۔ اسی طرح مولوی اشرف علی صاحب تھانوی
کی خانقاہ کا فتویٰ یا مضمون ترکِ موالات کے مسئلے پر
ایک عام بحث ہے ــــ ایک دوست سے سنا کہ پروفیسر
حاکم علی صاحب اسلامیہ کالج نے اپنے فتوے کی تصدیق
میں مولوی احمد رضا صاحب بریلوی سے ایک فتویٰ حاصل
کیا ہے۔ پروفیسر خود بھی بریلی تشریف لے گئے تھے۔
لاہور آنے پر انھوں نے مولوی اصغر علی روحی سے استدعا

کی کہ وہ بھی مولوی احمد رضا صاحب کے فتوے پر دستخط کر دیں ۔ چونکہ حضراتِ دیو بند اور مولوی اشرف علی تھانوی صاحب پر اس فتوے میں سب و شتم کیا گیا تھا اس واسطے مولوی اشرف علی صاحب نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کردیا ۔

قومِ آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز

—— لیکن مسلمانانِ پنجاب سے میری التماس ہے کہ وہ اس کام کو توکل بخدا اپنے ذمے لیں اور لاہور یا باہر کے مسلمانوں میں سے کوئی اللہ کا بندہ اور نبی اُمّی کا عاشق ایسا نکلے کہ اس کانفرنس کا تمام خرچ اپنے ذمے لےلے —— اگر تمام حالات سننے کے بعد فقہائے اسلام کی یہی رائے ہو کہ الحاق قائم رکھا جائے تو میں بھی نہایت خوشی کے ساتھ اراکینِ انجمن کا ہم نوا ہوں ۔

محمد اقبال"

✡ ✡ ✡

۲۳

خضرِ راہ

حضرتِ علامہ نے اپنی مشہور نظم "خضر راہ" پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ع - ۱۹۱۸ع) کے بعد انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے منعقدہ اپریل ۱۹۲۲ع میں پڑھی تھی - برسوں کے بعد انجمن کا یہ جلسہ اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ کے صحن میں منعقد ہوا تھا - تمام صحن اور گیلری میں سامعین کا ہجوم تھا - سٹیج پر ایک قالین بچھا دیا گیا تھا اور تکیہ بھی رکھ دیا گیا تھا - علامہ جب وقتِ مقررہ پر جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو سامعین کے جوش اور جذبے کی عجیب کیفیت تھی - آپ کے ہمراہ سٹیج پر آپ کے عزیز دوست نواب سر ذوالفقار علی خان رئیسِ مالیر کوٹلہ اور خان بہادر سر عبدالقادر بھی آپ کے دائیں اور بائیں موجود تھے - علامہ نہایت معمولی لباس یعنی شلوار اور کوٹ میں ملبوس تھے اور سر پر لنگی مع کلاہ تھی - چونکہ ان دنوں آپ نقرس کے موذی مرض میں مبتلا تھے اور زیادہ دیر تک کھڑے نہیں رہ سکتے تھے اس لیے آپ کے لیے بیٹھ کر پڑھنے کا انتظام کیا گیا تھا -

مبصّرین لکھتے ہیں کہ یہ نظم دراصل دنیا کی موجودہ سیاست پر ایک تبصرہ ہے جس میں نہایت دل نشیں انداز میں سلطنت کی

حقیقت ، جمہوری نظام کی فسوں کاریاں اور قیصریت کے نظر فریب بہروپ دکھائے گئے ہیں ۔ مجالسِ آئین اور اصلاحات وغیرہ کی تمام شعبدہ بازیاں آپ نے بے نقاب کر دی ہیں ۔ مزدوروں کی کمر شکن محنت اور سرمایہ داروں کے غیر منصفانہ نظریات کی قلعی کھولی ہے ۔

علامہ کے نظم شروع کرنے سے پیشتر مسٹر محمد صدیق نے ، جو اے ۔ جی کے دفتر میں ملازم تھے ، ایک نعت نہایت دلکش ترنم سے پڑھی ۔ اس کے بعد آپ نے اپنی یہ نظم ، جو کتابی صورت میں بھی چھپ چکی تھی ، اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ پڑھنی شروع کی تو تمام مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا ۔ جب آپ نظم کے بند نہم پر پہنچے اور یہ اشعار پڑھے :

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

تو تمام اطراف سے آہ و بکا کا شور بلند ہوا ۔ خود علامہ بھی اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ کی ہچکی بندھ گئی ۔ آپ نے نظم پڑھنا بند کردی اور تقریباً نصف گھنٹے تک سکتے کا عالم طاری رہا ۔

اس کے بعد آپ نے پھر نظم اسی بند نہم سے پڑھنی شروع کی اور اس کے بعض اشعار کی توضیح بھی کی ۔ خصوصیت سے اس بند کے آخری شعر کی تشریح فرمائی جو یہ ہے :

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند
می نہ دانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

یہ نظم سننے کے لیے ہمارے دوست پروفیسر کشمیرا سنگھ، بھائی ویر سنگھ اور کاکا ہرنام سنگھ خاص طور پر امرتسر سے آئے تھے۔ چنانچہ ہم ''خضرِ راہ'' کے اس شعر پر دیر تک گفتگو کرتے رہے:

اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنّت میں گردِ سلسبیل

☆ ☆ ☆

۲۴

میاں سر فضل حسین

۱۹۳۱ء میں لندن کی گول میز کانفرنس کے موقع پر گاندھی جی مسلمانوں کے اتحاد سے سخت پریشان تھے ۔ وہ بار بار ڈاکٹر انصاری کو یاد کر رہے تھے اور انہیں بھی کانفرنس میں شریک کرنے پر مُصر تھے ۔ مطلب یہ تھا کہ حقوق کے معاملے میں جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کرنے والوں کے بالمقابل مخلوط انتخاب کے حامیوں کو سامنے لا کر مسلمانوں کے اتحاد میں رخنہ ڈالا جا سکے ۔ مگر ڈاکٹر انصاری کو چونکہ اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی اس لیے گاندھی جی کو اپنی کامیابی مشکوک نظر آ رہی تھی ۔

جب کانفرنس آئین کے وفاقی حصے پر بحث کرنے کے لیے آمادہ ہوگئی تو مسلمان نمایندوں نے مطالبہ کیا کہ جب تک وفاقی اداروں میں مسلمانوں کا حصہ متعین نہ ہو جائے ہم وفاق کی بحث میں حصہ نہیں لیں گے ۔ لیکن جب بعض نمائندے مثلاً چودھری ظفر اللہ خاں وغیرہ مسلمان نمایندوں کے اس مطالبے کو پس پشت ڈال کر بحث میں شمولیت پر تیار ہوگئے تو علامہ اقبال اور مولوی شفیع داؤدی نے کانفرنس میں شرکت نہیں کی اور انگلستان سے واپس روانہ ہوگئے ۔ مولانا سالک لکھتے ہیں کہ غالباً روم پہنچ کر مہر صاحب نے ، جو

اس سفر میں علامہ کے ہمراہ تھے ، ایک تار دیا تھا جس کے الفاظ یہ تھے کہ مولوی داؤدی نے بطور احتجاج گول میز کانفرنس سے استعفا دے دیا ہے اور ڈاکٹر اقبال کے ساتھ وطن واپس آ رہے ہیں ۔

سالک صاحب لکھتے ہیں : ''ایک دن لاہور میں ملک فیروز خاں نون نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ آپ سے میاں فضل حسین آج رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان دہلی سے ٹیلیفون پر بات کریں گے ۔ آپ فون پر موجود رہیے ۔ چنانچہ میاں صاحب کا فون آیا اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ ''سالک صاحب ! کیا خیال ہے آپ کا ؟ آپ کے دوست ڈاکٹر اقبال احمق ہیں یا نہیں ؟'' میں نے کہا ''آپ دونوں برابر کے دوست ہیں ، ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔ میں آپ دونوں سے چھوٹا ہوں ۔ آپ میری تائید کیوں چاہتے ہیں ؟'' کہنے لگے ''میں تو یہاں حکومتِ ہند میں اقبال کی قابلیت اور علمیت کا سکہ جمانے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ انھیں کوئی اچھی اسامی مل جائے مگر اقبال ہمیشہ خلافِ توقع کوئی نہ کوئی حرکت ایسی کر بیٹھتے ہیں جس سے سارا کیا دھرا خاک میں مل جاتا ہے ۔ اب دیکھیے انھوں نے کانفرنس سے استعفا دے دیا ہے ۔ بھلا اس تیزی کی کیا ضرورت تھی ۔ دوسرے ممبر بھی تو ہیں ۔ جب انھوں نے استعفا دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تو اقبال کو کیا پڑی تھی کہ استعفا دے کر نکّو بنتے ۔'' میں نے عرض کیا کہ تار کے الفاظ ایسے ہیں کہ استعفا کا لفظ صرف مولوی شفیع داؤدی کے نام کے ساتھ ہے ۔ ڈاکٹر اقبال کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ واپس آ رہے ہیں ۔ میاں صاحب ہنس کر کہنے لگے کہ یہ اخبار نویسوں کا سا غچّا تو آپ کسی اور کو دیجیے ۔ حکومتِ ہند کے ذرائع اطلاعات اخبار نویسوں کے وسائل سے زیادہ معتبر ہیں ۔ ہمیں اطلاع مل چکی ہے کہ اقبال نے استعفا

دے دیا ہے۔ میرے نزدیک انھوں نے سخت نادانی کی ہے۔"

اصل بات یہ تھی کہ میاں صاحب ہمیں ڈاکٹر صاحب کا نیازمند سمجھتے تھے اور ہمیشہ ان کے متعلق اپنے طرزِ عمل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ان کی فروگزاشتیں ہم سے بیان کیا کرتے تھے تاکہ ہم یہ سمجھ لیں کہ میاں صاحب تو ڈاکٹر صاحب کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب ہی انھیں موقع نہیں دیتے لہٰذا قصور ڈاکٹر صاحب کا ہے۔ بہرحال میں نے "انقلاب" میں لکھا کہ "ابھی یہ معاملہ صاف نہیں ہوا کہ علامہ اقبال نے بھی کانفرنس سے استعفا دے دیا ہے یا نہیں، لیکن اگر یہ خبر درست ہے تو ڈاکٹر صاحب نے بالکل وہی کیا ہے جس کی ان سے بحیثیت نمایندۂ مسلمانانِ ہند توقع کی جا سکتی تھی۔ اور جن لوگوں نے وفاق میں مسلمانوں کے موقف کا کوئی فیصلہ کرائے بغیر کانفرنس سے تعاون کا ارادہ کیا ہے وہ غلطی پر ہیں۔ وہ مسلمانوں کی نمایندگی کا حق ادا نہیں کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب جب وطن واپس پہنچ گئے تو کچھ دنوں کے بعد میاں فضل حسین بھی دہلی سے لاہور آ گئے۔ ایک شام ڈاکٹر صاحب اور مہر صاحب ان سے ملنے کے لیے گئے۔ سالک بیان کرتے ہیں کہ دونوں دوستوں میں مزے مزے کی چوٹیں ہوتی رہیں اور ملکی سیاست پر گفتگو بھی جاری رہی۔ اسی دوران میں میاں صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا "کیوں بھئی اقبال! تمھاری بیوی پردہ کرتی ہے؟" انھوں نے جواب دیا کہ ہاں پردہ کرتی ہے جیسے تمھاری بیوی کرتی ہے۔ میاں صاحب نے یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ ان دنوں ایک ایسے ممتاز آدمی کی تلاش تھی جسے جنوبی افریکہ میں گورنر جنرل ہند کا ایجنٹ بنا کر بھیجا جا سکے، اور اس

کی بیوی پردہ نہ کرتی ہو تاکہ موجودہ رسوم کے مطابق میزبان کے فرائض انجام دے سکے - میں نے فوراً بھانپ لیا اور میاں صاحب سے کہا کہ آپ یہ سوال اس لیے کر رہے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو جنوبی افریکہ بھیجنا چاہتے ہیں ؟ کہنے لگے آپ کی تیز فہمی کی داد دینی پڑتی ہے - میرے ذہن میں واقعۃً یہی بات تھی - ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ میں اب تک تین بیویاں کر چکا ہوں جو پردہ کرتی ہیں - آپ کے خیال میں اب ایک چوتھی بھی کر لی جائے جو پردہ نہ کرتی ہو - گویا تین بیویاں تو پرائیویٹ ہیں ، اب ایک پبلک بیوی بھی ہو جائے - اس پر بہت زوردار قہقہہ لگا - اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میری تجویز مانو تو بیگم شاہ نواز کو ایجنٹ بنا کر بھیج دو ، کیونکہ ان کی سیاسی خدمات بہت قابل قدر ہیں ، اور میاں شاہ نواز کو ان کے ساتھ بطور رفیقِ حیات بھیج دو - بہرحال میاں صاحب کی یہ تجویز لطیفے کی حد تک ہی رہی اور کچھ عرصے کے بعد سیّد رضا علی اس عہدے پر مامور کر کے بھیج دیے گئے - انھیں میزبانی کے لیے جنوبی افریکہ ہی کی ایک خاتون سے شادی کرنی پڑی جن کا نام مس کیمبر تھا -

☆ ☆ ☆

۲۵

علامہ سیّد انور شاہ

(بحث زمان و مکان)

علامہ اقبال کی محفل میں جب کبھی علوم اسلامی کا ذکر آتا تو اکثر علمائے وقت کے علمی کارناموں پر بھی تبصرہ ہوتا ۔ چنانچہ آپ کے سامنے اکثر حضرت سید انور شاہ صاحب کا ذکر بھی ہوتا کہ آپ بڑے پائے کے عالم دین ہیں اور علوم دین کے امام زمانہ ہیں ۔ اکثر آپ کے تلامذۂ دیوبند کے ساتھ بھی اسی طرح کا ذکر ہوتا جو علامہ اقبال کے دل میں آن سے بالمشافہ ملاقات کا ولولہ پیدا کر دیتا ۔ سید صاحب دیوبند کے مدرسۂ قاسم العلوم میں مدرس اوّل کے عہدے پر فائز تھے اور علامہ چاہتے تھے کہ آپ سے کسی وقت بالمشافہ مسائل حاضرہ پر گفتگو ہو ۔

راقم کا قیام لدھیانہ میں جنوری ۱۹۱۵ء سے لے کر مئی ۱۹۲۳ء تک رہا ۔ اس عرصے میں وہاں اکثر طلبا اور علمائے دیوبند سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی ۔ اس سلسلے میں مفتی محمد نعیم صاحب اور مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی خاص طور پر قابل بیان ہیں جن کی معرفت ۱۹۱۶ء میں چند علمائے دیوبند سے ملاقات ہوئی ۔ یہ علما دیوبند سے لیدھیانہ تشریف لائے تھے جن میں مولانا حافظ محمد احمد مہتمم مدرسۂ

دیوبند بھی تھے جو مولانا محمد قاسم نانوتوی کے صاحبزادے تھے ۔ ان کی آنکھوں میں موتیا آتر آیا تھا اور وہ علاج کے لیے براستہ لدھیانہ موگا ضلع فیروز پور جانا چاہتے تھے ۔ ان کے ہمراہ مولانا سید انور شاہ صاحب اور مولوی حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب بھی تھے ۔ انھوں نے مولانا حافظ محمد احمد صاحب کو موگا لے جا کر آپ کی آنکھوں کا آپریشن کروایا جو بہت کامیاب رہا ۔

مَیں ۱۹۲۸ء میں حیدرآباد دکن میں تھا جہاں حافظ محمد احمد صاحب، بھی مقیم تھے ۔ وہیں آپ کا انتقال ۱۸- اکتوبر ۱۹۲۸ء کو ہوا تھا اور میں نے یہ خبر روزنامہ "رہبر دکن" میں پڑھی تھی ۔ آپ کے لیے حضورِ نظام عثمان علی خاں نے ایک خاص فرمان جاری کیا تھا کہ آپ کو قبرستان "خطۂ صالحین" میں دفن کیا جائے ۔

غرض کہ علمائے دیوبند سے میری یہ ملاقات ایک سعادت کا درجہ رکھتی تھی ۔ میں جب ۱۹۱۶ء کا وہ زمانہ یاد کرتا ہوں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں ۔ بطورِ خاص متذکرہ بالا علمائے لدھیانہ کا بے حد شکر گزار ہوں جن کی معرفت ان سے ملاقات ہو گئی ۔

میں نے ۱۹۱۶ء کی اس ملاقات میں پہلی بار سید انور شاہ صاحب کو دیکھا تھا ۔ آپ کا لباس — چکن کا بڑا کرتہ ، شرعی پاجامہ اور سر پر عمامہ — دیکھ کر ان کی شرافت کا اندازہ ہوتا تھا ۔ لدھیانہ میں مولوی محمد زکریا والدِ مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو بھی میں نے دیکھا تھا ۔ یہ حضرات ۱۹۲۴ء میں علامہ اقبال کی زوجہ کی فاتحہ خوانی کی غرض سے آئے تھے جو ۲۳ مئی ۱۹۲۴ء کو فوت ہوئی تھیں ۔

اس کے بعد حضرت سید انور شاہ صاحب اعلی اللہ مقامہ کو میں نے جمعیۃ العلما کے جلسۂ ۱۹۲۱ء کے موقعے پر لاہور میں دیکھا

اور ان سے ملاقات بھی ہوئی ۔ اس جلسے کا اعلان روزنامہ "زمیندار" میں اس طرح ہوا تھا :

"جمعیۃ العلمائے ہند کا تیسرا سالانہ جلسہ
بصدارت حضرت ابوالکلام صاحب آزاد
۱۸ ، ۱۹ اور ۲۰ نومبر ۱۹۲۱ء
کو لاہور میں بریڈلا ہال میں ہوگا

جلسہ تین دن ہوگا ۔ داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہوگا ۔ ارکانِ جمعیۃ العلمائے ہند ، حضراتِ قارئین ، معزز مندوبین ، علمائے کرام ، سجادہ نشینان اور اکابرِ ملک و ملت کا قیام ، طعام اور داخلۂ جلسہ بلا قیمت ہوگا ۔ علاوہ ازیں شریک ہونے والے حضرات ۳۰ نومبر تک ہمیں اطلاع دیں ۔
عبدالقادر قصوری ، صدر مجلس استقبالیہ"
(زمیندار ، ۴ نومبر ۱۹۲۱ء)

ہندوستان کی تاریخ میں یہ زمانہ بڑے ابتلا کا زمانہ تھا ۔ پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ۱۹۱۴ء میں ہوا جو اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی ۔ اس جنگ نے سیاسی ماحول میں ایک انقلابِ عظیم برپا کر دیا تھا ۔ اس کے فوراً بعد جلیاں والا باغ امرتسر میں ہزارہا بے گناہ لوگوں پر گولی کا چلنا ، رولٹ ایکٹ کی مخالفت اور عدمِ تعاون کی تحریک کے فروغ سے ہر طرف ایک طلاطم نظر آتا تھا ۔ اس سے ہر ذی شعور انسان ، جو سیاسیاتِ ملکی سے دلچسپی رکھتا تھا اور اپنے ملک سے محبت کرتا تھا ، نہایت بے چین تھا ۔ ہر طرف ملک میں آزادی کے نعرے لگ رہے تھے ۔ یہی زمانہ تھا کہ یہ 'کل ہند اجتماع لاہور میں (۱۹۲۱ء میں) تجویز کیا گیا جس کے روحِ رواں دراصل قبلہ مولوی عبدالقادر قصوری تھے ۔

شاہ صاحب سے علامہ کی پہلی ملاقات :

جیسے کہ ذکر ہوا ، اس جلسے میں داخلہ بذریعۂ دعوت نامہ تھا ۔ چونکہ ہجوم بے حد تھا لہٰذا تمام علما اور مندوبین بریڈلا ہال کے عقب والے دروازے سے داخل ہو رہے تھے ۔ میں اور علامہ اقبال بالکل ساتھ ساتھ تھے ۔ جب ہم ہال میں داخل ہو رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ قبلہ سید انور شاہ صاحب بھی ہمارے دوش بدوش ہیں ۔ میں نے فوراً حضرتِ علامہ سے اشارۃً عرض کیا کہ آپ سید انور شاہ صاحب ہیں ۔ چنانچہ دونوں حضرات ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے کیونکہ یہ ان کی پہلی بالمشافہ ملاقات تھی ۔ اسی وقت جلسے کے بعد ملنے کا پروگرام چند الفاظ میں طے ہوگیا ۔

اس کے بعد مولانا سید انور شاہ صاحب سے اکثر علامہ کی ملاقات رہی ۔ کبھی اپنے مکان پر اور کبھی دوسرے مقامات پر جہاں لاہور کے قیام کے دوران میں شاہ صاحب ٹھہرے ہوئے تھے ، بلکہ خط وکتابت بھی ہوتی رہی ۔

اس زمانے میں لاہور میں مولانا احمد علی مرحوم کے ادارۂ خدام الدین نے خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی ۔ علما کے ایسے ایسے شاندار اجتماع ہوئے کہ لاہور کی تاریخ میں ان کی کوئی مثال نہیں مل سکتی ۔ ان اجتماعات میں عموماً لاہور کے رؤسا بھی شرکت کرتے تھے ۔ مثال کے طور پر سر میاں محمد شفیع ، سر عبدالقادر اور دیگر حضرات شامل ہو کر مستفید ہوتے تھے اور علامہ اقبال بھی تشریف لاتے تھے ۔ اسی ادارے کے تحت ایک ایسا ہی شاندار جلسہ مارچ ۱۹۲۵ع میں ہوا تھا جس میں علمائے دیوبند تشریف لائے تھے ۔ جب میں نے علامہ سے ان اہلِ علم حضرات کی تشریف آوری کا ذکر کیا تو آپ نے فوراً علی بخش سے قلم دان

طلب کر کے ایک خط حضرت سید انور شاہ صاحب کو لکھا جسے میں ذیل میں درج کرتا ہوں :

"مخدوم و مکرم حضرت قبلہ مولانا صاحب !

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ ۔ مجھے ماسٹر عبداللہ صاحب سے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ انجمن خدام الدین کے جلسے میں تشریف لائے ہیں اور ایک دو روز قیام فرمائیں گے ۔ میں اسے اپنی بڑی سعادت تصور کروں گا اگر آپ کل شام اپنے دیرینہ مخلص کے ہاں کھانا کھائیں ۔ جناب کی وساطت سے حضرت مولوی حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ عثمانی ، مولوی بشیر احمد صاحب اور جناب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھی یہی التماس ہے ۔ مجھے امید ہے کہ جناب اس عریضے کو شرفِ قبولیت بخشیں گے ۔ آپ کو قیام گاہ سے لانے کے لیے سواری یہاں سے بھیج دی جائے گی ۔

لاہور ، ۱۲ مارچ ۱۹۲۵ء مخلص محمد اقبال"[۱]

اس کا جواب قبلہ شاہ صاحب نے فوراً اسی خط کی پشت پر فارسی زبان میں ، ذیل کے الفاظ میں دیا :

"جناب مستطاب دام عزہ !

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ ۔ احقر و دیگر حضرات ہمگی ارشاد جنابِ سامی قبول کردند ۔ والسلام

احقر محمد انور عفی اللہ عنہ"

اس دعوت کے موقع پر خدام الدین کے مولانا احمد علی صاحب ،

۱۔ اقبال نامہ ، حصہ دوم ، لاہور ۱۹۵۱ء ، ص ۲۵۷ ۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی صاحب اور دیگر علمائے دیوبند بھی موجود تھے ۔ یہ محفلِ طعام بہت ہی دلچسپ اور پُر از معلومات تھی ۔ خاص کر مسئلۂ سود پر گفتگو زیادہ مفصّل ہوئی ۔ اس سے جب فارغ ہوئے تو مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب نے علامہ اقبال سے دریافت فرمایا کہ ایک تبصرہ عنایت اللہ مشرقی کی کتاب ''تذکرہ'' پر ''زمیندار'' اخبار میں پڑھا تھا ، وہ کس نے لکھا تھا؟ اس پر علامہ اقبال نے حاضرین میں سے اپنے دوست چودھری محمد حسین کی طرف اشارہ کیا کہ انہوں نے لکھا تھا ۔ چنانچہ انہوں نے انہیں خوب داد دی ۔

انجمن خدام الدین کے مذکورہ جلسے کے موقع پر ایک روز صبح کے وقت حضرت سیّد انور شاہ صاحب مرحوم نے درسِ حدیث بھی دیا تھا جس میں ہزارہا علما اور دوسرے حضرات بطور تبّرک شامل ہوئے تھے ۔ اکثر شرکائے درس کا یہ خیال تھا کہ ان کو زندگی بھر فخرر ہے گا کہ وہ حضرت کے درسِ حدیث میں شامل ہوئے تھے ۔ چنانچہ علامہ نے بھی حسبِ پروگرام صبح کی نماز کے بعد بخاری شریف کی پہلی حدیث ''انما الاعمال بالنّیات'' پر تقریر فرمائی اور مقامِ حدیث کے متعلق چند ایسے قیمتی نکات ارشاد فرمائے جو عوام کے لیے بالکل نئے تھے ۔ آپ کے اس خطبے میں عظمتِ حدیث ، صداقتِ حدیث اور ضرورتِ حدیث کو بوضاحت بیان کیا گیا تھا ۔ یہ مجلس تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہی تھی ۔ اس بابرکت محفل کی اب تک لوگوں کے دلوں میں یاد تازہ ہے ۔

۱۹۲۸ء میں آل انڈیا اوریئنٹل کانفرنس کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا تو علامہ اقبال نے شعبۂ عربی و فارسی کی صدارت فرمائی اور رسم کے مطابق آپ نے ایک صدارتی خطبہ بھی انگریزی میں پڑھا ۔

بعد ازاں سنہ ۱۹۲۹ء میں یہ خطبہ حیدرآباد دکن کے مجلہ ''اسلامک کلچر'' میں چھپ گیا اور اس کا ایک اردو ترجمہ مسٹر محمد داؤد رہبر نے ''اوریئنٹل کالج میگزین'' کے اگست ۱۹۴۷ء کے شمارے میں شائع کیا۔ علامہ کا یہ خطبہ بہت اہم تھا۔ آپ نے بڑی مشکل سے اس جلسے کی صدارت قبول فرما کر خطبہ دینا منظور فرمایا تھا۔ اس خطبے کی تیاری میں کسی قدر راقم کا حصہ بھی تھا کہ بعض مسائل کے ضمن میں کچھ حضرات، مثلاً ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور علامہ سیّد انور شاہ صاحب دیوبندی سے خط و کتابت کر کے بعض استفسارات کیے تھے۔ اس خطبے کے بعد دسمبر و جنوری ۲۹-۱۹۲۸ء میں علامہ کو لیکچر دینے کی غرض سے سیٹھ جمال محمد کی دعوت پر مدراس جانا تھا۔ چنانچہ ''خطباتِ مدراس'' میں بھی متذکرہ بالا علمی امور کا ذکر موجود ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس خطبے کی تیاری میں خاص طور پر احتیاط برتی گئی تھی۔ خطبۂ اوریئنٹل کانفرنس لاہور میں بھی آپ نے حدیث ''لا تسبّوالدھر ــــ'' پر بحث کی ہے اور اس حدیث کا ذکر مدراس کے اس خطبے میں بھی کیا گیا ہے جو ''زمان و مکان'' کے موضوع پر دیا گیا تھا۔ یہ موضوع آپ کی زندگی میں مرکزی حیثیت کا حامل رہا ہے۔

علامہ کو مسئلۂ زمان و مکان سے کس قدر دلچسپی تھی؟ اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوگا جو اس ضمن میں مسٹر داؤد رہبر مترجمِ خطبۂ اوریئنٹل کانفرنس بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ۱۹۳۸ء میں مارچ کی پہلی یا دوسری تاریخ کو اقبال کے دوست چودھری محمد حسین مجھے علامہ کے گھر لے گئے اور مرحوم نے مجھ سے زمان و مکان کے اسلامی تصوّر کے متعلق سوال پوچھے۔ ان دنوں

چونکہ اُن کا گلا خراب تھا اس لیے لکھ کر یہ سوالات کیے گئے تھے۔ اس ضمن میں میرے جوابات کو اُنھوں نے پسند فرمایا اور خواہش کی کہ میں روزانہ اُن کے ہاں حاضر ہوا کروں، مگر میں نے مجبوری ظاہر کی کیونکہ ۳ مارچ سے رمضان شریف شروع ہو رہا تھا۔ اس پر اُنھوں نے فرمایا کہ رمضان کے بعد تمیں ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوا کروں۔ مگر ماہِ رمضان کے بعد ان کی صحت زیادہ بگڑ گئی اور ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اُن کا انتقال ہوگیا۔ غرض کہ علامہ مرحوم ۱۹۳۸ء میں اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی مسئلۂ زمان و مکان کی تحقیق (اسلامی نقطۂ نگاہ سے) میں مشغول تھے۔

اس خطبے میں مشہور ایرانی صوفی عراقی کے جس فارسی رسالے ''غایۃ الامکان فی درایۃ المکان'' کا ذکر ہے، یہ دراصل راقم نے ہی قبلہ سیّد انور شاہ صاحب اعلی اللہ مقامہ' سے خط و کتابت کے ذریعے حاصل کر کے علامہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ ۱۹۲۸ء کا زمانہ اس وجہ سے بھی زیادہ اہم نظر آتا ہے کیونکہ اسی زمانے میں جرمنی کے ایک مفکّر شپینگلر نے ایک کتاب Decline of the West (''مغرب کا تنزّل'' یا ''انحطاطِ مغرب'') تصنیف کی تھی جس کا انگریزی ترجمہ فوراً علامہ اقبال نے خرید کر اس کا مطالعہ کیا۔ اس کتاب نے لوگوں کے ذہنوں کو اس وجہ سے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا کیونکہ اس میں بعض فلسفیانہ مسائل کو نہایت انوکھے اور بالکل نئے انداز سے پیش کیا گیا تھا۔

علامہ نے خود بھی مذکورہ خطبے میں مختصر طور پر اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''پھر مسلمانوں کی سائنس کے تصوّرات سے ہماری ناواقفیت بعض مرتبہ ثقافتِ جدید کے باب میں ہمیں غلط طرزِ خیال

کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال میں شپنگلر کی
نہایت فاضلانہ تصنیف ''انحطاطِ مغرب'' میں پاتا ہوں
جس میں اس نے ثقافتوں کی آفرینش اور نشو و نما کے
بارے میں ایک نیا نظریہ مرتب کیا ہے۔ کلاسیکی عربی
اور جدید ثقافتوں میں عدد کا جو تصور ہے اس پر بحث
کرتے ہوئے اور مقدار کے یونانی تصور اور عربوں
کے ہاں عدد کی غیر سغنیت کے درمیان فرق دکھاتے ہوئے
اس کی تائید میں وہ کہتا ہے۔۔۔۔''

اس کے بعد علامہ نے شپنگلر کی کتاب سے ایک اقتباس بھی
پیش کیا ہے جس کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں۔ بقول اقبال اس
اقتباس کے آخری تین فقرے دراصل سنگِ بنیاد ہیں جن پر شپینگلر
کے نظریے کی بلند عمارت زیادہ تر قائم ہے۔ اس ضمن میں علامہ
نے یہ تجویز کیا تھا کہ اس مسئلے کے ضمن میں البیرونی سے استفادہ
کیا جائے۔ چنانچہ ان کے مشورے سے میں نے ڈاکٹر ضیاء الدین
مرحوم کو علی گڑھ لکھا۔ حالانکہ آپ اس زمانے میں یونیورسٹی
سے زیادہ وابستہ نہیں تھے مگر پھر بھی محض علامہ کی وجہ سے
فوراً انگریزی زبان کے ایک دلچسپ خط کی صورت میں جواب دیا
جس کا ماحصل یہ ہے:

''البیرونی کی کتاب 'قانونِ مسعودی' سے مثلثیات کے
تفاعلوں کے درمیانی زاویوں کے درجے معلوم کرنے کے
لیے نیوٹن نے ضابطۂ ادراج (یعنی ایک درجے کا ساٹھواں
حصہ) کا استعمال کیا ہے اور اپنے خط میں کوٹنگٹن
یونیورسٹی کے استادِ فلکیات شوارنش کی توجہ اس عبارت
کی طرف دلائی ہے۔''

غرضکہ اس مختصر خطبے میں شپینگلر کے نظریے پر بحث کرنا اور یہ دکھانا کہ اس کی فروگزاشت اس کے تاریخی نقطۂ نگاہ پر کس اہم حد تک اثر انداز ہے ، شپینگلر کے اس دعوے کی تکذیب کرتا ہے کہ ثقافتیں بہ حیثیت نامیاتی عمارتوں کے ایک دوسری سے قطعاً بیگانہ ہوتی ہیں ۔ اقبال لکھتے ہیں :

''بیکن کے جدید ریاضیات کے اہم ترین تصورات میں سے ایک تصور کی طرف اوپر جو اشارہ ہوا ، وہ مجھے عراقی کی تصنیف ''غایۃ الامکان فی درایۃ المکان'' کی یاد دلاتا ہے ۔ مشہور حدیث ''لا تسبّو الدھر ان الدھر ھواللہ'' میں Time کا جو لفظ آیا ہے ، اس کے متعلق مولوی سید انور شاہ صاحب سے ، جو اسلامی دنیا کے فاضل ترین علمائے حدیث میں سے ہیں ، میری خط و کتابت ہوئی ۔ اس مراسلت کے دوران میں مولوی صاحب موصوف نے مذکورہ کتاب کے ایک مخطوطے کی طرف اشارہ کیا اور بعد میں میری درخواست پر بڑی عنایت سے مجھے اس کی ایک نقل ارسال فرما دی ۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس قابل قدر تحریر کے شاملات کا حال آپ کو بتاؤں ۔ کچھ اس لیے کہ یہ شپینگلر کے نظریے سے غیر مطمئن ہونے کی مزید دلیل بہم پہنچائے گا اور زیادہ تر اس لیے کہ مشرقی تحقیق کے اس پہلو کی ضرورت آپ کے ذہن نشیں کروں کہ اسلامی دنیا میں خاص خاص علوم کے تصورات کس طرح پر مرتّب ہوئے ۔ علاوہ ازیں اغلب ہے کہ یہ نہایت قابلِ قدر مخطوطہ چھان بین کا ایک نیا میدان کھولنے میں ہمارے ان تصوراتِ زمان و مکان کے اصل و آغاز کی تحقیق ہو جن کی اہمیت

حال ہی میں جدید طبیعیات نے محسوس کی ہے ۔''

اس اہم خطبے کے آخری حصے میں بحثِ زمان و مکان کے ضمن میں ایک یورپی مصنف پروفیسر الیگزنڈر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

'' . . . اس طرح اس کے سامنے فکر کی ایک ایسی راہ کھل جاتی جو اس کے صوفیانہ نقطۂ نظر کے لیے زیادہ سازگار ہوتی ۔ پھر حقیقتِ مطلقہ کی ذات میں فوق المکان ''یہاں'' اور فوق الدوام ''اب'' کے باہمی نفوذ کا تصور ہمیں ''مکان و زمان'' کے جدید تصور کا خیال دلاتا ہے جسے پروفیسر الیگزنڈر نے ''مکان و زمان اور الوہیت'' پر مقالہ لکھتے ہوئے تمام موجودات کی کوکھ قرار دیا ہے ۔ زمان کی ماہیت پر اگر عراقی کو ذرا زیادہ تیز نگاہ نصیب ہوتی تو وہ اس خیال تک پہنچ جاتا کہ زمان ، مکان کی نسبت زیادہ بنیادی ہے اور یہ کہتا (جیسا کہ پروفیسر الیگزنڈر نے واقعی کہہ دیا ہے) کہ ''زمان مکان کا ذہن ہے'' محض بطور استعارہ نہیں ۔ عراقی نے کائنات کے ساتھ خدا کا تعلق روح اور جسم کے تعلق کے مماثل تصور کیا ہے ۔''

جیسا کہ اوپر کی سطور میں واضح کر دیا گیا ہے ، علامہ مرحوم کو اخیر دم تک اسلامی نقطۂ نگاہ سے زمان و مکان کی بحث سے شغف رہا ۔ یہ امر بھی خالی از دلچسپی نہیں ہوگا کہ آپ نے ایک طویل خط ۱۸ اگست ۱۹۳۳ع کو حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی مرحوم کے نام لکھا ہے جس میں کئی امور پر گفتگو کی گئی ہے ۔ ان میں سے قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے نظریاتِ زمان و مکان کے متعلق اپنی ایک

تقریر کے ضمن میں استفادہ کیا ہے ۔ چنانچہ آپ خط کے اخیر میں لکھتے ہیں :

" . . . حضرات صوفیا میں سے اگر کسی اور بزرگ نے بھی حقیقت زمان پر بحث کی ہو تو آن بزرگ کے ارشادات کے نشان بھی مطلوب ہیں ۔ مولوی سید انور شاہ مرحوم و مغفور نے مجھے عراق کا ایک رسالہ مرحمت فرمایا تھا ۔ اس کا نام تھا "فی درایتہ الزمان ۔" جناب کو ضرور اس کا علم ہوگا ۔ میں نے یہ رسالہ دیکھا ہے مگر چونکہ یہ رسالہ بہت مختصر ہے اس واسطے مزید روشنی کی ضرورت ہے . . . ۔"
(اقبال نامہ ، حصہ اوّل ، ۴۴۳ - ۴۴۴)

☆ ☆ ☆

۲۶

علامہ کی موٹر

علامہ اقبال جب انارکلی والے مکان میں رہتے تھے، اُس زمانے میں سواری کے لیے آپ کے پاس گھوڑا گاڑی (گگ) کا انتظام تھا ۔ اُس وقت بیرسٹر کے علاوہ آپ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر بھی تھے۔ پھر جب آپ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں تشریف لے آئے تو آپ نے ایک سیکنڈ ہینڈ فرنچ گاڑی کا انتظام کیا جس کے آگے ایک سلور کا کلنگ بھی لگا ہوا تھا ۔ اس گاڑی کی خرید کا انتظام میرے خیال میں یہاں آنے سے پیشتر ہوگیا تھا ـــــ ایک بار جب ان کے ایک عزیز لدھیانہ والے ڈاکٹر غلام محمد ، لاہور آئے ہوئے تھے تو انھوں نے ایک روز مجھے ہمراہ لیا اور والٹر لاک کمپنی مال روڈ پر گئے ۔ وہاں سید افضال علی حسنی رئیسِ لاہور بھی آ گئے تھے اور ڈاکٹر غلام محمد کے ہمراہ مستری عبداللہ بھی تھے جو اکثر ڈاکٹر غلام محمد کو اُن کی موٹر کے ضمن میں صلاح و مشورہ دیا کرتے تھے ۔ کمپنی والوں نے شاہ صاحب کے آنے پر مذکورہ سیکنڈ ہینڈ موٹر نکالی اور اس میں پٹرول ڈالا گیا ۔ موٹر کو برائے آزمائش سڑک پر لا کر ہمیں اس میں بٹھا دیا گیا اور ہم سیدھے لاہور چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گئے ۔ ہم سب نے اور خاص کر ڈاکٹر غلام محمد نے اس موٹر کو پسند کیا ۔ منشی

طاہرالدین بھی ہمراہ تھے ۔ چنانچہ وہ موٹر سید افضال علی حسنی کے مشورے اور مستری عبداللہ کے پسند کرنے پر دسمبر ۱۹۲۲ء میں خرید لی گئی ۔ میرے خیال میں یہی موٹر علامہ کے ہاں ہمیشہ رہی کیونکہ ہم نے اس گاڑی کو میکلوڈ روڈ پر ان کی کوٹھی کے نیچے والے حصے میں اخیر تک دیکھا ۔ اس موٹر نے انتخابِ کونسل کے زمانے میں بہت ساتھ دیا ۔ اس کا پہلا ڈرائیور ایک شخص علم الدین تھا جو پہلے باغبان پورہ کے میاں خاندان کے ہاں بھی رہ چکا تھا ۔ اس کے بعد ایک اور شخص رحما ڈرائیور کی حیثیت سے آیا جو غالباً اخیر تک علامہ کی خدمت میں رہا ۔

☆ ☆ ☆

۲۷

پیامِ مشرق

۱۹۲۲ء میں ، جب علامہ اقبال انارکلی والے مکان میں رہائش رکھتے تھے ، انھوں نے جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے ''مغربی دیوان'' کے جواب میں اپنی کتاب ''پیامِ مشرق'' شائع کی ۔ جب یہ کتاب چھپ گئی تو چودھری محمد حسین مرحوم نے اس پر رسالہ ''ہزار داستان'' لاہور کے فروری ۱۹۲۳ء کے پرچے میں ایک مبسوط تبصرہ لکھا ۔ ''ہزار داستان'' کے مذکورہ شمارے کے شروع میں علامہ کی ایک تصویر بھی شائع ہوئی تھی اور ایک پورے صفحے پر ''پیامِ مشرق'' کی ایک رباعی بھی ''خود نگرے'' کے عنوان سے طبع ہوئی تھی ۔ اس کے بعد چودھری محمد حسین کا مذکورہ تبصرہ صفحہ ۴ سے شروع ہوا جو صفحہ ۱۵ پر ختم ہوا ۔ اس رسالے کے مدیر نے بھی علامہ پر ایک نوٹ سپردِ قلم کیا تھا ۔

۱۹۲۲ء میں ، جب علامہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں آ گئے تھے ، تو انھوں نے مجھے ''پیامِ مشرق'' کے تین نسخے دیے تھے ۔ ایک نسخہ ڈاکٹر نکلسن کے لیے تھا جو میں نے انھیں کیمبرج بھیج دیا ۔ دوسرا مولانا سید انور شاہ صاحب کے لیے تھا جو میں نے دیوبند کے پتے پر ان کی خدمت میں ارسال کردیا اور تیسرا نسخہ علامہ

نے مجھے عنایت فرمایا تھا جو میں نے اپنے پاس رکھ لیا۔

ڈاکٹر نکلسن نے جب ''پیامِ مشرق'' کا مطالعہ کر لیا تو انھوں نے اس پر ایک عالمانہ تبصرہ انگریزی زبان میں لکھا جو رسالہ ''اسلامیکا'' لپزگ (جرمنی) کے اول نمبر میں ۱۹۲۵ء میں شائع ہیں۔ اس تبصرے کا اردو ترجمہ میں نے علامہ کی موجودگی میں اور ان کے مشورے سے کیا تھا جو ''نیرنگ خیال'' میں شائع ہوا۔ اس پر جو حواشی لکھے گئے ہیں ان کی تیاری میں بھی علامہ نے میری مدد فرمائی تھی۔ یہی ترجمہ ۱۹۲۳ء میں ''نیرنگ خیال'' کے سالنامے (صفحہ ۱۰۳ — ۱۰۷) میں چھپا اور پھر ماہنامہ ''پیغامِ حق'' کے اقبال نمبر میں فروری ۱۹۴۶ء میں طبع ہوا (صفحہ ۱۸۰ - ۱۹۵)۔

مولانا سید انور شاہ صاحب مرحوم نے نکلسن کے اس تبصرے کے جواب میں عربی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ''عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسی علیہ السلام'' تھا اور یہ کتاب انھوں نے علامہ کو بھی ارسال فرمائی تھی۔ اس پر یہ عبارت درج تھی:

''بعالی خدمت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب دام ظلہ۔''

۱۹۲۳ء میں جامعۂ ملیہ کے تین پروفیسر ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر حبیب الرحمٰن اور پروفیسر غلام السیدین کشمیر جاتے ہوئے لاہور سے گزرے تو بطور خاص علامہ اقبال کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ انھوں نے ''پیامِ مشرق'' کا ۱۹۲۲ء والا مذکورہ ایڈیشن دیکھا تو اس کی طباعت وغیرہ کو ناپسند کیا۔ پھر انھوں نے جامعۂ ملیہ کے پریس کی کارکردگی کی تعریف کرتے ہوئے علامہ سے درخواست کی کہ ''پیامِ مشرق'' کا ایک اور ایڈیشن وہ اپنی نگرانی میں چھاپنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ راضی ہوگئے اور عبدالمجید پروین رقم کی کتابت سے آراستہ یہ نہایت ہی

نفیس ایڈیشن جامعۂ ملیہ اسلامیہ کے مطبع سے چھپ گیا ۔ طباعت اور کتابت کے لحاظ سے یہ ایڈیشن واقعی ایک شاہکار ہے اور اس کا ایک نسخہ راقم کے پاس بھی محفوظ ہے ۔ میرا خیال ہے کہ ایسا نفیس ایڈیشن پھر کبھی شائع نہیں ہوا ۔ اس کے شروع میں "پیشکش بحضور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ فرماں روائے دولتِ افغانستان خلد اللہ ملکہ و اجلالہ" کی عبارت درج ہے اور کاتب اور کتب فروش کے نام بھی طبع ہوئے ہیں ۔

۱۹۳۲ء میں یورپ بھر میں گوئٹے کی صد سالہ برسی منائی گئی تھی ۔ علامہ اقبال بھی اس زمانے میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن میں موجود تھے اور دوستوں کے ساتھ علمی موضوعات پر خوب بحثیں اور مذاکرات ہوتے تھے ۔ راقم بھی اُن دنوں لندن میں موجود تھا ۔ اسی زمانے میں عبدالرحمٰن چغتائی مرحوم کے ہمراہ ایک جرمن لڑکی ایلزا ہیفنز نامی علامہ سے ملنے آئی جو خاصی پڑھی لکھی تھی ۔ اس کے ساتھ دیر تک مفید گفتگو ہوتی رہی ۔ اس کا ذکر میں نے اقبال کے قیامِ لندن (۱۹۳۲ء) کی یادداشتوں میں بھی مختصراً کیا ہے ۔ دورانِ ملاقات میں "گوئٹے کی گفتگو ایکرمین سے" کا ذکر بھی آیا جسے علامہ بخوبی جانتے تھے ۔ اس کا ایک مستند ترجمہ ہیولاک ایلس نے ۱۹۳۰ء میں کیا تھا جو لاہور آ کر میں نے خریدا اور علامہ نے بھی اسے دیکھا ۔ اس میں مصوری پر اور آرٹسٹ روبنز پر بڑی مفید بحث ہے ۔

جرمن لڑکی ایلزا کے ہاتھ میں رسالہ "نیرنگِ خیال" کا ۱۹۳۲ء کا سالنامہ تھا جو اسی سال چھپا تھا اور اس میں نکلسن کے تبصرۂ "پیامِ مشرق" کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا تھا ۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اس لڑکی کو "نیرنگِ خیال" کی ظاہری

شکل و صورت پسند نہیں آئی اور وہ پرچے کی ہیئت ِ کذائی سے ناخوش ہے ۔ دراصل احباب نے علامہ کی تعریف و توصیف جس انداز میں کی تھی ، اس کے پیش ِ نظر وہ لڑکی سمجھتی تھی کہ اتنے عظیم آدمی کا ذکر اس قسم کے معمولی پرچے میں زیب نہیں دیتا ۔ اس کے بعد جب علامہ نے ایک جرمن پروفیسر کیمف میٹر پر گفتگو کی اور پھر گوئٹے پر بات چیت چل نکلی تو وہ علامہ کے خیالات سننے کی شائق نظر آنے لگی ۔ چنانچہ علامہ نے ''آرٹ اینڈ لٹریچر'' پر بھی سیر حاصل بحث کی اور اپنی کتاب ''پیام ِ مشرق'' کی تخلیق کی وجوہ پر روشنی ڈالی جو گوئٹے کے ''دیوان ِ مغرب'' کے جواب میں لکھی گئی تھی ۔ علامہ نے دوران ِ گفتگو فرمایا کہ مجھے زندگی کے بارے میں میتھیو آرنلڈ کے نظریات سے اختلاف ہے ۔ اس ضمن میں آپ نے فارسی شعرا کے کلام سے بہت سے اشعار بھی سنائے ۔ پھر لیسنگ کے نظریہ ٔ لاؤکون ، سوفولس کے فلوکیٹس اور ورجل کے نظریات پر آپ نے تفصیل سے بحث کی جسے سن کر جرمن لڑکی علامہ کے تبحّر ِ علمی کی قائل ہو گئی اور مطمئن ہو کر اٹھی ۔

ایک مرتبہ میں نے علامہ سے سوال کیا کہ آپ نے ''پیام مشرق'' کو امیر امان اللہ خاں کے نام ہی معنون کیوں کیا ؟ آپ نے مسکرا کر جواب دیا کہ میں اس کتاب کو کسی آزاد مسلمان کے نام معنون کرنا چاہتا تھا اور اس ضمن میں امیر امان اللہ سے زیادہ موزوں شخصیت کس کی ہو سکتی تھی ؟ اس پر میں لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا کیونکہ ''پیام ِ مشرق'' کے جذبے کو فعّال بنانے کے لیے اس کا کسی مرد ِ آزاد کے نام معنون ہونا نہایت ضروری تھا ۔

''پیام ِ مشرق'' کی اشاعت کے بعد دوستوں نے علامہ سے اس کتاب کا ایک مصوّر ایڈیشن شائع کرنے کی درخواست بھی کی تھی

کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ علامہ کو ادب کا نوبل پرائز ضرور ملے گا اور اس کے لیے ایک شایان شانِ مصوّر ایڈیشن نہایت ضروری تھا۔ اس سے پہلے ٹیگور کی کتاب ''گیتانجلی'' کا بھی ایک مصوّر ایڈیشن شائع ہو چکا تھا جس پر ییٹس نے انگریزی زبان میں مقدمہ لکھا تھا۔ مگر نہ تو ''پیامِ مشرق'' کا یہ ایڈیشن شائع ہو سکا اور نہ ہی مغرب والوں کی سیاسی مصلحت نے اقبال کو نوبل پرائز کا مستحق گردانا جس سے ہندوستان کے تمام اہلِ علم کو دکھ ہوا۔

☆ ☆ ☆

۲۸

تبصرہ[1] بر پیامِ مشرق

(از ڈاکٹر نکلسن ، کیمبرج یونیورسٹی انگلستان)

عہدِ حاضر کے ہندی شعرا میں اقبال ایک نہایت بلند مرتبہ رکھتا ہے - اس کے ساز سے دو قسم کے نغموں کی صدائیں نکلتی ہیں ؛ پہلی صدا ہندی الاصل (اردو) ہے جو ہندی میں حرمتِ وطن کے جذبات کے لیے داد طلب ہے ، اگرچہ اقبال سیاسی حیثیت سے وطن پرست نہیں ہے - اس کا دوسرا سرود خاکِ ایران کی شیریں اور سریلی زبان میں ہے جو ملّتِ اسلامیہ کے ساتھ مخصوص ہے - درحقیقت یہ جدید اور فیضانی سرود ، جو اپنی سحرکاریوں سے آتشیں شعلے اور خاکستر دور دور پھیلا رہا ہے ، عنقریب ایک الہامی آواز کی حیثیت سے پھیلنے والا ہے -

اقبال نے پنجاب میں جنم لیا اور تعلیم کی تکمیل انگلستان اور جرمنی میں کی -گویا مشرق و مغرب کا اقتران ہوا لیکن یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ وہ متحد ہوگئے - کوئی شخص خواہ کتنا ہی قدرتی کمالات

۱- مطبوعہ رسالہ ''اسلامیکا'' (لپزگ ، جرمنی) جلد اول ، نمبر اول ، (۱۹۲۵ع) -

سے معمور کیوں نہ ہو ، وہ یہ امید نہیں کر سکتا کہ ان دونوں تہذیبوں سے ، جو مختلف اساسوں پر مبنی ہیں ، کماحقہ حظ آٹھائے۔ اگرچہ اقبال مغربی تربیت سے خاصا متاثر ہے مگر اس کی روح خالصتاً مشرقی ہی ہے - بےشک گوئٹے ، بائرن اور شیلے سے وہ با خبر ہے - نیٹشا کی کتاب . . . (جس میں اس نے اپنی تعلیمات کو نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے) اور برگساں کی کتاب ''ارتقاے تخلیقی'' سے آتنا ہی آشنا ہے جتنا وہ قرآن اور مثنویِ مولانا روم سے ، مگر مغربی تہذیب کے ''اصولِ انسانیت'' سے وہ نسبتاً کم باخبر معلوم ہوتا ہے - چنانچہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کی تنقید اگرچہ کبھی سطحی نہیں ہوتی مگر بعض اوقات جامع بھی نہیں ہوتی - چنانچہ اس کے فلسفے کے معتبر نظریے ، جو زیادہ تر ''اسرارِ خودی'' اور ''رموز بے خودی'' میں اشارۃً نہیں بلکہ صراحۃً مذکور ہیں ، مختصراً یہاں بیان کیے جاتے ہیں کیونکہ ان نظریات کے علم کے بغیر اقبال کے کلام کا سمجھنا آسان نہیں -

وہ حقیقت کو تکوین کا عمل قرار دیتا ہے کہ ایک دائمی حکومت (ہستیِ مطلق) کا قصرِ سکونت اس کے نظامِ اشیا میں کوئی محل نہیں رکھتا - کل حرکت میں ہے - کائنات افراد کے اشتراک کا نام ہے جس کا موجد بے ہمتا یعنی خدا ہے - وجود کی تشکیل اور تہذیب ان کا مقصدِ حیات ہے - انسانِ کامل نہ محض مادے کی دنیا پر تسلّط جما کر جذب کر سکتا ہے اس لیے حیات کا جوہر محبت ہے جو اپنے اعلیٰ پایے میں تخلیق خواہشات و تخیّلات اور ان کے اظہار کی سعی ہے - چنانچہ خواہشات ہی خواہ اچھی ہوں یا بری ، شخصیت کو کمزور یا قوی کرتی ہیں اور تمام قدر و منزلت اسی معیار ہی

سے جانچی جاتی ہے[1] یہ ضروری نہیں کہ نیٹشا اور برگساں کو اقبال سے نسبت دی جائے۔ یہ واضح نہیں کہ اقبال اپنی خیالی مجلس کو محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے تصورِ اسلام کے مطابق کیوں پیش

۱- یہاں پر یہ جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر براؤن نے اپنی تالیف ''تاریخ ادبیات ایران'' کی چوتھی جلد کے صفحہ ۴۳۰ پر جہاں ''حکمت الاشراق'' مصنفہ شہاب الدین سہروردی کا ذکر کیا ہے وہاں ڈاکٹر اقبال کی تالیف ''مابعدالطبیعیاتِ ایران'' سے کچھ نقل کر کے اقبال کے نظریہٗ مذہب بابی سے کلی طور پر اتفاق کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسی صفحے پر ایک مختصر سا نوٹ بھی اقبال کا تعارف کرانے کی غرض سے لکھا ہے جس میں آپ کی کتاب "اسرار خودی" کا ذکر ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ کتاب لاہور میں یونیورسٹی پریس میں طبع ہوئی ہے (جو غلط ہے) اور یہ مشرقی رنگ میں نٹشا (مشہور جرمن فلسفی) کے فلسفے کا چربہ ہے۔ یہ یاد رہے کہ دو بڑے آدمی جب جزئیات میں ایک دوسرے سے اتفاقیہ طور پر متفق ہو جائیں تو ان کو ایک دوسرے کا کلی طور پر خوشہ چین نہیں کہا سکتا۔ ناظرین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ خود ڈاکٹر براؤن نے لندن کے شاہی مشرقی مجلس کے (۱۹۲۱ع ، صفحہ ۱۴۷) ایک پرچے میں اسی کتاب ''اسرار خودی'' مترجمہ نکلسن پر تبصرہ کیا ہے اور جہاں ڈاکٹر نکلسن کو ذرا بھر بھی اس قسم کا شبہ ہوا ہے اس کی کامل طور پر تردید کی ہے۔ چنانچہ براؤن لکھتا ہے :

''ڈاکٹر نکلسن بیان کرتا ہے کہ اقبال کا فلسفہ زیادہ تر نیٹشا اور برگساں کا اور بہت کم جدید فلسفہٗ افلاطون کے ماہرین اور ان کے مشرقی جانشینوں کا مرہونِ منّت ہے حالانکہ یہ کسی حالت میں بھی مغربی فلسفہ نہیں بلکہ صراحتہً فلسفیانہ انداز میں اخوتِ اسلامی کی تعلیم ہے۔ یہ کتاب استغراق ، انسدادِ خودی اور ہمہ اوست کے امراض کے علاج کے لیے لکھی گئی ہے۔ مصنف کے نظریے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کرتا ہے اور کیوں اس مجلس کی شرکت کا استحقاق مسلمانوں ہی کے لیے مخصوص ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی جدوجہد کرنے والے نے فلسفی کو پسپا کر دیا ہے جس کا منطقی نتیجہ غلط مگر شاعری کے لحاظ سے صحیح ہے۔ شاعر اقبال کو معقولات سے سخت نفرت ہے۔ وہ ابنِ سینا کا مولانا رومی سے تباین ظاہر کرتا ہے:

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم
دست رومی پردۂ محمل گرفت
ایں فرو تر رفت و تا گوہر رسید
آں بگردابے چو خس منزل گرفت
حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر میگردد چو سوز از دل گرفت

''پیام مشرق'' گوئٹے کے دیوانِ مغرب کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اقبال ابتدائی اشعار میں، جو امیرِ افغانستان کے تہدیے میں کہے گئے ہیں، کہتا ہے:

پیرِ مغرب شاعرِ المانوی
آں قتیلِ شیوہ ہائے پہلوی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

کے مطابق ان نظریات نے پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زندہ تعلیم کے تابعین کو مردہ کر دیا ہے۔ اس کا روئے سخن، جیسا کہ ڈاکٹر نکلسن نے بیان کیا ہے، محض مسلمانانِ ہند کی طرف نہیں بلکہ مسلمانانِ عالم کی طرف ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے بجائے اردو کے فارسی میں تصنیف کی گئی ہے جو ایک عمدہ مسلک ہے۔ کیونکہ خواندہ مسلمان بہ نسبت اُردو زبان کے فارسی سے زیادہ آشنا ہیں جسے اُنھوں نے اپنے فلسفیانہ افکار و تخیّلات کی بلند پروازی اور اُنھیں دل ربا پیرائے میں ادا کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔'' (حاشیۂ مترجم)

بستِ نقشِ شاہدانِ شوخ و شنگ
داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغامِ شرق
ماہ تابے ریختم بر شامِ شرق

اگرچہ "پیامِ مشرق" گوئٹے کے دیوان سے بظاہر مشابہ ہے کیونکہ دونوں کی مختصر نظمیں ابواب میں مرتب ہیں اور ان کے علیحدہ علیحدہ عنوان رکھے گئے ہیں مگر اپنے عام مقصد میں اور نفسِ مضمون کے لحاظ سے ان میں کوئی مناسبت نہیں۔ گوئٹے کے دیوان میں "حور و شاعر" اور "جوے آب" صرف دو نظمیں ہیں جو دیوان میں شامل نہیں ہیں اور "پیام" میں آنھیں عنوان دے کر براہ راست جواب دیا گیا ہے۔ "جلال اور گوئٹے" کے عنوان کے تحت جو نظم شامل ہے اس میں اقبال مولانا جلال الدین رومی کو، جس کا وہ نہایت مداح ہے، گوئٹے سے بہشت میں ملاقات کرتا ہوا تصور کرتا ہے۔ اس کو ملنے کے بعد "فاؤسٹ"[1] مصنفہ گوئٹے کا مطالعہ کیا ہے۔ رومی اس طرح کلام کرتا ہے:

فکرِ تو در کنج دل خلوت گزید
ایں جہانِ کہنہ را باز آفرید
سوز و سازِ جاں بہ پیکر دیدہ ای
در صدف تعمیرِ گوہر دیدہ ای

۱۔ گوئٹے کی یہ مشہور و معروف تصنیف ایک ڈراما ہے جس میں شاعر نے حکیم فاؤسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کو قدیم روایت کے پیرائے میں بیان کر کے انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمالِ فن خیال میں نہیں آ سکتا۔

هـر کسے از رمـز عشق آگاہ نیست
هر کسے شایان ِ ایں درگاہ نیست
''داند آں کو نیک بخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است''

''پیام'' کے کثیر حصے کا سمجھنا مشکل ہے اور اس سے زیادہ مشکل اس کا ترجمہ کرنا ہے۔ پیچیدہ جذبات اور مشکل فلسفیانہ تخیّلات اکثر اوقات فارسی شاعری کے استعارات و تشبیہات میں پنہاں ہو جاتے ہیں لیکن اس کے آسان اور واضح حصے ہمارے ادراک میں بڑی طلب پیدا کرتے ہیں۔ مزید برآں ہماری ہمدردی بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ ذیل میں ایک خط کا خلاصہ ہے جو شاعر کو اس کے کسی مسلمان دوست نے لکھا ہے: ''واقعی ایک اعلٰی تربیت یافتہ اور فہمیدہ انسان مادے کے اصل ِاصول کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اگر کسی نے کافی پڑھا ہو، کافی تفکّر کیا ہو اور کافی شبہات میں بھی پڑا ہو تو اعلٰی تخیّل تک پہنچ سکتا ہے جس پر آپ اپنے مطالعہ کرنے والوں کو اپنے سادہ طریقے سے لے جانے کی خواہش کرتے ہیں۔ یہ کتاب محض اُن لوگوں کے لیے ہے جو اپنی خودی کو ارادۃً مصروف کرنے کے شغل سے کافی واقف ہوتے ہیں کیونکہ وہ اسے ایک فریب سے دوسرے تک لے جانے کے لیے ذریعہ ایمان بناتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تمام انسانی جذبات کی غایت، بلندی سے لے کر تنگ و تاریک شکوک تک، تلاش کر لی ہے۔ آپ کے معاملے میں نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے ''دست از یک شست تا افتاد در بند ِ دگر'' اور ہم ہیں کہ نہ اتنا محسوس کیا ہے اور نہ اتنا مشاہدہ کیا ہے۔ اس لیے ہم اس اعلٰی روحانی دنیا میں رہنے کی نہ جرأت رکھتے ہیں اور نہ قابلیت ہی رکھتے ہیں، مگر وقتاً فوقتاً اس میں تفکّر

کرتے ہیں ۔"

میں جو کچھ کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ شاعر کے تخیّل کے اشارات قلم بند کردوں ۔ اس امید پر کہ بعض لوگ جب میرا ترجمہ پڑھیں گے تو اس عجیب و غریب کتاب کو مجموعی حیثیت سے مطالعہ کرنے کی طرف راغب ہوں گے ۔ یہ اس قابل ہے کہ اقبال کی بلند اور زبردست شخصیت سے تعارف کرا دے ۔ یہ مسلّمہ امر ہے کہ جس قدر تکالیف سخت ہوتی ہیں اتنا ہی عظیم ان کا اجر ہوتا ہے . . . ۔ اقبال کے لیے خود شعوری و انفرادیت ہی اصلِ اصول ہے ۔ وہ ہمیشہ علمِ ذات، اثباتِ خودی اور ارتقاے نفس کا سبق دیتا ہے ۔ اس کا مقصدِ حیات عمل ہے ۔ اس کا انجام روحانی اور اخلاقی قوت ہے جو ضبطِ نفس و اطاعت سے نشو و نما پاتی ہے ۔ ہم مادے کو تسخیر کرنے کے بعد آزاد ہو جاتے ہیں اور پھر وحدتِ زندگی اور وقت کے فضائی تصور کے بعد غیرفانی زندگی حاصل کرتے ہیں ۔

۱

زندگی

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست ؟
گفتا مئے کہ تلخ ترِ او نکوتر است
گفتم کہ کرمک است و ز گل سر بروں زند
گفتا کہ شعلہ زاد مثالِ سمندر است
گفتم کہ شر بفطرتِ خامش نہادہ اند
گفتا کہ خیرِ او نشناسی ہمیں شر است
گفتم کہ شوقِ سیر نبردش بمنزلے
گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمراست

گفتم که خاکی است و بخاکش همی دهند
گفتا چو دانه خاک شگافد ، گلِ تر است

۲

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور
کہ جانِ تو ز خود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

۳

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم‌خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز
حیاتِ جاودان اندر ستیز است

۴

دلِ من رازدانِ جسم و جان است
نہ پنداری اجل بر من گران است
چہ غم گر یک جہان گم شد ز چشمم
ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است

۵

جہانِ ما کہ پایانے ندارد
چو ماہی در یمِ ایّام غرق است

یکے بزمِ دل نظر وا کن کہ بینی
یمِ ایّام در یک جام غرق است

۶

اے برادر! من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگِ سبک داں، مرگ را خوابِ گراں

۷

می خورد هر ذرۂ ما پیچ و تاب
محشرے در هر دمِ ما مضمر است
با سکندر خضر در ظلمات گفت
مرگ مشکل ، زندگی مشکل‌تر است

۸

حیاتِ جاوید

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
هزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است
چمن خوش است ولیکن چو غنچہ نتواں زیست
قبائے زندگیش از دمِ صبا چاک است
اگر ز رمزِ حیات آگہی ، مجوے و مگیر
دلے کہ از خلشِ خارِ آرزو پاک است
بخود خزیدہ و محکم چو کوهساراں زی
چو خس مزی کہ هوا تیز و شعلہ بے باک است

۹

بسے زار نالید ابر بہار
کہ ایں زندگی گریۂ پیہم است
درخشید برقِ سبک سیر و گفت
خطا کردہ ای خندۂ یک دم است

۱۰

زندگی و عمل

(در جوابِ نظم ہائنا موسوم بہ 'سوالات')

ساحلِ افتادہ گفت ، گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موجِ ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم ، گر نہ روم نیستم

۱۱

نوائے وقت

خورشید بہ دامانم ، انجم بہ گریبانم
در من نگری ہیچم ، در خود نگری جانم
در شہر و بیابانم ، در کاخ و شبستانم
من دردم و درمانم ، من عیشِ فراوانم
من تیغِ جہاں سوزم ، من چشمۂ حیوانم

چنگیزی و تیموری ، مشتے ز غبارِ من
هنگامۂ افرنگی ، یک جستہ شرارِ من
انسان و جهانِ او ، از نقش و نگارِ من
خونِ جگرِ مردان ، سامانِ بهارِ من

من آتشِ سوزانم ، من روضۂ رضوانم

آسوده و سیّارم ، ایں طرفہ تماشا بیں
در بادۂ امروزم ، کیفیّتِ فردا بیں
پنهاں بضمیرِ من ، صد عالمِ رعنا بیں
صد کوکبِ غلطاں بیں ، صد گنبدِ خضرا بیں

من کسوتِ انسانم ، پیراهنِ یزدانم

تقدیر فسونِ من ، تدبیر فسونِ تو
تو عاشقِ لیلاے ، من دشتِ جنونِ تو
چوں روحِ رواں پاکم ، از چند و چگونِ تو
تو رازِ درونِ من ، من رازِ درونِ تو

از جانِ تو پیدایم ، در جانِ تو پنهانم

من رهرو و تو منزل ، من مزرع و تو حاصل
تو سازِ صد آهنگے ، تو گرمیٔ ایں محفل
آوارۂ آب و گل ! دریاب مقامِ دل
گنجیده بہ جامے بیں ، ایں قلزمِ بے ساحل

از موجِ بلندِ تو سر بر زده طوفانم

۱۲

سرودِ انجم

هستیٔ ما نظامِ ما مستیٔ ما خرامِ ما
گردشِ بےمقامِ ما زندگیِ دوامِ ما
دورِ فلک بکامِ ما ، مے نگریم و مے رویم

جلوہ گہِ شہود را بت کدۂ نمود را
رزمِ نبود و بود را کشمکشِ وجود را
عالمِ دیر و زود را ، مے نگریم و مے رویم

گرمیِ کارزار ہا خامیِ پختہ‌کار ہا
تاج و سریر و دار ہا خواریِ شہریار ہا
بازیٔ روزگار ہا ، مے نگریم و مے رویم

خواجہ ز سروری گذشت بندہ ز چاکری گذشت
زاری و قیصری گذشت دورِ سکندری گذشت
شیوۂ بت‌گری گذشت ، مے نگریم و مے رویم

خاک خموش و در خروش سست نہاد و سخت کوش
گاہ بہ بزمِ ناؤ نوش گاہ جنازۂ بہ دوش
میرِ جہان وسفتہ گوش ، مے نگریم و مے رویم

تو بہ طلسم چون و چند عقلِ تو در کشاد و بند
مثلِ غزالہ در کمند زار و زبون و دردمند
ما بہ نشیمنِ بلند ، مے نگریم و مے رویم

پردہ چرا ؟ ظہور چیست ؟ اصلِ ظلام و نور چیست ؟
چشم و دل و شعور چیست ؟ فطرتِ ناصبور چیست ؟
این ہمہ نزد و دور چیست ؟ مے نگریم و مے رویم

بیشِ تو نزدِ ما کمے　　سالِ تو پیشِ ما دمے
اے بہ کنارِ تو یمے　　ساختہ ای بہ شبنمے
ما بہ تلاشِ عالمے ، مے نگریم و مے رویم

آخری حصے کا عنوان ''نقشِ فرنگ'' ہے جس میں مشرقی ناظر کے لیے اہم ترین مغربی تخیّل کی توضیح شاعر کے لقطۂ نظر سے کی گئی ہے - (اور مغربی ناظر کے لیے) اپنے آپ کو اس طرح مشاہدہ کرنا جس طرح اس کو دوسرے مشاہدہ کرتے ہیں ، بہت بہتر ہے - اور اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ ہم صحیح پیام کو دل سے لگائیں جس میں اقبال خشک عقلی زنجیروں کو اُتار پھینکنے اور ہماری حیات و محبت کی اندرونی دنیا میں ظاہر ہونے کی تلقین کرتا ہے :

۱۳

دانش اندوختہ ای ، دل ز کف انداختہ ای
آہ زان نقدِ گران مایہ کہ در باختہ ای

حکمت و فلسفہ کارے است کہ پایانش نیست
سیلیِ عشق و محبّت بہ دبستانش نیست
بیشتر راہِ دلِ مردمِ بیدار زند
فتنۂ نیست کہ در چشمِ سخن دانش نیست
دل ز نارِ خنکِ او بہ تپیدن نرسد
لذّتے در خلشِ غمزۂ پنہانش نیست
دشت و کہسار نوردید و غزالے نہ گرفت
طوفِ گلشن زد و یک گل بہ گریبانش نیست

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیشِ او سجدہ گذاریم و مرادے طلبیم

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی درپۓ تعمیرِ جہانِ دگر است

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود
ایں مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود
آنچہ بود است و نباید ز میاں خواہد رفت
آنچہ بایست و نبود است ہماں خواہد بود
عشق از لذّتِ دیدار سراپا نظر است
حسن مشتاقِ نمود است و عیاں خواہد بود
آں زمینے کہ برو گریۂ خونیں زدہ ام
اشکِ من در جگرش لعلِ گراں خواہد بود

"مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند"

اقبال ادنٰی ادنٰی سیاسی واقعات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا ۔ جمعیّت الاقوام کے متعلق اس کی سطور خاص اس کا اپنا رنگ رکھتی ہیں :

۱۴

جمعیّت الاقوام

برفتد تا روشِ رزم دریں بزمِ کہن
دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

”فلسفہ و سیاست“ کے تحت لکھتے ہیں :

۱۵

فلسفی را با سیاست داں بیک میزاں مسنج
چشمِ آں خورشید کورے ، دیدۂ ایں بے نمے

مگر فلسفی بذاتِ خود مؤثر چوٹیں سہتے ہیں : خاص کر ہیگل جس کے بلند پرواز دماغ کو کہا جاتا ہے ”ماکیاں کز زورِ مستی خایہ گیرد بے خروس“ ۔ مصنّف نے جو طریقہ مسلمان ناظرین کو مغربی فلسفے سے آشنا کرنے کی خاطر اختیار کیا ہے ، ”شوپن ہار اور نیٹشا“ کے متعلق اس کے کلام میں پیش کرتا ہوں :

۱٦

شوپن ہار و نیٹشا

مرغے ز آشیانہ بسیرِ چمن پرید
خارے ز شاخِ گل بہ تنِ نازکش خلید
بد گفت فطرتِ چمنِ روزگار را
از دردِ خویش و هم ز غمِ دیگراں تپید
داغے ز خونِ بیگنہے لالہ را شمرد
اندر طلسمِ غنچہ فریبِ بہار دید
گفت اندریں سرا کہ بنایش فتادہ کج
صبحے کجا کہ چرخ درو شامہا نہ چید
نالید تا بحوصلۂ آں نوا طراز
خوں گشت نغمہ و ز دو چشمش فرو چکید

سوزِ فغانِ او بہ دلِ ہدہدے گرفت
با نوکِ خویش خار ز اندامِ او کشید
گفتش کہ سودِ خویش ز جیبِ زیاں برار
گل از شگافِ سینہ زرِ ناب آفرید
درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

اقبال بہ صمیمِ قلب نیٹشا کے ارادۂ قوّت سے متفق ہے ۔ اس کا نظریہ ہے کہ اسلام ایک خیالی جماعت تصوّر کی گئی ہے جو خدائی اور جمہوری سلطنت ہے ۔ اس کا ''دیوانہ بکارگہِ شیشہ گر رسید'' سے مقابلہ[1] کرتا ہے جسے وہ شاید غیر واجب طور پر ایک دہریہ تصوّر کرتا ہے :

۱۔ ڈاکٹر اقبال نے ۱۹۱۶ء میں ایک مضمون بعنوان ''جمہوریت اسلام'' اخبار ''نیو ایرا'' میں لکھا جس میں آپ نے نیٹشا سے اس سلسلے میں اختلاف ظاہر کرتے ہوئے یورپ کی جمہوریت کا بھی نقشہ پیش کیا ہے : ''مغربی جمہوریت کو معاشرتی بدامنی اور فساد کے خطرے میں پناہ دی گئی ہے جو محض مغربی مجالس کی اقتصادی حیاتِ جدید سے وجود میں آئی ہے ۔ نیٹشا جمہوری حکومت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور عام طبقے سے ناامید نظر آتا ہے ۔ وہ تمام اعلیٰ تہذیب کو حکومتِ شخصی کی تربیت و ترقی پر مبنی قرار دیتا ہے ۔ مگر کیا عام انسان کلی طور پر اسی طرح ناامید ہیں ؟ جمہوریتِ اسلام ایزدی اقتصادی عصر سے پیدا نہیں ہوئی ۔ یہ ایک روحانی اصول ہے جو اس بات پر مبنی ہے کہ بنی نوع انسان مستور حکومت کا مرکز ہے جس کی ممکنات ایک خاص قسم کے عمل سے پیدا کی جا سکتی ہیں ۔ اسلام نے عوام میں سے حیات و عمل کی بہترین ہستیاں پیدا کی ہیں ۔ پھر کیا جمہوریتِ ابتدائے اسلام نیٹشا کے نظریات کا عملی بطلان نہیں ہے ۔''

۱۷

نیٹشا

گر نوا خواہی ز پیشِ او گریز
در نۓ کلکش غریوِ تندر است
نیشتر اندر دلِ مغرب فشرد
دستش از خونِ چلیپا احمر است
آنکہ بر طرحِ حرم بت خانہ ساخت
قلبِ او مومن دماغش کافراست[1]
خویش را در نارِ آن نمرود سوز
زانکہ بستانِ خلیل از آذر است

میں خیال کرتا ہوں مناسب یہ ہوگا کہ مصنفِ ''پیام'' (اقبال) کو بحیثیت زندہ مسلمان کے پیش کروں ۔ واقعی کوئی بھی جدید فلسفی نہیں جس سے اسے اتنی ہمدردی ہو جتنی برگساں سے ہے، جس کی تعلیم کو وہ ان سطور میں بیان کرتا ہے :

۱۔ نوٹ : ''نیٹشا نے مسیحی فلسفۂ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے ۔ اس کا دماغ اس لیے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے ، گو بعض اخلاق نتائج میں اس کے افکار مذہبِ اسلام کے بہت قریب ہیں ۔ ''قلبِ او مومن دماغش کافر است'' ۔ نبی کریم نے اس قسم کا جملہ اُمیّہ ابن الصلت (عرب شاعر) کی نسبت کہا تھا ''امن لسانہ و کفر قلبہ'' (یعنی اس کی زبان مومن ہے مگر دل کافر ہے) ۔ [''پیامِ مشرق'' کا نوٹ]

۱۸

پیغامِ برگساں

تا بر تو آشکار شود رازِ زندگی
خود را جدا ز شعلہ مثالِ شرر مکن
بہرِ نظارہ جز نگہِ آشنا میار
در مرز و بومِ خود چو غریبان گذر مکن
نقشے کہ بستہ ای ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

شگفتہ اور دل کش تنقید کے قدردان اس میں خاصا سامانِ تفریح پائیں گے ؛ مثلاً آئن سٹائن کے متعلق کہتا ہے : ''کردہ زردشتے ز نسلِ موسیٰ و ہاروں ظہور'' - پھر لینن کے متعلق یہ شعر دیکھیے جو قیصر ولیم کو غلبۂ اشتراکیت کا دعویٰ کرتے ہوئے جواب دیتا ہے کہ لوگوں نے محض ایک آقا کا دوسرے سے تبادلہ کر لیا ہے :

نماند نازِ شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

''قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور'' اور ''نوائے مزدور'' کے عنوانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال دل و جان سے مزدور کا طرف دار ہے - یہاں صرف ''نوائے مزدور'' کے اقتباس پر اکتفا کیا جاتا ہے :

۱۹

ز مزدِ بندۂ کرپاس پوش و محنت کش
نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر

ز خوے فشانیِ من لعلِ خاتمِ والی !
ز اشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ امیر

بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے
ز خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ اصول جو فلسفے میں عقلیت کے خلاف چلتا ہے ، وہ سیاسیات میں سلطنت کے خلاف بھی چلتا ہے ۔ انتہا و اعتدال قوم پرست اقبال کو اپنے مطالب کے مطابق پیش کر سکتے ہیں ۔ جیسے فرقہ سائیڈکاسٹ برگساں کا حوالہ دیتا ہے ۔ مگر روحِ حیات پھونکنے والے عمل کو لغو تحریک پر بنا کرنے کی ضرورت نہیں ۔

اقبال کھلم کھلا ضبطِ نفس کو بیان کرتا ہے جو خود شعوری کی اعلیٰ شان ہے ، اور خیالی آدمی میں تعقل اور فہم ایک ہو جاتے ہیں ۔ یقین رکھنا چاہیے کہ یہ اس کے نقاد کی تسلی نہیں کرے گا ۔ جو اس کے نظریات کے استعمال کو کافی وضاحت سے جانتے ہیں ، ان کو ان کا ”خطاب بہ انگلستان“ پڑھنا چاہیے ۔

۲۰

خطاب بہ انگلستان

مشرق بادہ چشید است ز مینائے فرنگ
عجبے نیست اگر توبۂ دیرینہ شکست
فکرِ نو زادۂ او شیوۂ تدبیر آموخت
جوش زد خوں بہ رگِ بندۂ تقدیر پرست

ساقیا تنگ دل از شورشِ مستاں نشوی
خود تو انصاف بده ایں ہمہ ہنگامہ کہ بست
''بوئے گل خود بہ چمن راہ نما شد زنخست
ورنہ بلبل چہ خبر داشت کہ گلزارے ہست

(''اسلامیکا'' جرمنی ، ترجمہ خاص برائے ''نیرنگِ خیال'')

☆ ☆ ☆

۲۹

علامہ اقبال کا گھرانہ

میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں جب آپ تشریف لے آئے تو آپ کی ایک اہلیہ (والدۂ آفتاب) اپنے والدین کے ہاں گجرات میں تھیں اور آفتاب اقبال ابھی ولایت میں زیرِ تعلیم تھے - آپ کی پہلی بیوی کریم بی بی کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہوا تھا- دو بیویاں اس مکان میں آپ کے ہمراہ رہائش رکھتی تھیں اور ان کے ہاں ابھی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی - ان میں سے ایک بیوی لدھیانے والی اور دوسری لاہور والی تھی -

میں لدھیانے میں ۱۰ جنوری ۱۹۱۵ء کو ملازم ہوکر گیا تو وہاں ابھی تک علامہ کی شادی کا ذکر تازہ تھا - یہ شادی لدھیانے کے نولکھا خاندان میں ۱۹۱۴ء میں دسمبر کے آخری ہفتے میں ہوئی تھی ، یعنی میرے وہاں جانے سے چند دن پہلے انجام پائی تھی- جناب مولانا عبدالمجید سالک نے بھی اپنی کتاب ''ذکرِ اقبال'' کے صفحہ ۶۸-۶۹ میں اس شادی کا ذکر ''لدھیانہ میں تیسری شادی'' کے عنوان کے تحت کیا ہے - یہ خاتون ڈاکٹر غلام محمد کی بہن اور ڈاکٹر سبحان علی کی سالی کی لڑکی تھیں - جب رشتہ طے ہوگیا تو لاہور سے علامہ کی بارات لدھیانے گئی تھی - دراصل لدھیانے میں

میری ملازمت اور پھر علامہ کے عزیزوں کے ایک مکان میں میری رہائش علامہ سے میرے مراسم کا باعث بنی اور ان کا قرب نصیب ہوا - پھر جب میں بھی لاہور میں آگیا تو یہ تعلقات مزید مستحکم ہوگئے - لدھیانے میں میرا تقرر چونکہ ایک سکول میں ماسٹر کی حیثیت سے ہوا تھا لہٰذا علامہ ہمیشہ مجھے ماسٹر کہہ کر مخاطب فرماتے تھے - میں نے میکلوڈ روڈ والی اس نئی کوٹھی میں علامہ کو اپنے گھر میں بہت مطمئن زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھا ہے - میں ابتدائے ۱۹۲۳ء میں لدھیانے سے سبکدوشی لے کر لاہور آ گیا تھا جس کے بعد عموماً صبح و شام آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا -

۱۹۲۴ء کے آغاز میں ہمیں معلوم ہوا کہ علامہ کی لدھیانے والی بیوی اپنے میکے لدھیانے گئی ہوئی ہیں - اس کے فوراً بعد یہ اطلاع آئی کہ ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے اور وہ خود بیمار ہیں - پھر ایک تار کے ذریعے مطلع کیا گیا کہ لڑکا فوت ہوگیا ہے - اس اطلاع پر علامہ اقبال خود لدھیانے تشریف لے گئے اور وہاں سے منشی طاہرالدین کو اطلاع دی کہ بیوی کا بھی انتقال ہوگیا ہے - یہ خبر آنے پر لاہور سے میں ، منشی طاہرالدین اور چودھری محمد حسین اسی رات بمبئی میل سے لدھیانہ روانہ ہوگئے - اس زمانے میں بمبئی میل لدھیانے میں نصف شب کو پہنچتی تھی - چنانچہ ہم نصف شب کے بعد لدھیانے میں سبحان منزل پہنچے تو علامہ سبحان منزل کی بیٹھک میں آرام کر رہے تھے - ہمارے پہنچنے پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور آبدیدہ ہو کر تمام کیفیت سنائی - فرمایا کہ مرحومہ کا جنازہ میں نے خود پڑھایا ہے کیونکہ کوئی شخص سلسلۂ قادریہ سے متعلق نہیں ملتا تھا - علامہ نہایت غمگین تھے بلکہ اس وقت تمام ماحول پر افسردگی طاری تھی - تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا - کھانے

سے فارغ ہو کر ہم تینوں الگ مکان میں آرام کرنے کے لیے چلے گئے۔ مرحومہ اور ان کے بچے کے انتقال سے دنیاوی اعتبار سے علامہ اقبال کا تعلق مرحومہ کے خاندان سے ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا تھا۔

اگلے روز ہم سوئم کے انتظامات میں مصروف تھے۔ پھر اس سے فارغ ہو کر شام کا کھانا وغیرہ کھا چکے تو دس بجے کے قریب علامہ کے نام سیالکوٹ سے ایک تار آیا جس میں لکھا تھا کہ ان کے ہاں سیالکوٹ[1] میں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ یہ دراصل جاوید اقبال کے تولد کی اطلاع تھی۔ جب یہ اطلاع زنان خانے میں پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا۔ میں نے ایسی آہ و بکا اپنی پوری زندگی میں نہیں سنی۔ ہم اس گھر میں بیٹھے ہوئے اللہ کی شان دیکھ رہے تھے کہ علامہ کے ایک گھر میں تو صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی اور ادھر سیالکوٹ میں نومولود کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ آج کسی کسی کو یہ علم ہے کہ لدھیانے کے اس خاندان سے بھی علامہ کا کوئی تعلق تھا۔ اس کے اگلے روز ہم علامہ کے ہمراہ لاہور واپس آ گئے۔ علامہ نے خود مرحومہ کی جو تاریخِ وفات کہی تھی وہ ان کی قبر پر آج بھی

۱۔ یہاں ایک وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہفت روزہ ''چٹان'' لاہور کے ۱۵ جنوری ۱۹۶۸ء کے شمارے میں ایک طویل مضمون بعنوان ''علامہ اقبال کی دعاؤں کا مجسمہ۔ ڈاکٹر جاوید اقبال'' چھپا ہے جس میں ان کی ولادت کے متعلق مندرجہ ذیل بیان درج ہے:

''جاوید ۵۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سنٹرل ماڈل سکول میں حاصل کی لیکن میٹرک کا امتحان اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ سے پاس کیا۔ ۔ ۔ ۔''

لیکن صحیح یہ ہے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، جیسا کہ یہاں بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے یورپ سے قانون اور فلسفے کی تعلیم حاصل کی اور آج کل لاہور ہائی کورٹ کے جج ہیں۔

موجود ہے ۔ یہ سانحۂ ارتحال ۲ ۔ اکتوبر ۱۹۲۴ع کو پیش آیا :

اے دریغا کہ مرگِ ہم سفرے
دلِ من در فراقِ او ہمہ درد
بہرِ سالِ رحیلِ او فرمود
بہ شہادت رسیدہ منزل کرد

اس کے بعد ہم تینوں اشخاص علامہ کے ہمراہ مرحومہ کے چالیسویں پر بھی لدھیانے گئے تھے ۔ وہاں علامہ کی ہمشیرہ اور ان کے بہنوئی بھی فیروزپور سے آ گئے تھے اور علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے بڑے صاحبزادے مسٹر اعجاز نے بھی شرکت کی تھی ۔ اس سانحے کے بعد دنیاوی اعتبار سے علامہ کے تعلقات لدھیانہ کے نولکھا خاندان سے بالکل ہی منقطع ہوگئے اور اس طرح علامہ کی زندگی کا ایک اہم باب ہمیشہ کے لیے فراموش کر دیا گیا ۔

علامہ کے وہ صاحبزادے (ڈاکٹر جاوید اقبال) جن کی پیدائش کی اطلاع سیالکوٹ سے آئی تھی ، خود علامہ کی گود میں پروان چڑھے ، تعلیم پا کر جوان ہوئے ، یورپ سے بیرسٹری اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر آئے اور آج ہائی کورٹ لاہور کے جج کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہیں ۔ علامہ انھیں بچپن میں پیار سے ''ببّا'' کہا کرتے تھے ۔

غرضیکہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں علامہ اپنے خاندان کے ساتھ نہایت اطمینان سے اور باوقار طریق پر آخر مئی ۱۹۳۵ع تک قیام پذیر رہے ۔ علامہ کی زندگی کے تمام اہم معاملات کا تعلق اسی کوٹھی سے ہے ۔

☆ ☆ ☆

۳۰

ایک واقعہ

ایک روز میں حسبِ عادت صبح کے وقت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ آپ اپنے چھوٹے کمرے میں موجود تھے ۔ میں اندر جانے سے پیشتر علی بخش سے خیر و عافیت دریافت کرنے کی غرض سے رک گیا ۔ (یاد رہے۔پروفیسر شیرانی عموماً علی بخش کو ''پیر بھائی'' کہا کرتے تھے) ۔ علی بخش نے بتایا کہ ابھی تک موٹر ڈرائیور نہیں آیا ، اس کا انتظار ہو رہا ہے ۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ کہاں جانا ہے ؟ تو اس نے کہا کہ علامہ کو کہیں نہیں جانا ۔ مجھے موٹر لے کر ریلوے سٹیشن جانا ہے کیونکہ جاوید (بیٹا) اور اس کی والدہ سیالکوٹ سے آ رہے ہیں ۔ اس کے بعد میں اندر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ وقت کیا ہوا ہے ؟ میں نے علی بخش کو آواز دی کہ وہ گھڑی دیکھ کر وقت بتائے کیونکہ گھڑی لائبریری میں رہتی تھی ۔ علی بخش نے آ کر بتایا کہ ابھی ۹ بھی نہیں بجے اور ریل گاڑی غالباً گیارہ بجے آتی ہے ۔ ہم خاموش ہو گئے ۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ منشی طاہر الدین بھی حسبِ عادت آ گئے ۔ علامہ نے ان سے بھی دریافت کیا کہ کیا وقت ہوا ہے ؟ اس نے جواب دیا کہ غالباً نو بج چکے ہیں ۔ پھر علامہ نے کہا

کہ ریلوے کے ٹائم ٹیبل میں گاڑی کے آنے کا وقت دیکھو ۔ منشی صاحب نے کہا کہ میں کل گھر جاتے ہوئے عرض کر گیا تھا کہ ۱۱ بجے گاڑی آتی ہے ۔ پھر کچھ وقت گزر گیا مگر ابھی تک ڈرائیور نہ آیا تو ہم پھر باتوں میں مشغول ہو گئے ۔ کچھ وقت اور گزرنے کے بعد علامہ نے پھر علی بخش کو آواز دے کر دریافت کیا کہ کیا وقت ہوا ہے ؟ اس نے آ کر بتایا کہ شیخ صاحب ! ابھی تو مشکل سے پونے دس ہوئے ہیں ۔ آپ نے پوچھا کہ ڈرائیور ابھی تک کیوں نہیں آیا ؟ علی بخش نے جواب دیا کہ کل ہم نے اس کو گاڑی کا صحیح وقت بتا دیا تھا اس لیے وہ بر وقت پہنچ جائے گا ۔ ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ ڈرائیور آ گیا ۔ اس نے موٹر نکالی اور علی بخش کو ساتھ لے کر ریلوے سٹیشن چلا گیا ۔ مگر اس کے کوئی پون گھنٹے کے بعد وہ خالی گاڑی لے کر واپس آ گیا ۔ گاڑی میں نہ بیّا تھے اور نہ ان کی والدہ تھیں ۔ اس وقت علامہ کا چہرہ دیکھنے کے لائق تھا مگر جب علی بخش نے اندر آ کر علامہ کو اطلاع دی کہ سیالکوٹ سے آنے والی گاڑی کسی وجہ سے آج کافی لیٹ ہے تو ان کی طبیعت سنبھل گئی اور پُرسکون نظر آنے لگے ۔ پھر انھوں نے وقت پوچھا تو علی بخش نے گھڑی دیکھ کر بتایا کہ گیارہ بجنے میں کچھ منٹ باقی ہیں ۔ آپ نے تاکیداً فرمایا کہ موٹر کو ابھی باہر ہی رہنے دو ۔ بالآخر علی بخش ایک مرتبہ پھر موٹر لے کر ساڑھے گیارہ بجے ریلوے سٹیشن گیا اور میں نے علامہ کو باتوں میں مشغول کر لیا ۔ مگر علی بخش ۱۲ بجے کے قریب پھر اکیلا موٹر میں واپس آ گیا اور اس نے بتایا کہ گاڑی تو آ گئی ہے مگر بیّا اور ان کی والدہ اس گاڑی سے نہیں آئے ۔ یہ سنتے ہی علامہ کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ بے چین ہوگئے ۔ مگر ابھی وہ یہ تمام روداد

علامہ کی خدمت میں پیش کر رہا تھا کہ اسی وقت پوسٹ مین نے آ کر خطوط دیے ۔ ان خطوط میں حسنِ اتفاق سے ایک خط سیالکوٹ کا بھی تھا جس میں سیالکوٹ کے اعزّہ نے علامہ کو لکھا تھا کہ بیٹا اور ان کی والدہ کسی ضروری کام سے رک گئے ہیں اور آج نہیں آ رہے ، اب وہ کل آئیں گے ۔ میں یہ تمام ماجرا دیکھ رہا تھا اور علامہ کی حالت دیکھ کر سخت پریشان ہو رہا تھا مگر اس خط کے آنے پر جب انہیں اطمینان ہو گیا اور ان کے چہرے کا سکون لوٹ آیا تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا ۔ دراصل علامہ کی بے چینی کی وجہ یہ تھی کہ جاوید بمشکل اس وقت ڈیڑھ برس کے ہوں گے اور ان کی والدہ بچے کے ساتھ بالکل تنہا سفر کر رہی تھیں ۔ ایسی صورت میں ان کی پریشانی فطری تھی ۔

اسی طرح ایک دلچسپ واقعہ حیدر آباد دکن میں بھی پیش آیا تھا جب آپ تیار ہو کر صبح صبح والیِ دکن میر عثمان علی خاں سے ملنے کے لیے جا رہے تھے ۔ جب ہم جانے لگے تو ایک بھیک مانگنے والے نے آ کر سوال کیا ۔ میں نے آپ کے فرمانے پر فوراً اپنی جیب سے اس کو پیسے دے دیے مگر اس نے ایک مرتبہ پھر ہاتھ پھیلا دیے ۔ اس پر علامہ نے محسوس کیا کہ شاید میں نے اسے کچھ نہیں دیا ۔ چنانچہ میں نے پھر اسے کچھ دیا تو اس کی جرأت مزید بڑھ گئی اور اس نے پھر ہاتھ پھیلا دیے ۔ نتیجہ یہ کہ جتنی مرتبہ اس نے ہاتھ پھیلایا ، علامہ کو اتنی مرتبہ یہ شک گزرا کہ شاید میں نے اسے کچھ بھی نہیں دیا جو وہ بار بار ہاتھ پھیلا رہا ہے ۔ علامہ چونکہ عجلت میں تھے لہذا اس کا مسلسل پھیلا ہوا ہاتھ تو تیاری کی مصروفیت کے دوران میں دیکھ لیتے تھے مگر میرا دینا دلانا وہ ایک مرتبہ بھی نہ دیکھ سکے ۔

☆ ☆ ☆

۳۱

بانگِ درا کی طباعت و اشاعت

علامہ اقبال کا وہ کلام جو ''بانگِ درا'' کے نام سے موسوم ہے ، اسے پہلی مرتبہ آپ نے ۱۹۲۴ء میں شائع کیا جب آپ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں مقیم تھے - میں ان دنوں آپ کے ہاں صبح و شام حاضر ہوتا تھا - ''بانگِ درا'' کے مسودے کی تدوین و ترتیب اور اشاعت میں چودھری محمد حسین مرحوم نے علامہ کی زیرِ ہدایت غیر معمولی محنت کی اور بالآخر اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا -

دراصل اس کتاب کی اشاعت کے کئی محرّکات تھے - اول یہ کہ ۱۹۲۴ء میں آپ کے تمام اردو کلام کو ، جو وقتاً فوقتاً مختلف جرائد میں چھپتا رہا تھا ، مولوی عبدالرزاق حیدر آبادی نے حیدر آباد دکن سے ''کلیاتِ اقبال'' کے نام سے شائع کر دیا تھا - اشاعت سے پیشتر انھوں نے نہ تو کبھی علامہ کے سامنے اپنے اس ارادے کا ذکر کیا تھا اور نہ ہی ان سے کسی قسم کی اجازت طلب کی تھی - علامہ کو مولوی عبدالرزاق کی اس حرکت سے بہت دکھ پہنچا کیونکہ آپ اپنے کلام کو کافی کاٹ چھانٹ اور ترمیم و اصلاح کے بعد شائع کرنے کے عادی تھے اور مولوی صاحب نے اسے بعینہ شائع کر دیا تھا - چنانچہ آپ نے سر اکبر حیدری وزیرِ مالیات

حیدر آباد سے مولوی صاحب کی اس حرکت کی شکایت کی جو ان کے ماتحت تھے ۔ آپ نے انھیں لکھا کہ مولوی صاحب کا یہ عمل اخلاق اور قانونی طور پر قابلِ مواخذہ ہے کیونکہ انھیں میری اجازت اور علم کے بغیر یہ کام کرنے کا ہرگز اختیار نہیں تھا ۔ سر اکبر حیدری نے علامہ کی شکایت کا فوری نوٹس لیا اور نہ صرف کتاب کی فروخت رکوا دی بلکہ تمام نسخے ایک کوٹھڑی میں مقفّل کروا دیے۔ ''کلیاتِ اقبال'' کے اس ایڈیشن پر علامہ کے ایک نہایت مخلص دوست اور مداح علامہ عبداللہ العمادی نے مقدمہ بھی لکھا تھا جس کے ایک ایک لفظ سے عقیدت و محبت کا اظہار ہوتا ہے ۔

ادھر لاہور میں علامہ کے ایک نہایت ہی مخلص دوست اور مداح مولوی احمد دین نے بھی کچھ اسی قسم کا کام کیا اور آپ کا اردو کلام جمع کرکے ذاتی تاثرات کے ساتھ ''اقبال'' کے نام سے شائع کر دیا ۔ انھوں نے تو اپنے خیال میں یہ کام اقبال کا نام روشن کرنے کی غرض سے کیا تھا مگر اقبال کو ان کی یہ حرکت پسند نہ آئی ۔ چنانچہ ابھی یہ کتاب بازار میں نہیں آئی تھی اور نہ ہی ابھی شیخ مبارک علی کی دکان کو اپنا کردار ادا کرنے کا موقع ملا تھا کہ علامہ خود مولوی احمد دین صاحب کے پاس تشریف لے گئے اور انھیں بتایا کہ اس طرح بغیر ترمیم و اصلاح کے اور بغیر نظرثانی کے کتاب کی اشاعت انھیں ہرگز پسند نہیں آئی ۔ نتیجتہً مولوی صاحب نے تمام مطبوعہ مواد بغیر کسی پس و پیش کے ضائع کر دیا ۔ بلکہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے تمام نسخے نذرِ آتش کر دیے۔

مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر علامہ نے نہایت عجلت میں اپنا اردو کلام مرتّب کیا ؛ بعض اشعار میں تبدیلیاں کیں اور بعض کو سرے سے حذف کر دیا اور اس طرح جو کلام مدوّن ہوا اسے

عبدالمجید پروین رقم سے کتابت کروا کے ، شیخ عبدالقادر کے مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں علی بخش ، پروین رقم سے روزانہ لکھی ہوئی کاپیاں لاتا تھا اور پھر ان کی تصحیح اور طباعت کا کام نہایت عجلت سے انجام پاتا تھا ۔

ابھی یہ کتاب چھپ کر نہیں آئی تھی کہ علامہ نے مجھے حکم دیا کہ اس کی تقسیم اور فروخت کا کام تم سنبھال لو ۔ اگرچہ یہ ایک منفعت بخش کام تھا مگر میں نے محسوس کیا کہ یہ ذمہ داری سنبھالنے کے بعد میں علامہ کے ساتھ بے تکلفی اور دوستانہ مراسم کی اس نعمت سے محروم ہو جاؤں گا جو مجھے اس وقت میسّر ہے ۔ چنانچہ میں نے نہایت ادب کے ساتھ معذرت کر دی کہ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے ۔ اسی موقع پر علامہ نے حضرتِ اکبر الہ آبادی کے خطوط کا مجموعہ شائع کرنے کا ذکر بھی فرمایا تھا جس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ یہ ایک بیش بہا علمی خزانہ ہے جو شائع ہو گیا تو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا ۔ فرمایا کہ اس کی فروخت کا کام بھی تم کرو ۔ مگر علامہ کا یہ ارادہ کبھی عمل میں نہ آیا اور یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ خطوط کا وہ مسودہ کہاں گیا ؟ ان خطوط کی موجودگی کا سراغ تو خود علامہ کے اپنے خطوط سے ملتا ہے مگر بعد کے حالات کسی کو معلوم نہیں ۔ بالآخر منشی طاہر الدین کی معرفت شمس العلماء مولوی ممتاز علی کے ادارے دارالاشاعت پنجاب کے ساتھ معاملہ طے ہو گیا اور مولوی ممتاز علی کے صاحب زادے سید حمید علی اور سید امتیاز علی تاج نے کتاب کی فروخت کی ذمہ داری قبول کرلی ۔

دار الاشاعت پنجاب نے ''بانگ درا'' کی تشہیر کی غرض سے ایک بڑے سائز کا اشتہار بھی شائع کیا تھا جو لاہور میں جگہ جگہ دیواروں پر چسپاں کیا گیا تھا ۔ دلچسپ لطیفہ یہ ہوا کہ بعض

نیم خواندہ ہندو ''بانگ'' کو ''بنک'' پڑھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ شاید علامہ اقبال کوئی بنک کھول رہے ہیں۔

جب یہ کتاب مکمل طور پر شائع ہوگئی اور متعدد اخبارات و رسائل میں اس پر تبصرے ہوئے تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ علامہ نے اپنے اردو کلام میں نہ صرف ترمیم و اصلاح کی ہے بلکہ بہت سے اشعار حذف بھی کر دیے ہیں۔ بعد میں یہ حذف شدہ اشعار بھی عقیدت مندوں نے محفوظ کر لیے اور ''باقیاتِ اقبال'' اور ''سرودِ رفتہ'' کے نام سے یہ کلام بھی کتابی شکل میں شائع ہوگیا۔

علامہ نے اپنے اکثر احباب کو ''بانگ درا'' کے نسخے تحفتاً دیے تھے اور ان پر اپنے ہاتھ سے اشعار بھی لکھے تھے۔ راقم کے پاس بھی اس ایڈیشن کا ایک نسخہ ابھی تک محفوظ ہے۔

☆ ☆ ☆

۳۲

تاریخ لاہور کا ایک اہم باب

لاہور کی تاریخ میں بعض واقعات اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت اہم اور عبرت انگیز ہیں - مسلمانوں کے عزم و ہمت کی یہ داستانیں پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے - ذیل میں اسی قسم کے تین واقعات پیش کیے جا رہے ہیں :

۱

مئی ۱۹۲۷ء کا ذکر ہے کہ چند شرپسند سکھوں نے لاہور کے گوردوارہ باولی صاحب میں مسلمانوں کے خلاف ایک گھناؤنی سازش تیار کی - چنانچہ مسلح سکھوں کا ایک گروہ گوردوارے سے نکل کر حویلی کابلی محل کے بازار میں واقع مسجد میں گھس گیا جہاں چند مسلمان عشاء کی نماز ادا کر رہے تھے - ان درندوں نے مسجد سے نکلنے والے نمازیوں کو نہایت بیدردی سے شہید کر دیا جس پر تمام لاہور میں ایک کہرام مچ گیا - علامہ اقبال اُس زمانے میں لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہو چکے تھے - یہ درد ناک خبر سن کر ہم اُسی وقت آپ کی کوٹھی پر گئے ، انھیں حالات سے مطلع کیا اور آپ کو ہمراہ لے کر جائے وقوعہ پر آ گئے - مسلمان چونکہ بے انتہا

مشتعل ہو چکے تھے لہٰذا علامہ اقبال نے انھیں صبر کی تلقین کی اور کافی رات گئے واپس آ گئے ۔ دوسرے روز صبح نو بجے ہم پھر علامہ کو لے آئے اور آپ نے سنہری مسجد کے سامنے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے ہجوم سے خطاب کیا ۔ میں بھی آپ کے ہمراہ تھا ۔ آپ نے سب سے پہلے اپنے چند فارسی اشعار پڑھے جن میں شاہین کا ذکر تھا ۔ پھر آپ نے حاضرین کو بتایا کہ مسلمانوں کا رویہ ایسے موقعوں پر کیا ہونا چاہیے ۔ مجمع نے مطالبہ کیا کہ چونکہ سکھوں کے پاس ہر وقت کرپان رہتی ہے جس سے وہ دہشت گردی کرتے ہیں لہٰذا ہمارے پاس بھی تلوار ہونی چاہیے تاکہ ہم ان وحشی حملہ آوروں کی بربریت سے اپنی جان کی حفاظت کر سکیں ۔ مگر علامہ نے لوگوں کو پھر صبر و ضبط کی تلقین کی اور مکمل تحقیقات کا یقین دلایا ۔ اسی روز بعد دوپہر شہدا کے جنازے اٹھائے گئے اور یونیورسٹی گراونڈ میں نماز جنازہ ہوئی ۔ جنازے میں لاہور کے تمام رؤسا اور بڑے لوگوں کے علاوہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی شامل تھے ۔ ایسا بڑا مجمع اور اتنا دردناک منظر لاہور میں بہت کم دیکھا گیا ہے ۔

۲

اسی طرح کا ایک اور عبرت انگیز اور درد ناک واقعہ ”رنگیلا رسول“ نامی رسوائے زمانہ کتاب کی اشاعت پر رونما ہوا جس کا ہیرو ایک گمنام محنت کش ہے ۔ علم دین ایک بڑھئی نوجوان تھا جو محلہ چابک سواراں کے قریب بازار سریاں والا میں رہتا تھا ۔ اس نے ایک ہندو راجپال نامی کو قتل کر دیا تھا کیونکہ اس نے ایک نہایت ہی توہین آمیز کتاب ”رنگیلا رسول“ شائع کی تھی جس میں

آں حضرت صلعم کی شان میں گستاخیاں کی گئی تھیں ۔ چنانچہ علم دین نے آنحضرتؐ کی شان میں گستاخی کا بدلہ یوں لیا کہ اس نے کتاب کے مصنّف راجپال کو سرِ بازار قتل کردیا ۔ جب وہ نوجوان پکڑا گیا تو مسلمانوں کے شدید احتجاج کے باوجود گورنمنٹ نے اسے پھانسی کی سزا دے دی ۔ گورنمنٹ کی تجویز یہ تھی کہ میانوالی جیل میں اسے پھانسی دی جائے مگر مسلمانانِ لاہور نے اس حکم کے خلاف ہڑتال کر دی اور مطالبہ کیا کہ غازی کو پھانسی لاہور میں دی جائے ۔ چنانچہ گورنمنٹ نے علامہ اقبال اور میاں سر محمد شفیع کو امن و امان کا ضامن ٹھہرا کر اپنا فیصلہ بدل دیا اور اسے لاہور میں پھانسی دی گئی ۔ پھانسی کے بعد علم دین کی نعش چھاونی کے ریلوے سٹیشن پر مسلمانوں کے حوالے کی گئی اور چوبرجی کے قریب نماز جنازہ ادا ہوئی ۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنا بڑا جنازہ آج تک نہیں دیکھا ۔

مذکورہ کتاب "رنگیلا رسول" کے خلاف تمام ہندوستان کے مسلمانوں نے احتجاج کیا ۔ اس کے خلاف آواز بلند کی ، جلسے کیے اور جلوس نکالے جس کے نتیجے میں کئی لوگ قید ہوئے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس سلسلے میں ایک بہت بڑا جلسہ دہلی دروازے کے باہر ہوا تھا جس کی صدارت علامہ اقبال نے کی تھی ۔ اس جلسے کے مقررین میں مولانا عرفان اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے علما بھی شامل تھے ۔ جلسے کے اگلے روز بعض احباب علامہ کے ہاں ان کی کوٹھی میں جمع ہوئے جن میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی تھے ۔ چنانچہ گزشتہ رات کی تقریر کے ضمن میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں ۔ اسی اثنا میں سید نور حسین ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی آ گئے اور انھوں نے علامہ کے کان میں کہا کہ میں

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو گرفتار کرنے کے لیے آیا ہوں ۔ اس پر آپ نے واضح طور پر فرمایا کہ حکومت کے احکام سے کیسے انکار ہو سکتا ہے مگر آپ صرف اس قدر میرے ساتھ رعایت کریں کہ ان کو میری کوٹھی سے باہر گرفتار کریں ۔

۳

اسی طرح ۱۹۳۶ع کا مسجدِ شہید گنج کا تاریخی واقعہ بھی ہمیشہ یادگار رہے گا ۔ اس موقع پر علامہ نے اپنی حد تک پوری کوشش کی کہ کسی طرح سکھ مان جائیں اور مسجد کو شہید نہ کریں ۔ آپ نے اس سلسلے میں بڑے بڑے سرکردہ سکھوں سے بات چیت بھی کی مگر کامیابی نہ ہوئی اور بالآخر سکھوں نے اس مسجد کو گرا دیا ۔ مسلمانوں نے اس مسجد کو بچانے کے لیے بے شمار قربانیاں دیں ۔ علامہ نے گاندھی جی وغیرہ سے مل کر بھی مصالحت کرانے کی کوشش کی مگر نہ تو ہندو مانے اور نہ سکھ آمادہ ہوئے ۔ بالآخر مسجد کو گرا دیا گیا اور مسلمانوں کو بہت بڑا صدمہ برداشت کرنا پڑا ۔

☆ ☆ ☆

۳۳
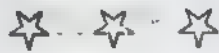
انتخابِ کونسل

علامہ کی صحبت میں بیٹھنے والے جانتے ہیں کہ آپ نے کبھی کسی انتخاب میں حصہ لینے کی خواہش نہیں کی اور ہمیشہ ایسے ہنگاموں سے اجتناب کیا ۔ مگر ہندو ذہنیت نے چونکہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو بہت پست کردیا تھا لہٰذا ان کی نمائندگی کے لیے کسی مضبوط شخص کی ضرورت تھی ۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں لوگوں نے آپ کو پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے انتخابات میں حصہ لینے پر آمادہ کرلیا ۔ جب آپ نے اعلان کیا تو دوسرے امیدواروں میں سے میاں عبدالعزیز مالواڈا اور ملک محمد حسین ایڈووکیٹ آپ کے حق میں دست بردار ہوگئے ۔ ان میں سے عبدالعزیز تو پہلے ہی ممبر چلے آرہے تھے اور ملک محمد حسین نئے امیدوار تھے ۔ تاہم ملک محمد دین نے ، جو آرائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے ، باوجود مسلمانانِ لاہور کی مخالفت کے آپ کا مقابلہ کیا ۔ یہ تمام ہنگامہ انتخابِ کونسل کا ایک بہت بڑا معرکہ تھا جس کی مختصر کیفیت ذیل میں درج کی جاتی ہے ۔

اس زمانے میں علامہ کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر احباب کا مجمع ہر وقت رہتا تھا اور ایک خاص قسم کی ہنگامی فضا نظر آتی تھی ۔ یہ حلقۂ انتخاب بہت وسیع تھا ۔ آپ اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں

اوّل رنگ محل میں آئے جہاں مشن ہائی سکول کے قریب ماسٹر اللہ بخش آرٹسٹ کے مکان پر آپ کے چند احباب جمع ہوئے۔ ان حضرات میں مصطفیٰ حیرت، ملک لال دین قیصر، شیخ حسن الدین میونسپل کمشنر اور دیگر سرکردہ مسلمان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہاں احباب سے صلاح مشورہ ہوا اور پھر اس مکان سے نکل کر مسجد چینیاں والی محلہ چابک سواراں سے گذر کر تکیہ سادھواں آئے۔ لوگوں سے ملاقات کی تو انھوں نے اپنی بھرپور امداد کا وعدہ کیا۔ وہاں ڈاکٹر محمد امین کے مکان کے قریب علامہ کے ایک پرانے ملنے والے بابو عبداللہ رہائش رکھتے تھے جو حال ہی میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ آپ نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر وہ موجود نہ تھے۔ کسی نے بتایا کہ وہ آج کل قرآنِ کریم کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ اس پر آپ نے حیرت کا اظہار کیا اور ظریفانہ انداز میں فرمایا کہ قرآن کریم سے بابو عبداللہ کو کیا سروکار؟ پھر ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ دیکھ لو، قرآن کریم بھی کس قدر مظلوم ہے کہ ہر شخص اس پر قابض ہو جاتا ہے۔

انتخاب کے معرکے میں تمام احباب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس سلسلے میں آپ کے ہم زلف خواجہ نورالدین بیرسٹر، حیات (گھی والا)، مولوی مسلم، ملک میراں بخش، شمس الدین (شم بھولی)، ڈاکٹر تاثیر اور ملک لال دین قیصر نے نہایت عمدہ کردار ادا کیا۔ انتخابی جلسے لاہور کے عام محلوں، بازاروں اور احباب کی دعوت پر گھروں میں بھی ہوئے۔ آپ ان تمام جلسوں میں تقریریں کرتے تھے جس کی وجہ سے اکثر رات کو دیر ہو جاتی۔ اس زمانے میں لوگ گلی کوچوں میں اقبال کے اشعار پڑھتے نظر آتے تھے۔ اسلامیہ کالج کے جے۔اے۔وی کے طلبہ نے، جن کو یہ کلاس میں پڑھاتا تھا، علامہ کے دفتر انتخاب

میں تمام فہرستوں کو محلہ وار الگ الگ بنایا ۔ مسٹر محمد عاشق دفتر انتخاب کے مہتمم تھے اور ان کے مشیر اعلیٰ پروفیسر تاثیر تھے ۔ یہ دفتر خواجہ محمد سلیم کے گھر میں قائم تھا جو کشمیری بازار کے کوچہ کوٹھی داراں میں واقع تھا ۔ اس سلسلے میں اسلامیہ کالج کے طلبہ نے ایک جلوس بھی نکالا تھا ۔ وہ قریب قریب شہر کے تمام بازاروں میں گھومے اور بلند آواز سے علامہ کے اشعار پڑھے ۔ ترانہ مِلّی کے مندرجہ ذیل اشعار وہ لہک لہک کر پڑھتے تھے :

چین و عرب ہمارا ، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم ، وطن ہے سارا جہاں ہمارا
باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تُو امتحاں ہمارا
اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

حرمِ پاک بھی ، اللہ بھی ، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں ؟

مختلف قسم کے پروپیگنڈا اشتہار بھی شائع ہوئے تھے جن کی کتابت حاجی دین محمد کیا کرتے تھے جو خواجہ سلیم کے مکان کے قریب ہی رہتے تھے ۔ ایک انتخابی جلوس میں علامہ خود بھی شامل ہوئے تھے ۔ مجھے یاد ہے کہ جلوس کے دوران میں جب نماز مغرب کا وقت آ گیا تو جلوس رک گیا اور قاضی عبدالرحمٰن طالب علم اسلامیہ کالج کی امامت میں نماز پڑھی گئی ۔

جب انتخابات کا وقت قریب آیا تو سرکاری طور پر پولنگ سٹیشن مقرر کیے گئے - اتفاق سے میں جس سٹیشن پر متعین تھا وہ میکلوڈ روڈ پر علامہ کی کوٹھی کے پاس نیو ایرا تھیٹر کے باہر میدان میں واقع تھا - یہاں سب سے اوّل خود علامہ نے اپنا ووٹ ڈالا اور ان کے بعد علامہ یوسف علی ، شیخ اصغر علی اور دیگر احباب نے اپنے اپنے ووٹ ڈالے - میرے مددگار اسلامیہ کالج کے جے - اے - وی کلاس کے تمام طلبہ تھے - ان طلبہ میں سے ایک لڑکے بشیر کو پولیس نے حراست میں لے لیا تھا مگر علامہ کی ذاتی مداخلت سے اسے چھوڑ دیا گیا - غرض کہ شام تک یہ ہنگامہ گرم رہا - مختلف مراکز سے جو اطلاعات آ رہی تھیں وہ کافی امید افزا تھیں - بالآخر جب گنتی مکمل ہو گئی تو علامہ اقبال نہایت غیر معمولی اکثریت کے ساتھ کامیاب ہو گئے -

جب علامہ کی کامیابی کا اعلان ہو گیا تو احباب نے ایک جلوس مرتب کیا جو شہر کے اندر نکالا گیا - سنہری مسجد اور کشمیری بازار میں اس جلوس کا بہت زور تھا - سنہری مسجد کے میدان میں جو بھنگڑا ڈالا گیا وہ دیکھنے کے قابل تھا - احباب کی مسرت کا یہ عالم تھا کہ تاثیر اور دیگر رفقا نے علامہ کو بھی اس بھنگڑے میں شامل کر لیا - اس خوشی میں احباب نے علامہ کے اعزاز میں کئی ضیافتیں کیں - مجھے یاد ہے اسلامیہ کالج کے سٹاف روم میں ہم نے بھی ایک دعوت کا انتظام کیا تھا جس میں پروفیسر سراج الدین آذر نے بطور خاص حصہ لیا - خواجہ عبدالحمید بھی اس ضیافت میں موجود تھے جو فلسفے کے پروفیسر تھے -

✡ ✡ ✡

۳۴

اقبال اور بیرونی ممالک کے اربابِ علم

(زبورِ عجم کی اشاعت)

حضرتِ علامہ کی فارسی تصنیف ''زبور عجم'' پنجاب کونسل کے انتخابات اور ''پیامِ مشرق'' کی طباعت کے بعد شائع ہوئی تھی۔ اس کا اعلان روزنامہ ''انقلاب'' میں مورخہ ۱۰ جون ۱۹۲۷ع کو ہوا تھا اور ۱۷ جولائی ۱۹۲۷ع کو لاہور میں یہ شائع ہو گئی تھی۔ میں نے اسی موقع پر ایک مضمون ۲۴ جولائی ۱۹۲۷ع کے روزنامہ ''انقلاب'' میں لکھا تھا جس کا عنوان یہ تھا :

''علامہ اقبال اور بیرونی ممالک کے اربابِ علم
(کلامِ اقبال کے تراجم اور اس پر تنقید و تبصرہ)''

بیرونی ممالک کے اربابِ علم نے علامہ کے کلام سے جس جس صورت میں اعتنا کیا تھا میں نے اس مضمون میں اس کا ایک خاکہ پیش کیا تھا۔ میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ علامہ موصوف کی شخصیت، شاعری اور فلسفے کے متعلق مختلف ممالک کے رسالوں اور مختلف زبانوں میں اب تک کیا کچھ لکھا گیا ہے۔ اس مختصر مضمون کو جن مختلف ماخذ کی مدد سے مرتب کیا گیا تھا، کم سے کم ہمارے ملک کے لوگوں کو ان کے بارے میں بہت ہی کم واقفیت تھی۔

علامہ اقبال کے والدِ ماجد شیخ نور محمد اُس زمانے میں ابھی زندہ تھے - انھوں نے اسے پڑھ کر علامہ کو ایک خط بھی لکھا تھا اور میری اس ناچیز کوشش کو سراہا تھا -

بعد میں یہ سلسلہ غیر ممالک اور ہندوستان میں بہت وسیع ہو گیا تھا اور آپ کو بے شمار فضلا کے خطوط اور تبصرے موصول ہوئے جن کی فہرست بہت طویل ہے - بہرحال راقم کا متذکرہ مضمون ذیل میں پیشِ خدمت ہے - شروع میں ''انقلاب'' کا نوٹ ہے -

کلامِ اقبال کے تراجم اور اس پر تنقید و تبصرہ

بیرونی ممالک کے اربابِ علم نے علامہ اقبال کے کلام سے جس جس صورت میں اعتنا کیا اس کا ایک مکمل خاکہ مرتّب کرنا نہایت ضروری ہے - بلکہ ان تمام تنقیدوں اور تبصروں کو مکمل طور پر اُردو زبان میں منتقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو علامہ موصوف کی شخصیت و شاعری یا تعلیمات اور فلسفے کے متعلق مختلف زبانوں میں لکھے گئے ہیں اور جن میں سے اکثر کی نسبت خبرداران ِ ہند کو علم بھی نہیں - ہمارے عزیز دوست پروفیسر محمد عبداللہ چغتائی نے غیر ملکی تنقید و تبصرہ کے متعلق مختصر سی معلومات ذیل میں ترتیب کے ساتھ جمع کر دی ہیں - ہماری رائے میں علامہ اقبال کے کلام کے سلسلے میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی خدمت ہے - اس سے پیشتر یہ معلومات یکجا نہیں ہوئی تھیں - اُمیدِ واثق ہے کہ شائقینِ کلامِ اقبال اس کے مطالعے سے محظوظ ہوں گے'' (ادارۂ ''انقلاب'' ، ۲۴ جولائی ۱۹۲۷ع ، مطابق ۲۳ محرم الحرام ۱۳۴۶ھ) -

(۱) حسین دانش ، تُرکی فاضل ، نے تُرکی زبان میں علامہ اقبال

کی بہت سی نظموں کا ترجمہ کیا ہے اور ''پیامِ مشرق'' پر تبصرہ بھی لکھا ہے ۔ ہمیں یہ معلومات ڈاکٹر توفیق بے رکن وفد ہلال احمر سے ملیں ۔ ڈاکٹر توفیق بے نے یہ بھی فرمایا کہ اقبال کے نظریات کو شاید ہی کسی نے اس وضاحت سے لکھا ہو جس وضاحت سے حسین دانش نے لکھا ہے ۔ ایک روز ڈاکٹر توفیق بے نے دوران گفتگو میں فرمایا کہ اگر اقبال کبھی قسطنطنیہ تشریف لائیں تو ان کا شاہانہ استقبال کیا جائے ۔

(۲) ''امان افغان'' کابل میں جناب آغا ہادی حسن صاحب وزیرِ تجارت نے ، جو پہلے انگلستان میں افغانستان کی طرف سے سفیر تھے ، ایک سلسلۂ مضامین ''پیامِ مشرق'' پر بطورِ تبصرہ لکھا تھا جو کئی نمبروں میں شائع ہوا ۔

(۳) مصر کے مشہور و معروف سیّاح جناب احمد رفعت ، جنھوں نے پچھلے دنوں میں ممالکِ اسلام کی سیاحت ختم کی ، اپنی سیاحت کے دوران شملہ اور لاہور میں بھی رونق افروز ہوئے ۔ جناب احمد رفعت نے علامہ اقبال کی بہت سی نظموں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا اور یہ تراجم مصر کے مشہور جریدے ''الاھرام'' میں شائع ہوئے ۔

(۴) مولوی عبدالحق صاحب حقی بغدادی مرحوم سابق پروفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے علامہ کی مشہور نظم ''ترانہ'' کا ترجمہ عربی زبان میں کیا تھا ۔ یہ ترجمہ بھی مصر وغیرہ کے عربی اخبارات میں چھپ چکا ہے ۔

(۵) ڈاکٹر نکلسن پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی نے ''اسرارِ خودی'' کو انگریزی لباس پہنایا ۔ پھر ''پیامِ مشرق'' پر رسالہ ''اسلامیکا'' (جرمنی) میں تبصرہ لکھا ۔ اس تبصرے کا اردو ترجمہ ''نیرنگ خیال'' کے عید نمبر میں ۱۹۲۵ع میں شائع ہو چکا ہے ۔ سنا

جاتا ہے کہ آج کل ڈاکٹر موصوف ''پیامِ مشرق'' کے انگریزی ترجمے میں مصروف ہیں۔

(٦) ڈاکٹر براؤن آنجہانی نے ''اسرارِ خودی'' کے انگریزی ترجمے پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلہ ۱۹۲۱ء میں تبصرہ لکھا۔ نیز اپنی تازہ ترین تالیف ''تاریخِ ادبیاتِ فارسی'' کی آخری جلد یعنی جلد چہارم میں بھی شہاب الدین سہروردی کے سلسلے میں ذکر کیا ہے۔

(۷) ڈایشوروسو نے ''پیام مشرق'' کے مقدمے کو جرمنی زبان کا لباس پہنا کر ''پیامِ مشرق'' کی غرض و غایت کو واضح کر دیا۔

(۸) ڈاکٹر فشر پروفیسر لپزگ یونیورسٹی، ایڈیٹر ''اسلامیکا'' نے جرمنی زبان میں ''پیامِ مشرق'' پر تبصرہ لکھا اور ڈاکٹر نکلسن سے بھی زیادہ بہتر طریق پر علامہ اقبال کا گوئٹے سے مقابلہ کیا۔

(۹) جرمنی کے مستشرق ڈاکٹر ہانسی مامکنکے نے، جو وہاں کا ایک مشہور فلسفی شاعر ہے، نہایت حسنِ عقیدت اور فرطِ محبت سے ''پیامِ مشرق'' کا استقبال کیا، یعنی اس کے ایک خاص حصے کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا۔ پھر اسے چمڑے کے کاغذ پر، جس پر عموماً انجیل وغیرہ مقدس کتابیں لکھی جاتی ہیں، اپنے ہاتھ سے خوش خط لکھا اور مشرقی انداز میں نقش و نگار بنا کر علامہ اقبال کی خدمت میں بطور تہدیہ ارسال کیا۔ احقر کو بھی اس ہدیۂ نادرہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ واقعی ایسی نایاب چیز کبھی قدیم زمانے میں تیار کی جاتی تھی۔

(۱۰) خان بہادر عبدالعزیز ڈپٹی کمشنر بندوبست جب انگلستان تشریف لے گئے تو وہاں آپ نے لندن یونیورسٹی اور کیمبرج یونیورسٹی میں اقبال کی شاعری کے نصب العین پر لیکچر دیے جو بعض یورپی

رسائل میں شائع بھی ہوئے ۔

(۱۱) جرمنی میں ڈاکٹر اقبال کے نام پر ایک سوسائٹی قائم ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ علامہ موصوف کی تعلیمات اور آپ کے کلام کی اشاعت کرے ۔

(۱۲) ڈاکٹر سکارپا اٹلی کے ایک مشہور فاضل ہیں جو پچھلے دنوں افغانستان بھی تشریف لے گئے تھے ۔ آپ نے اٹلی کے ایک ادبی مجلہ میں اقبال کے متعلق ایک نہایت محققانہ مضمون لکھا ہے ۔

(۱۳) حال ہی میں جرمنی میں ایک بیاض ہندوستانی علم و ادب کے متعلق شائع ہوئی ہے جس میں مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب بصورتِ تراجم جمع ہے ۔ اس مجموعے میں علامہ اقبال کی پانچ نظمیں ہیں اور ٹیگور کی محض ایک نظم ہے ۔

(۱۴) ایک روسی نے ، جو ہندوستان کا سفر کر چکا ہے اور لاہور محض علامہ اقبال سے ملنے کی غرض سے آیا تھا ''اسرارِ خودی'' کے نظریات کو روسی زبان میں قلم بند کیا ہے ۔

(۱۵) ڈاکٹر کزن نے ، جو مدراس کی تھیوسوفیکل سوسائٹی کے روح رواں ہیں ، اپنی تازہ کتاب ''ساما دراسن'' میں تبصرہ لکھا ہے اور ٹیگور اور اقبال کا موازنہ کیا ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''اقبال اس کا برادرِ کلاں ہے''۔

(۱۶) آں جہانی ڈاکٹر سپونر نے نظم ''شکوہ'' کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے جو ''انڈین ریویو'' میں شائع ہو چکا ہے ۔ آپ ''پیامِ مشرق'' کا ترجمہ بھی انگریزی زبان میں کرنا چاہتے تھے ۔

(۱۷) رسالہ ''اینتھم'' ۱۹۲۱ع میں مسٹر فارسٹر نے ''اسرارِ خودی'' کے انگریزی ترجمے پر تبصرہ لکھا ہے اور علامہ اقبال کے کلام پر ایک مصلحِ قوم کی تعلیمات کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے ۔

اس تبصرے کا ترجمہ بھی غالباً ''معارف'' میں شائع ہو چکا ہے۔

(۱۸) مسٹر الپسن ــ سابق مدیر ''مسلم آؤٹ لک'' نے بارہا ٹیگور اور اقبال کا مقابلہ کیا ہے اور اقبال کو ٹیگور سے بہمہ وجوہ بہتر ثابت کیا ہے۔

(۱۹) کتاب ''ہندوستان کی بیداری'' مصنفۂ میکنزی میں ایک باب ''جدید علم و ادب کا طلوع'' کے نام سے بھی ہے جس پر سردار جوگندر سنگھ کی تحریر کی رو سے اقبال کا ذکر بھی نہایت وضاحت سے کیا گیا ہے (ص ۱۵۹) - یہ کتاب امریکہ میں ۱۹۲۷ء میں چھپی تھی - اس کا مصنف تمام امریکہ کا نمایندہ بن کر ہندوستان آیا تھا۔

(۲۰) ۱۹۲۵ء کے ''انڈین ریویو'' میں ایک مضمون ''پیامِ مشرق'' کے عنوان سے مسٹر مینن کے قلم سے شائع ہوا۔ مصنّف نے اس میں ''اسرارِ خودی'' کو اخوتِ اسلامی کے موضوع پر ایک الہامی کتاب قرار دیا ہے۔

(۲۱) علامہ اقبال جب کونسل کے انتخابات میں مصروف تھے تو ایک جلسے میں ایک مقرّر نے علامۂ ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے ''مارننگ پوسٹ'' کی ایک تحریر کا بھی حوالہ دیا تھا جس میں لکھا تھا کہ اقبال ایک بہت بڑی طاقت ہے۔

☆ ☆ ☆

۳۵

مسلم لیگ کا اجلاسِ الہ آباد

علامہ اقبال تمام زندگی بحیثیت ایک مسلمان کے مسلمانوں کو تعلیم دیتے رہے ۔ وہ تمام مسلمانوں کو من حیث القوم ایک برادری تصور کرتے تھے ۔ جب کلمۂ توحید تمام دنیا میں ایک الگ اسلامی شعار کا مالک ہے تو اس برادری میں سب شامل ہیں ۔ آپ نے ۱۹۲۷ع میں پنجاب اسمبلی کا جو انتخاب لڑا تھا وہ بھی اسی اصول پر تھا ۔ اس زمانے میں پنجاب کی مسلم آبادی ۵۶ فی صد تھی ۔ اسی نقطۂ نگاہ سے آپ نے ہمیشہ جداگانہ انتخاب کا ساتھ دیا اور اسی اصول پر آپ نے وطن کے تصور کو پسِ پشت ڈال کر اسلام کے واحد جماعتی نظام کو ترجیح دی ۔ ہندوستان کی تقسیم بھی اسی اصول پر ہوئی ۔ آپ نے ''جوابِ شکوہ'' میں کس دکھ کے ساتھ کہا ہے :

یوں تو سیّد بھی ہو ، مرزا بھی ہو ، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو ، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو ؟

اسی اصول پر آپ نے مولانا حسین احمد مدنی کو خطاب کر کے کہا تھا :

بمصطفٰیؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگـر بـہ او نـرسیدی ، تمـام بولہبی است

چنانچہ آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس ۱۹۳۰ء میں جو خطبہ بمقام الہ آباد دیا اس میں مسلمانوں کے تمام عوارض کا علاج اس طرح تجویز کیا:

"... مختصراً، میں نے کوشش کی ہے کہ راستہ واضح کردوں؛ میرے نقطۂ نگاہ سے ہندوستان کے دو مسائل نہایت اہم ہیں؛ برٹش انڈیا کی از سرِ نو تقسیم ہونی چاہیے جس سے فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کیا جائے جو مسلمانانِ ہندوستان کی بہت بڑی خواہش ہے اور مسلمانوں کی دو بڑی جماعتیں مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس چاہتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان اس پر اتفاق نہیں کرسکتے کہ ایسی انتظامی تبدیلیاں کی جائیں جو ان کی اکثریت والی آبادیوں پر اثرانداز ہوں، یعنی جداگانہ انتخابات پنجاب اور بنگال میں ہوں یا مرکز میں تینتیس فی صد نمایندگی دی جائے۔"

اس طرح علامہ نے اپنے اس خطبۂ صدارت میں برٹش انڈیا کی تقسیم کی تجویز پیش کی اور پھر یہ مسئلہ ہندوستان میں سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا۔ یہی تجویز آگے چل کر حضرت قائدِ اعظم کی کوشش سے تقسیمِ ہند کا موجب بن گئی اور پاکستان ظہور میں آگیا۔

اس جلسے میں میں بھی آپ کے ہمراہ تھا اور لاہور سے والنٹیرز کی ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ الہ آباد گئی تھی جس میں چودھری محمد حسین، لعل دین قیصر اور مصطفٰی حیرت وغیرہ شامل تھے۔ الہ آباد میں جب علامہ کی آمد کی خبر شائع ہوئی تھی تو وہاں کے اکثر شعرا نے آپ سے ملنے کی کوشش کی تھی۔ ہم لوگوں نے الہ آباد کا قلعہ اور جمنا و گنگا دریا کی بھی سیر کی تھی۔ اسی زمانے میں آل ایشیا ایجوکیشنل کانفرنس بنارس میں اور آل انڈیا

اوریئنٹل کانفرنس پٹنہ میں ہوئی تھی ۔

جلسۂ الٰہ آباد کے بعد آپ نے ۱۹۳۲ع میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس لاہور کی صدارت بھی کی تھی ۔ چنانچہ اس جلسے میں بھی آپ نے خطبۂ الٰہ آباد کے مسائل کو دہرایا اور ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی فرمائی ۔

۳۶

نورالمشائخ مُلّا شور بازار

جس زمانے میں امیر امان اللہ خاں سابق والیٔ افغانستان اپنے ملک کو خیرباد کہہ کر یورپ جا چکے تھے تو لاہور میں ان کے اس فیصلے کے خلاف مظاہرے ہوئے تھے ۔ لوگوں کی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح واپس تشریف لے آئیں ۔ اس تحریک میں علامہ اقبال سب سے پیش پیش تھے ۔ لاہور میں اس ضمن میں اکثر میٹنگیں بھی ہوتی رہتی تھیں ۔ علامہ نے نہ صرف محمڈن ہال والی میٹنگ میں شرکت کی بلکہ ایک دو جلسوں کی صدارت بھی فرمائی ۔ اس جد و جہد کو جاری رکھنے کے لیے کچھ رقم جمع کرنے کا انتظام بھی کیا گیا ۔ مجھے یاد ہے کہ آن دنوں اسلامیہ کالج لاہور کے ایک طالب علم مسٹر ممتاز مرزا نے بھی اس مہم میں بھرپور حصہ لیا تھا ۔ وہ آج کل غالباً پاکستان گورنمنٹ کے محکمۂ فینانس میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں ۔ اس روپے کی فراہمی کے لیے چھوٹی چھوٹی کاپیاں بھی چھپوائی گئی تھیں جن کا عنوان ''امان اللہ فنڈ'' تھا ۔ راقم نے بھی چندہ دیا تھا جس کی رسید آج بھی کہیں کاغذات میں مل جائے گی ۔ چنانچہ لاہور میں آن دنوں کافی گہما گہمی تھی اور یہ گہما گہمی محض علامہ کی دلچسپی لینے کی وجہ سے تھی ۔ آسی زمانے میں ہم

نے سنا تھا کہ 'ملا' شور بازار سے افغانی حضرات بہت عقیدت رکھتے ہیں اور کافی عزت و اکرام کرتے ہیں ۔ ایک شام جب میں حسبِ معمول علامہ کے ہاں گیا تو میں نے غیر معمولی طور پر دوپہر کے بعد بھی منشی شیخ طاہر دین کو وہاں بیٹھے دیکھا ۔ وہ ہمیشہ دوپہر سے پہلے ہی اپنے فرائض سے فارغ ہو جایا کرتے تھے ۔ معلوم ہوا کہ آج آن کی معرفت علامہ اقبال کی ملاقات 'ملا' شور بازار سے ہونے والی ہے ۔ چنانچہ وقتِ مقررہ پر ہم علامہ کے ہمراہ آن کی موٹر میں فلیمنگ روڈ پر میوہ منڈی کے سامنے "امیر منزل" میں گئے جہاں پر 'ملا' صاحب ٹھہرے ہوئے تھے ۔ راستے میں ہم نے مولانا غلام رسول مہر صاحب کو بھی ہمراہ لے لیا جو آن دنوں اسی سڑک پر رہتے تھے ۔ 'ملا' صاحب اس مکان کے ایک نمبر کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے اور یہ مکان ایک طرح میوہ منڈی والوں کا گودام تھا ۔ 'ملا' شور بازار صاحب نہایت احترام سے علامہ کے ساتھ اصحابِ سرور کے دستور کے مطابق بغل گیر ہو کر ملے اور نہایت اخلاق سے پیش آئے ۔ نشست فرش پر تھی ۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ آپ آردو سمجھتے تو ضرور ہیں مگر آسانی سے گفتگو نہیں کر سکتے ۔ اسی طرح علامہ فارسی زبان کو خوب سمجھتے تھے مگر اس میں آزادانہ گفتگو کے عادی نہ تھے اور کسی قدر گھبراتے تھے ۔ 'ملا' صاحب نے فارسی میں پوچھا کہ آپ فارسی زبان میں گفتگو اچھی طرح کر سکتے ہیں ؟ علامہ نے جواب دیا "قدرے ۔" اس کے بعد تمام گفتگو فارسی زبان میں ہوئی ۔ دورانِ گفتگو میں امان اللہ خاں والیِ افغانستان سے متعلق بھی بات چیت ہوئی ۔ چنانچہ قبائل کی اس سے ناراضگی ، نغانستان میں لوگوں کا اس سے مختلف الرائے ہونا اور خاص طور پر امان اللہ خاں کا یورپین لباس

اور طور طریق سے شغف رکھنا زیر بحث آیا ۔ اس گفتگو میں علم و ادب پر بھی بعض اشارات ہوئے ۔ خاص کر میرزا بیدل کا ذکر ہوا کیونکہ افغانوں کو بیدل کے کلام سے بہت عقیدت ہے ۔ علاوہ ازیں اس ملاقات میں بعض صوفیانہ مسائل بھی حضرت سیّد احمد سرہندی کے حوالے سے زیر بحث آئے ۔ پھر علامہ کی بعض تصنیفات کے متعلق بھی تھوڑی سی گفتگو ہوئی ۔ "ملا" شور بازار اکثر سرہند آتے جاتے رہتے تھے ۔ واضح رہے کہ علامہ مرحوم کو صوفیائے کرام اور علما و صلحا سے ملنے کی ہمیشہ تمنا رہتی تھی اور خود اُن کے مسکن پر ملاقات کر کے خوش ہوتے تھے ۔

۳۷

گاما پہلوان

لاہور شہر کی تاریخ عجیب و غریب ہے ۔ اس پر جس قدر بھی لکھا جائے کم ہے ۔ اس کی تاریخ و ثقافت کے مختلف ادوار میں ایسے ایسے واقعات پنہاں ہیں کہ ان کے ہر پہلو پر ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں ۔ افسوس اس امر کا ہے کہ لوگوں کو اپنی کشمکشِ روزگار سے فرصت ہی نہیں ملتی کہ اس طرف متوجہ ہوں ۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہر کام کے لیے قدرت نے انسان میں کچھ نہ کچھ قابلیت ودیعت کی ہے اور یہی تمام جدوجہد مجتمع صورت میں ملک کی جامع و مانع تاریخ بن جاتی ہے ۔

لاہور میں علامہ اقبال کے زمانے کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جن سے بہت سے سبق آموز نتائج آج بھی اخذ ہو سکتے ہیں ۔ لاہور میں پنجاب لیجس لیٹو کونسل کے انتخابات کا زمانہ (اپریل تا نومبر ۱۹۲۶ء) بہت ہی معرکہ خیز تھا ۔ اس زمانے میں جو کچھ ہوا وہ ابھی تک آنکھوں کے سامنے ہے ۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر بعض احباب نے بہت کچھ لکھا ہے مگر میں اس زمانے کے ایک خاص پہلو پر لکھنے لگا ہوں ؛ وہ یہ ہے کہ حضرت علامہ اقبال نے ہمیشہ مسلمانوں کو من حیث القوم زندہ رہنے اور اپنے پاؤں پر کھڑے

ہونے کی تاکید فرمائی ہے ۔ انھوں نے کبھی مخلوط انتخابات کی ہاں نہیں بھری اور غیروں کو اپنے معاملات میں کبھی دخل دینے کی اجازت نہیں دی ۔

جب انتخابات کا ہنگامہ فرو ہوا اور علامہ لاہور کی پبلک سے پہلے سے زیادہ مانوس ہوگئے تو اہلِ لاہور نے ہنگامی طور پر ایک جلسے کا انتظام کیا جس کی صدارت کے لیے انھوں نے علامہ ہی سے درخواست کی ۔ اس جلسے کی غرض و غایت یہ تھی کہ مسلمانوں میں کاروبار سنبھالنے کا شعور پیدا کیا جائے کیونکہ مسلمان اقتصادی طور پر خاصے پریشان تھے اور ہندوؤں کی لوٹ کھسوٹ اور اقتصادی برتری سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ جب علامہ نے صدارت کی درخواست قبول فرما لی تو جلسے کا انتظام حسبِ دستور موچی دروازے کے باہر باغ میں کیا گیا ۔ اگرچہ یہ جلسہ کسی خاص انتظام اور اہتمام سے منعقد نہیں کیا گیا تھا اور ایک طرح ہنگامی جلسہ تھا مگر پھر بھی کم و بیش پچیس ہزار مسلمان جمع ہوگئے تھے ۔ علامہ کے سامنے جلسے کا مختصر پروگرام بھی رکھ دیا گیا جو صرف مقررین کے ناموں پر مشتمل تھا ۔ سب سے پہلے ایک صاحب نے تلاوتِ قرآن کے بعد نظم بڑھی ۔ پھر ایک اور شاعر غالباً فیض نے پنجابی زبان کی ایک نظم پڑھی اور مختلف مقررین نے تقریریں کیں ۔ اس کے بعد ان صاحب کو بلایا گیا جس نے علامہ کے خطبۂ صدارت سے پہلے تقریر کرنا تھی ۔ کئی بار ان کا نام پکارا گیا مگر وہ سٹیج پر نہیں آئے ۔ اتنے میں سٹیج کے دائیں طرف لوگوں میں ذرا ہلچل پیدا ہوئی تو علامہ نے ادھر دیکھا کہ موصوف شاید اس طرف سے آ رہے ہیں مگر وہ وہاں بھی نہیں تھے ۔ پھر اگلی صف میں کھڑے ہوئے لوگوں میں سے ایک صاحب نے بلند آواز سے پنجابی زبان میں ڈاکٹر صاحب

کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب ! وہ صاحب ادھر بھی نہیں ہیں ۔ علامہ نے غور سے دیکھا تو یہ ہمارے ملک کے مایۂ ناز پہلوان ، گاما پہلوان تھے ۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً ان سے کہا کہ اگر وہ نہیں ہیں تو آپ ہی سٹیج پر تشریف لے آئیں ۔ پہلوان صاحب علامہ کے ارشاد کی تعمیل میں جب سٹیج پر آ گئے تو علامہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو تلقین فرمائی کہ گاما پہلوان صاحب ہمارے ملک کے نامور پہلوان ہیں لٰہذا آپ ان کی تقریر سکون سے سنیں ۔ اب تو پہلوان صاحب بہت گھبرائے مگر انھوں نے خود پر قابو پا کر اپنی سیدھی سادی پہلوانی زبان میں پہلے لوگوں کو ورزش اور کسرت کرنے کی تلقین کی اور پھر نہایت مختصر الفاظ میں یہ دردمندانہ اپیل کی کہ بھائیو ! سودا سلف مسلمان دکان داروں سے لیا کرو ۔

آخر میں علامہ نے جو صدارتی تقریر فرمائی وہ کچھ یوں تھی :

''اس جلسے میں سب سے زیادہ جو تقریر مجھے پسند آئی ہے وہ گاما پہلوان کی ہے ۔ ان کے الفاظ ایک سچے مسلمان کے الفاظ ہیں جو نہایت موثر ہیں ۔ آپ لوگوں کو ان پر عمل کرنا چاہیے تاکہ ملک کے لوگوں کی صحت اور مسلمانوں کی اقتصادی حالت بہتر ہو جو نہایت ضروری ہے ۔''

ان الفاظ کے بعد علامہ نے اپنی تقریر ختم کردی اور جلسہ اختتام پذیر ہوا ۔

☆ ☆ ☆

۳۸

پروفیسر براؤن

ہندوستان کے ایک پندرہ روزہ رسالے ''آج کل'' (بابت ۱۵ جون ۱۹۴۴ع) میں عیسیٰ صادق صاحب نے "پروفیسر براؤن" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو ہر اُس شخص کے لیے ، جو فارسی زبان و ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہے ، قابلِ توجہ ہے۔ مضمون نگار کے نقطۂ نظر سے ڈاکٹر براؤن کی مساعیِ جمیلہ نے ایرانیوں کے علم و ادب کو چارچاند لگا دیے ہیں اور ان کا محقّقانہ طرزِ بیان فارسی زبان کے مطالعے کی ایک خاص رغبت پیدا کرتا ہے۔ آج جو ایرانی فضلا اپنی زبان کی ترقی کے لیے اس کی تحقیق و تدقیق میں منہمک نظر آتے ہیں ، مضمون نگار کے نزدیک یہ اُسی شخص کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور اس سے خاصا فیضان حاصل کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا امور سے قطع نظر میں صرف یہ حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں کہ سوائے مرزا محمد عبدالوہاب قزوینی یا چند اور اشخاص کے کوئی اہلِ علم نظر نہیں آتا جس سے براؤن جیسے محقّق نے ''تاریخ ادبیات و زبانِ فارسی'' کے ضمن میں استفادہ کیا ہو۔ البتہ علامہ اقبال کے اسلامی نظریات اور مشہور محقق و مورخ مولانا شبلی کی کتاب ''شعر العجم'' سے اس نے ضرور استفادہ کیا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتا ہوں ۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح پروفیسر براؤن نے علامہ کے نظریات کا حوالہ دیا ہے یا دوسروں کے نظریات سے اقبال کے فلسفے کا موازنہ کیا ہے ، اسے بیان کیا جائے ۔

جب براؤن کی مذکورہ کتاب ''تاریخِ ادبیاتِ فارسی'' کی پہلی جلد شائع ہوئی تو اس وقت اقبال انگلستان کی مشہور یونیورسٹی کیمبرج میں زیرِ تعلیم تھے ۔ اقبال نے یہ کتاب دیکھی تو انھوں نے اس پر ایک فاضلانہ تبصرہ بھی کیا جو شائع ہو گیا ۔ یہ اپنی نوعیت کی امتیازی علمی خدمت تھی اور اقبال نے اپنے تبصرے میں ایرانیوں کو بطور خاص مخاطب کیا تھا ۔

جب اس کتاب کی چوتھی جلد شائع ہوئی تو براؤن نے 'ملا' صدرا کے سلسلے میں اقبال کے نظریات کو بھی بیان کیا ہے ۔ چنانچہ 'ملا' صدر الدین محمد بن ابراہیم شیرازی ('ملا' صدرا) کے سوانح حیات بیان کرنے کے بعد براؤن لکھتا ہے :

> ان کی تصنیف "اسفار" کے دیباچے کے بعض جملوں سے مترشح ہوتا ہے کہ غالی اور قدامت پسند 'ملاؤں کے ہاتھوں انھیں بہت ایذائیں اٹھانی پڑیں ۔ نیز یہ کہ شیخ احمد احسائی بانیِ فرقۂ شیخیہ نے ان کے دو تصنیفوں 'حکمت العرشیہ' اور 'مشاعر' پر تفسیریں بھی لکھی ہیں ۔ نظربایں حالات غالباً شیخ محمد اقبال کا یہ قول صحیح ہے کہ : 'صدرا کا فلسفہ ہی ابتدائی بابی مابعدالطبیعیات کا ماخذ ہے' ۔ (ارتقاے مابعدالطبیعیات در ایران ، انگریزی ، لندن ۱۹۰۸ع ، ص ۱۷۵)
>
> آگے چل لکھتے ہیں :

''اس عجیب و غریب فرقے کے فلسفے کا نقطۂ آغاز تلاش کرنا ہو تو شیخیوں کے شیعہ فرقے پر نظر ڈالنی چاہیے جس کا بانی شیخ احمد ، مُلاّ صدرا کے فلسفے کا پُر جوش طالب علم تھا اور جس پر اُس نے کئی تفسیریں بھی لکھی ہیں۔''

مُلاّ صدرا کے نظریات پر براؤن نے مفصّل روشنی ڈالی ہے۔ ہمیں چونکہ صرف علامہ اقبال کی علمی عظمت بیان کرنا ہے لہٰذا ہم اس بحث کو نظر انداز کرتے ہوئے براؤن کا وہ بیان نقل کرتے ہیں جس میں اس نے علامہ کے نظریات کی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''اس سے کسی قدر مختصر مگر نسبتاً زیادہ سنجیدہ بیان شیخ محمد اقبال کا ہے جو پہلے اسی کیمبرج یونیورسٹی میں ڈاکٹر میک ٹگارٹ کے تلمیذ تھے اور اب ہندوستان میں ایک مشہور اور جدت طراز مفکّر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ یہ بحث ان کی کتاب ''ارتقاے مابعدالطبیعیات در ایران'' کے صفحہ ۱۵۷ پر موجود ہے جو اسلامی فلسفے کی تاریخ پر ایک منفرد تصنیف ہے۔ آنھوں نے مُلاّ صدرا کی نسبت زمانۂ حال کے فلسفی حاجی مُلاّ ہادی سبزواری کا ذکر زیادہ تفصیل سے کیا ہے۔ وہ مُلاّ ہادی کو مُلاّ صدرا کا معنوی جانشین سمجھتے ہیں۔''

اس کے علاوہ براؤن نے ایک فٹ نوٹ میں یہ بھی لکھا ہے:

''محمد اقبال نے اپنے ذاتی خیالات ایک مختصر فارسی مثنوی 'اسرار خودی' میں بھی ظاہر کیے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ، آنھوں نے نطشے کے خیالات کو مشرقی جامہ پہنایا ہے۔ یہ مثنوی یونیورسٹی پریس لاہور سے

لیتھو میں چھپی ہے ۔ میرے دوست اور شریکِ کار ڈاکٹر نکلسن نے اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور مقدمہ و حواشی بھی لکھے ہیں ۔"

پروفیسر براؤن نے خود بھی نکلسن کے متذکرہ بالا "ترجمۂ اسرارِ خودی" پر تبصرہ کیا تھا جو ۱۹۲۱ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل (ص ۱۴۷) میں شائع ہوا تھا ۔ اس میں براؤن نے نہ صرف اپنے الفاظ کی بلکہ جہاں کہیں ڈاکٹر نکلسن کو ذرہ بھر بھی شبہ ہوا ہے ، اس کی بھی کامل طور پر تردید کردی ہے ۔ اسے چونکہ نکلسن کے تبصرۂ "پیام مشرق" کی ذیل میں بیان کردیا گیا ہے لہٰذا یہاں اعادے کی ضرورت نہیں ۔ پھر اقبال نے خود بھی لکھنو کے اخبار "نیو ایرا" میں ۱۹۱۶ء میں "جمہوریت اسلام" کے عنوان کے تحت ایک مضمون لکھا تھا جس میں نطشے کے فلسفے پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے ۔ آنھوں نے اسلامی نقطۂ نگاہ اور نطشے کے نظریات کو نہایت وضاحت سے بیان کردیا ہے ۔

سید سلیمان ندوی مرحوم ہمارے ملک کے ایک مشہور و معروف دانشور اور اہلِ علم تھے ۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ان کی رائے بھی پیش کردی جائے ۔ اقبال اور نطشے کے نظریات میں یکسانیت کا دعویٰ کرنے والوں کو آنھوں نے نہایت مدلّل جواب دیا ہے ۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۳ء کے 'شذرات' میں لکھتے ہیں :

"واضح رہے کہ علامہ اقبال مرحوم ہی ایک ایسے فاضلِ زمانہ اور مردِ میدان تھے ، جنھوں نے فلسفۂ مغرب و مشرق کا خالصتاً اسلامی نقطۂ نگاہ سے صرف مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ اس پر کماحقہ تنقید بھی کی ہے جس کا ہر لفظ صداقتِ اسلام پر گواہ ہے ۔ افسوس تو اس امر کا ہے

کہ ہمارے ملک کے بعض مبصّرین نے ، جن کو اسلامی
تاریخ یا فلسفے کا پورا علم نہیں ہے ، اقبال پر یہ تنقید
بے سود کی ہے کہ اقبال نے صرف مغربی فلسفیوں کے نظریات
کو اپنی زبان ـــــ یعنی فارسی یا اردو ـــــ میں پیش کردیا
ہے ۔ یہ ان کی کور اندیشی ہے کیونکہ اقبال نے ان اقوال
کو اصل پیش کرنے کے بعد پھر اسلامی نقطۂ نظر سے
عوام کو ان سے آگاہ کیا ہے ۔ اس سے بالوضاحت یہ معلوم
ہو جاتا ہے کہ ان ہر دو ، یعنی اسلامی اور غیر اسلامی ،
نقطۂ نگاہ میں کیا فرق ہے ۔ افسوس اس امر کا ہے کہ
لوگ ذرا بھی وسعتِ نظر سے کام نہیں لیتے ۔ وہ اسلامی
نقطۂ نگاہ کا مطالعہ کیے بغیر صرف غیراسلامی نظریات ہی
کو پیش کرتے رہتے ہیں ۔''

عیسیٰ صادق صاحب نے براؤن پر اپنے متذکرہ مضمون میں
ادبیاتِ فارسی کے سلسلے میں براؤن کی خدمات کو بہت سراہا ہے
مگر ان کا فرض تھا کہ وہ کسی معاصر ایرانی فاضل کو بھی پیش کرتے
جس کے علم و فضل سے براؤن نے استفادہ کیا ہو ، جس طرح اس نے
اقبال اور شبلی سے کیا ۔ شبلی کی کتاب ''شعر العجم'' کے متعلق
اس نے اعتراف کیا ہے کہ یہ کتاب بذاتِ خود ایک علمی کارنامہ ہے
جسے فارسی زبان میں بھی ترجمہ کیا جا چکا ہے ۔ اگرچہ اس کے بعد
ایرانیوں نے اس موضوع پر متعدد کتب تصنیف کی ہیں اور آج ایران
میں علما و فضلا کی ایک ایسی جماعت وجود میں آ چکی ہے جس کے
علمی کارنامے بطور سند پیش کیے جا سکتے ہیں مگر یہ حقیقت بھی
نا قابلِ تردید ہے کہ یہ فیضان انھیں باہر سے حاصل ہوا ۔

جب ۱۹۲۶ع میں پروفیسر براؤن کا انتقال ہوا تو دنیا بھر کے

اہلِ علم نے اسے نقصانِ عظیم قرار دیا اور تعزیتی جلسے منعقد کیے - اس کے کچھ ہی عرصے بعد کیمبرج یونیورسٹی نے ڈاکٹر نکلسن کی معرفت علامہ اقبال سے درخواست کی کہ براہِ کرم پروفیسر براؤن کی تاریخِ وفات کا قطعہ لکھ کر ارسال فرمائیے - جب یہ خط حضرتِ علامہ کو ملا تو انھوں نے اسی وقت راقم سے تاریخ نکالنے والی کتاب منگوا کر ایک قطعہ تیار کیا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

نازشِ اہلِ کمال ای - جی - براؤن
فیضِ او در مغرب و مشرق عمیم
مغرب اندر ماتمِ او سینہ چاک
از فراقِ او دلِ مشرق دونیم
تا بہ فردوسِ بریں ماویٰ گرفت
گفت ہاتف "ذالک الفوز العظیم"

۱۹۲۶ء

اس قطعے کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ بیسویں صدی کی تخلیق نہیں ہے - اس کا انداز ان قطعات کا سا ہے جو تین سو سال پہلے لکھے جاتے تھے اور شاہی درباروں میں پیش کیے جاتے تھے - بہرحال جب قطعہ تیار ہو گیا تو پہلے "مرقعِ غالب" کے کاتب منشی اسداللہ مرحوم سے قدیم وصلیوں کی طرز پر نہایت خوش خط لکھوایا گیا اور پھر عبدالرحمٰن چغتائی نے نقاشی کے قدیم طریقے پر اسے مطلّی و مذہّب کیا - جب اس شان کے ساتھ قطعہ تیار ہو گیا تو بہت سلیقے سے پیک کرکے راقم ہی اسے ڈاک خانے لے گیا اور کیمبرج یونیورسٹی کے پتے پر ڈاکٹر نکلسن کے نام بھیج دیا گیا - آج بھی یہ قطعہ پروفیسر براؤن کی یاد میں کسی نمایاں مقام پر آویزاں ہوگا۔

☆ ☆ ☆

۳۹

علامہ سیّد سلیمان ندوی اور علامہ اقبال

ہم نے ایک الگ عنوان (''لاہور کی علمی مجالس'') کے تحت بھی لاہور میں ۱۹۲۷ء میں علامہ سید سلیمان ندوی کی آمد اور علامہ کے ساتھ علمی مذاکرات کو بیان کیا ہے۔ جب ہم ''اقبال نامہ'' کی جلد اول پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کے خطوط بنام علامہ سید سلیمان ندوی (ص ۱۷ تا ص ۲۰۰) میں کئی ضروری علمی اور اسلامی مسائل و واقعات کو خطوط کے ذریعے طے کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ علامہ سید سلیمان ندوی نے اقبال کے ہمراہ افغانستان کا سفر بھی کیا تھا جسے ہم نے سفرِ افغانستان کے تحت بیان کیا ہے۔ غرض کہ علامہ سید سلیمان ندوی کی شخصیت کئی لحاظ سے علامہ اقبال کے نزدیک بہت اہم تھی۔ سلسلۂ خط و کتابت نومبر ۱۹۱۶ء سے شروع ہو کر اگست ۱۹۳۶ء تک پھیلا ہوا ہے۔

علامہ اقبال کی جس قدر نظمیں یا تصنیفات معرضِ وجود میں آئیں ان سب پر علامہ سید سلیمان کا بے لاگ تبصرہ موجود ہے۔ سب سے پہلے ''معارف'' کے اپریل ۱۹۱۸ء کے شمارے میں اقبال کی مثنوی ''رموزِ بے خودی'' پر تبصرہ ہے جس کا ذکر آپ نے اپنے ۲۸ اپریل

۱۹۱۸ء کے خط میں بھی کیا ہے ۔ اس کے بعد آپ نے ''معارف'' کے لیے چند اشعار بھی ارسال کیے تھے ۔ علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ علامہ سید سلیمان ندوی کسی طرح لاہور کے کسی ادارے سے منسلک ہو جائیں تاکہ علامہ کو ان کی صحبت میسر رہے مگر یہ سلسلہ نہ ہو سکا ۔ ان خطوط میں بصیری کے قصیدۂ بردہ کا ذکر بھی ہے اور دیگر شعرا کا بھی ۔ اس ضمن میں مولوی ذوالفقار علی دیوبندی کا بھی ذکر ہے جنھوں نے بصیری کے قصیدے کا ترجمہ مع شرح کیا تھا ۔ اسی طرح مولوی اصغر علی روحی کا بھی ذکر ہے جنھوں نے بصیری کے قصیدے کا ترجمہ طبع کیا تھا ۔ ان خطوط میں مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کا بھی ذکر ہے جنھوں نے طرفہ کا ایک مقبول عربی شعر مقامِ مالطہ سے ارسال کیا تھا (کیونکہ حضرت مولانا محمود حسن آن دنوں مالطہ میں اسیر تھے) ۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی ذکر ہے جو ۱۹۱۹ء میں رانچی میں نظربند تھے ۔ اسنادِ اشعار کے ضمن میں مولانا گرامی جالندھری کا بھی ذکر ہے اور ۲۹ مئی ۱۹۲۲ء کے خط میں مفتی عالم جان اور نظم ''خضر راہ'' کا ذکر بھی ہے ۔ ۵ جولائی ۱۹۲۲ء کے خط میں علامہ کی اپنی تصنیف ''پیامِ مشرق'' کا ذکر ہے جس پر علامہ سید سلیمان ندوی نے ''معارف'' میں تبصرہ لکھا تھا ۔

۲۲ اگست ۱۹۲۲ء کے خط میں حکیم برکات احمد کے رسالہ ''زمان'' کا ذکر ہے جس کے بعد علامہ اقبال کے ہاں ایک نیا سلسلۂ تحقیق شروع ہوتا ہے ۔ اس خط میں امام رازی کی کتاب ''مباحثِ مشرقیہ'' اور ''شرح مواقف'' کا بھی ذکر ہے ۔ ان کتب کی طرف سید سلیمان ندوی نے علامہ کی توجہ دلائی تھی ۔ ۲۴ فروری ۱۹۲۳ء کے خط میں علامہ نے ''پیامِ مشرق'' کے دوسرے ایڈیشن

کا ذکر کیا ہے اور آپ نے منطقِ استقرائی کے متعلق لکھا ہے کہ تحقیق کر رہا ہوں ۔ علامہ نے پنے مکتوب مورخہ ۱۸ اگست ۱۹۲۴ع میں امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی کی شائع کردہ کتاب ''مسلمانوں کے نظریات متعلقۂ مالیات'' کا ذکر کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ ''اجماعِ امّت نصِ قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے'' ۔ علامہ کی خدمت میں یہ کتاب مَیں نے وصول کر کے پیش کی تھی جو امریکہ سے چودھری رحمت علی نے ارسال کی تھی ۔ یہ بات کتاب کے صفحہ ۹۱ پر لکھی ہے (ویسے حقیقت یہ ہے کہ اجماع سے نصِ قرآنی کے منسوخ ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں ہے ۔ امریکی مصنف نے یہ غلط لکھا ہے ۔ البتہ یہ معتزلہ کا قول ہو سکتا ہے) ۔

اسی خط سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے بعض امور کے ضمن میں مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی لکھا تھا ۔ پھر علامہ نے اُن کو اپنے اگلے خط میں اجماع کے ضمن میں لکھا ہے اور کئی سوال پیدا کیے ہیں ۔ متذکرہ امریکی کتاب کے متعلق بھی لکھا ہے ۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سید سلیمان ندوی نے آپ سے عنایت اللہ مشرق کے متعلق بھی دریافت کیا جس پر علامہ نے لکھا کہ وہ امرتسر کے رہنے والے ہیں اور انھوں نے ریاضی کا اعلیٰ امتحان پاس کیا ہے ۔ اس کے بعد فقہِ اسلامی سے متعلق بھی سوال کیا ہے ۔ سید سلیمان نے اپنے ایک طویل خط میں ، جو مسئلۂ اجتہاد سے متعلق تھا ، خصوصیت سے حدیث ''لاتسبّوا الدھر'' پر گفتگو کی ہے ۔ نیز علامہ کے مدراس کے لیکچروں کا تذکرہ بھی موجود ہے ۔ ''حجۃ اللہ البالغہ'' پر بھی گفتگو ہوئی اور علامہ نے لکھا کہ میں امام رازی کی ''مباحثِ مشرقیہ'' دیکھ رہا ہوں ۔ علامہ نے لکھا ہے کہ رسالہ ''اتقان فی ماھیۃ الزمان'' مل گیا ہے ۔ یہ ٹونک سے دستیاب ہوا تھا اور اسے مولانا برکات احمد نے

لکھا تھا ۔ آپ نے مولانا سیّد سلیمان کو مشورہ دیا کہ ایک کتاب دارالمصنفین کی طرف سے ''حکمائے اسلام'' پر شائع ہونی چاہیے ۔ اسی طرح آپ نے سید صاحب سے مُلاّ بہاری کی کتاب ''جوہر الفرد'' کا بھی تذکرہ کیا ۔

مباحثِ مشرقیہ :

علامہ سید سلیمان ندوی نے اقبال کو مشورہ دیا تھا کہ کسی طرح امام فخرالدین رازی کی کتاب ''مباحثِ مشرقیہ'' کو دیکھیے ۔ چنانچہ ہم نے یہاں لاہور میں یہ کتاب فراہم کر لی مگر جب علامہ نے اس کو دیکھا تو وہ بہت ہی مشکل کتاب تھی ۔ اس پر آپ نے سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ آپ اس کا ایک ملخّص تیار کر کے ارسال کر دیں ۔ ادھر علامہ کو اس کتاب کے مطالب کی اپنے مدراس کے لیکچروں کی تیاری کے ضمن میں سخت ضرورت تھی ، اُدھر سید صاحب کسی اور کام میں مصروف تھے ۔ چنانچہ انھوں نے مجھے ۲۵ مارچ ۱۹۲۸ء کو لکھا :

> ''محترم ! داست معالیکم ۔ میں اس وقت مرکز سے دور ہوں ۔ ڈاکٹر صاحب کے دو والا نامے میرے پاس بھی آئے ہیں ۔ میں یکم اپریل کو اعظم گڑھ پہنچ سکوں گا ۔ ڈاکٹر صاحب نے امام رازی کی ''مباحثِ مشرقیہ'' کا خلاصہ طلب فرمایا ہے ۔ اس کی تعمیل بھی وہیں سے ہو سکے گی ۔ ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دے دیجیے ۔

چنانچہ میں نے خود ایک نسخہ ''مباحثِ مشرقیہ'' کا کسی طرح حاصل کر لیا جو دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کا مطبوعہ تھا ۔ اس کے ضروری حصے کا لفظی ترجمہ مولوی سعید احمد اکبر آبادی

صدر مدرس مدرسۂ عالیہ کلکتہ سے مل کر اس طرح تیار کیا گیا کہ وہ املا کراتے تھے اور راقم لکھتا جاتا تھا ۔ اسی سے علامہ نے استفادہ کیا اور مزید استفسار وہ سید مولوی طلحہ وغیرہ سے کر لیتے تھے ۔

۱۰ دسمبر ۱۹۳۳ء کو علامہ نے سیّد صاحب کو افغانستان کے سفر سے متعلق لکھا ۔ اس سفر میں سید راس مسعود بھی ہمراہ تھے ۔ آپ نے افغان قونصل کا دعوت نامہ بھی ارسال کیا اور لکھا کہ پاسپورٹ بنوا لیں ۔ سید راس مسعود نے طے کیا کہ لاہور سے ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو چلیں گے ۔ چنانچہ یہ لوگ جب افغانستان سے واپس آئے تو سید سلیمان ندوی نے ''سفر نامۂ کابل'' بھی لکھا تھا جسے علامہ اقبال نے پسند فرمایا تھا ۔ اس کے بعد علامہ علاج کے لیے بھوپال چلے گئے کیونکہ ۱۹ جولائی ۱۹۳۵ء کا خط بھوپال سے لکھا گیا ہے ۔ آخری خطوط قادیانیوں سے متعلق ہیں اور موسیٰ جار اللہ کی کتاب کا ذکر ہے ۔ ۷ اگست ۱۹۳۶ء کے بعد کوئی خط سید سلیمان ندوی کے نام نہیں لکھا گیا ۔

☆ ☆ ☆

۴۰

علامہ سید سلیمان ندوی لاہور میں

انھی صفحات میں بیان کیا گیا ہے کہ سید سلیمان ندوی سے خط و کتابت کے ذریعے علامہ اقبال کے علمی روابط نومبر ۱۹۱۶ء سے شروع ہوئے جو اخیر دم تک قائم رہے۔ تاہم شخصی ملاقات ۱۹۲۷ء سے قبل نہیں ہو سکی۔ پھر جب سید سلیمان ندوی انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لائے تو ان کی علامہ سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ اس موقع پر جو علمی مجالس ہوئی تھیں وہ لاہور کی علمی فضا میں یادگار ہیں۔ اس سے پیشتر بارہا سید صاحب نے ''معارف'' میں علامہ کی بعض تصنیفات پر تبصرہ کیا تھا۔ جب لاہور کی علمی سرگرمیوں کی مفصّل تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کا حصہ بہت نمایاں ہوگا۔

سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۷ء کے جلسۂ انجمنِ حمایتِ اسلام میں شرکت کی تھی جو اپریل کے مہینے میں (۱۵ تا ۱۷ اپریل) اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں مغربی دیوار کے ساتھ ہوا تھا۔ ان کا قیام ''زمیندار'' کے دفتر میں تھا۔ راقم نے بھی اس میں شرکت کی تھی۔ یہ انجمن کا بیالیسواں سالانہ جلسہ تھا۔ چنانچہ ۱۵ اپریل کی صبح میں علامہ کے ہاں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں حاضر ہوا تو حسب عادت

آپ نے پوچھا ”آج کیا خبر ہے ؟“ یہ علامہ کا معمول تھا کہ جب میں حاضر ہوتا تو میرے سلام کرنے سے پہلے ہی وہ پوچھتے کہ ”ماسٹر صاحب ! آج کیا خبر ہے ؟“ راقم کو کبھی یہ موقع نہیں ملا کہ میں آپ کو پہلے سلام کر سکا ہوں - میرے پہنچنے پر فوراً علی بخش کو پکارا کر کہا کہ ”ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے -“ (اس زمانے میں ایک شخص علم الدین ان کا ڈرائیور تھا جو باغبانپورہ میں رہتا تھا - پہلے وہ میاں خاندان کا موٹر ڈرائیور رہ چکا تھا اور بعد میں بس سروس میں چلا گیا تھا) - چنانچہ علامہ صاحب اور راقم موٹر میں بیٹھ کر ”زمیندار“ کے دفتر میں صبح ۹ - ۱۰ بجے کے قریب پہنچے - یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک ”زمیندار“ کو چھوڑ کر اپنا ذاتی اخبار ”انقلاب“ اسی مہینے لاہور سے جاری کر چکے تھے - چنانچہ میں اور علامہ اس مکان کی اوپر کی منزل میں گئے جہاں سیّد صاحب کا قیام تھا - اختر علی خاں صاحبزادۂ مولانا ظفر علی خاں نے بتایا کہ سید صاحب ایک الگ کمرے میں فروکش ہیں - اس وقت مولانا ظفر علی خاں کام میں مصروف تھے - سیّد صاحب سے ملاقات ہوئی تو علامہ اور سید صاحب نہایت اخلاق اور تپاک سے ملے - راقم کا بھی علامہ نے تعارف کرایا - ہم قریباً ایک گھنٹے تک وہاں رہے اور تمام وقت علمِ دین اور فلسفۂ اسلام کے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی - ان کی زیادہ توجہ امام رازی کی کتاب ”مباحثِ مشرقیہ“ پر مرکوز تھی کیونکہ آن دنوں علامہ اقبال کا موضوعِ مطالعہ بطورِ خاص مکان و زمان کی بحث تھی -

اس مختصر سی ملاقات کے دوران میں علامہ نے سید صاحب کو اپنے ہاں بعدِ نمازِ مغرب دعوتِ طعام دی جو سید صاحب نے

قبول فرما لی ۔ ساتھ ہی ان کے میزبان مولانا ظفر علی خاں کو بھی مدعو کیا ۔ جب ہم وہاں سے واپس آنے لگے تو سید صاحب کو بھی اسی موٹر میں اپنے ہمراہ بٹھا کر انجمنِ حمایتِ اسلام کی جلسہ گاہ تک لائے کیونکہ سید صاحب کو انجمن کے جلسے میں تقریر کرنا تھی ۔ چنانچہ علامہ مجھے اور سید صاحب کو وہاں چھوڑ کر خود اپنے گھر چلے گئے اور ہم نے جلسۂ انجمن میں شرکت کی ۔ جلسے کا ماحول بہت ہی پُر رونق تھا اور سامعین سے تمام جلسہ گاہ قریب قریب بھری ہوئی تھی ۔ سید سلیمان ندوی کی تقریر کا موضوع تھا ''عہدِ رسالت میں اشاعتِ اسلام'' جس کا خلاصہ انجمن حمایت اسلام کے جلسۂ ۱۹۲۷ع کی روئداد میں صفحہ ۳۲ پر بعنوان ''مولانا سید سلیمان ندوی کی تقریر'' طبع ہو چکا تھا ۔ یہ تقریر ایک گھنٹے کی تھی جسے سامعین نے نہایت دل جمعی سے سنا تھا ۔ رانا نصراللہ خاں نو مسلم نے اس جلسے کی صدارت کی تھی ۔ میں آخر تک جلسے میں موجود رہا کیونکہ بعدِ تقریر سید صاحب کو اُن کے مستقر پر چھوڑ کر آنا میرے ذمے تھا ۔

جیسا کہ ذکر ہوا ، اسی شب سید صاحب کی علامہ اقبال کے مکان پر دعوت تھی ۔ اس دعوت میں چودھری محمد حسین ، مولانا ظفر علی خاں ، راقم الحروف ، خواجہ سلیم ، مولانا غلام رسول مہر ، محمد دین تاثیر اور مولانا عبدالمجید سالک شریک ہوئے تھے ۔ یہ دعوت بہت ہی پُرتکلف اور کامیاب تھی ۔ کافی دیر تک علمی مذاکرہ ہوتا رہا ۔ چنانچہ علامہ عنایت اللہ مشرقی کی تالیف ''تذکرہ'' کا ذکر ، بحثِ مکان و زمان اور شعر و شاعری پر بات چیت ہوتی رہی ۔ چودھری محمد حسین مرحوم نے بعض نئے مسائل پر گفتگو کی اور پنجاب کی علمی سرگرمیوں کو سراہا گیا ۔ آخر میں امام فخرالدین رازی کی کتاب

"مباحثِ مشرقیہ" پر اس علمی مجلس کا اختتام ہوا اور ہم سید سلیمان صاحب اور مولانا ظفر علی خاں کو علامہ اقبال کی موٹر میں ان کے مکان پر چھوڑ کر واپس ہوئے۔

علامہ اقبال کی اسی دعوت میں سیّد صاحب کو خواجہ سلیم نے اپنے مکان پر (واقع کوچہ کوٹھی داراں کشمیری بازار ، پرانی کوتوالی کے قریب) دعوتِ طعام دی جو اتوار کے دن ۱۷ اپریل ۱۹۲۷ع کو بوقتِ دوپہر طے پائی ۔ اس دعوت میں دراصل سید صاحب کو چند علمی مخطوطات دکھانا مقصود تھا جو خواجہ سلیم سابق پروفیسر انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور کے ہاں محفوظ تھے ۔ اس دعوت میں مندرجہ ذیل حضرات شریک ہوئے : پروفیسر حافظ محمود شیرانی ، پروفیسر شیخ محمد اقبال اورینٹل کالج ، پروفیسر سید طلحہ ، خواجہ عبدالوحید ، ملک عنایت اللہ ، ملک محمد امین ایڈووکیٹ ، ملک لطیف سٹیشن ماسٹر لاہور ، مولانا ظفر علی خاں ، چودھری محمد حسین ، ڈاکٹر سید عبداللہ ، ابوالخیر عبداللہ ، مسٹر بشیر بھٹی (بھٹی بوٹ ہاؤس ڈبی بازار) ، ملک لال دین قیصر ، مولانا غلام رسول مہر ، مولانا عبدالمجید سالک ، بابو عبدالماجد ، علامہ سر محمد اقبال ، سید سلیمان ندوی ، شیخ عبدالرشید اور سید واجد علی شاہ ایڈوکیٹ وغیرہ۔

خواجہ سلیم کے ہاں کھانا بہت ہی پُرتکلف ، لذیذ اور انواع و اقسام کا تھا جسے لاہور کے مشہور باورچی پھجّو (فضل الدین) نے زیرِ ہدایت خواجہ سلیم ، مسٹر بشیر اور شیخ رشید تیار کیا تھا۔ یہ دعوت تو شاندار تھی ہی ، اس میں شامل احباب کی گفتگو بھی علمی اعتبار سے بہت ہی یادگار تھی ۔ کھانے کے دوران میں بے شمار لطیفے ہوئے اور کچھ فیصلے بھی ہوئے جو مختصر طور پر یہاں درج

کیے جاتے ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں صاحب نے فرمایا کہ اخبار ''زمیندار'' میں ''افکار و حوادث'' کے عنوان سے لطائف و حقائق لکھے جاتے تھے جو عام طور پر سالک لکھتے تھے۔ وہ اس عنوان کو اپنے نئے اخبار ''انقلاب'' میں اختیار کر چکے ہیں۔ تاہم ''زمیندار'' میں بھی یہی رسم و روایت کسی اور عنوان سے جاری رہنی چاہیے۔ مہر و سالک اور علامہ اقبال بھی موجود تھے۔ سب نے اس بحث میں حصہ لیا اور اس موضوع پر لطائف بھی ہوئے۔ آخر میں سید سلیمان ندوی نے ممالکِ اسلامیہ کے بعض اخبارات اور سب سے بڑھ کر موضوع کو مدِ نظر رکھ کر ایک عنوان ''فکاہات'' تجویز کیا جو ''زمیندار'' میں آخر تک قائم رہا۔ ضعیف راویوں پر گفتگو ہو رہی تھی کہ علامہ نے بطورِ تفنّن کہا کہ ہمارا راوی (دریائے راوی) بھی اب بہت ضعیف ہو گیا ہے۔ پھر لطیفہ و لطائف کے ضمن میں سید عبداللہ نے مُلاّ علی بن حسین واعظ کاشفی کی کتاب ''لطائف الطوائف'' کا ذکر کیا جس پر علامہ نے ''لطائف الطوائف'' کے الفاظ کو ذومعنی بنا دیا اور کہا کہ مُلاّ کاشفی کو کیا خبر کہ ''الطوائف'' کیا شے ہے۔ اس پر احباب میں خوب قہقہے لگے۔ یہ پُرلطف محفل کھانے کے بعد دیر تک جمی رہی اور اس کے چرچے احباب میں دیر تک رہے۔ اس کے بعد خواجہ سلیم کے کتب خانے میں خطی نسخوں کا جائزہ لیا گیا۔ سید صاحب نے نسخۂ رباعیاتِ عمر خیام کو پسند فرمایا جس کا ویسے بھی بہت چرچا تھا۔ اسے بغداد میں کاتب خرج اللہ نے ۸۶۸ھ میں لکھا تھا۔ اس کے علاوہ خواجہ صاحب کے ہاں بعض دیگر مخطوطات بھی بہت بلند پائے کے تھے۔ ان سب مخطوطات کو خواجہ صاحب نے لوہے کے ایک ٹرنک میں سنبھال کر رکھا ہوا تھا جو سید صاحب کے

سامنے لا کر رکھ دیا گیا اور آپ نے سب کتابوں کو نہایت اشتیاق سے دیکھا ۔ پھر آپ نے اعظم گڑھ جا کر ان سے متعلق ایک شذرہ بھی لکھا ۔

سید سلیمان ندوی صاحب اپنے قیامِ لاہور کے دوران میں بعض اداروں میں بھی گئے اور اکثر اہلِ علم حضرات سے ملاقاتیں بھی کیں ۔ یہ ایک الگ روئداد ہے جس کا ذکر انھوں نے اعظم گڑھ جا کر ''معارف'' کے 'شذرات' میں خود بھی کیا تھا ۔ مذکورہ جلسے میں ۱۶ اپریل ۱۹۲۷ء کو رات کے وقت علامہ اقبال کا لیکچر بعنوان The Spirit of Islamic Culture ہوا ۔ آپ کی یہ تقریر انگریزی زبان میں تھی اور جلسے میں سید سلیمان ندوی بھی موجود تھے ۔ علامہ اقبال کے لیکچر کے بعد میاں سر شفیع نے بھی تقریر کی تھی ۔

سید صاحب لاہور کی ان علمی مجالس کے متعلق ''معارف'' کے 'شذرات' میں لکھتے ہیں :

> ''اصحابِ علم اور اربابِ علم و ادب کی جمعیّت کے لحاظ سے بھی وہ آج کل ہندوستان کی سب سے بہتر مجلس ہے ۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال ، شیخ عبدالقادر ، پرنسپل عبداللہ یوسف علی ، پروفیسر حافظ محمود شیرانی ، پروفیسر اقبال ، پروفیسر محمد شفیع ، پروفیسر سراج الدین آزر ، مولوی محمد علی ایم ۔ اے ، خواجہ کمال الدین ، پروفیسر سید عبدالقادر ، مولوی ظفر علی خاں اور متعدد ایسے باکمال اصحاب کی سکونت کا اس کو فخر حاصل ہے جن کے یکجا مرقع کی مثال کسی اور شہر میں نظر نہیں آتی ۔ پرانے لوگوں میں سید ممتاز علی صاحب ، منشی محبوب عالم صاحب اور مولوی انشاء اللہ خاں اپنی بہار گزار چکے ہیں تاہم ان کی خزاں

بھی بہار کی یادگار ہے ۔

انشا پردازوں ، ادیبوں اور شاعروں کی محفل بھی وہاں کچھ کم رونق پر نہیں ہے ۔ سالک و مہر ، تاجور ، ابوالاثر حفیظ جالندھری ، غلام ربانی ، ڈاکٹر تاثیر ، حکیم یوسف حسن (نیرنگِ خیال) ، مولانا عبداللہ چغتائی ، سید امتیاز علی تاج ، اختر شیرانی (بہارستان) اور کئی دوسرے اہلِ قلم آگے بڑھنے کے لیے مصروفِ عمل ہیں اور مستقبل ان کی کامیابی کا منتظر اور ان کے خیرمقدم کو تیار ہے ، اور ان میں سے بعض تو آگے بڑھ کر پہلی صف کے قریب پہنچ چکے ہیں ۔

یہ لکھنے میں میرا دل خوشی اور مسرت سے لبریز ہے کہ لاہور کے اہلِ علم اور اہلِ قلم نے اپنی برادری کے اس کمترین ممبر کو خوش آمدید کہنے میں پوری فیاضی کا ثبوت دیا ۔ مولوی ظفر علی خاں نے تو اپنے گھر مہمان ہی آتارا اور یہ نامناسب بھی نہ ہوا کہ ایک ''دھقانی'' ایک ''زمیندار'' کا مہمان بنتا ۔ ڈاکٹر اقبال سے یہ میری پہلی ظاہری ملاقات تھی اور مراسلت کی باطنی ملاقات تو ۱۹۱۴ع سے قائم ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے کرم کیا کہ ملنے میں پیش دستی فرمائی ، قیام گاہ میں آئے ، متعدد صحبتوں میں ساتھ رہے اور پھر خود اپنے کاشانے میں مدعو کیا جس کو وہ ''دارالفقر'' اور میں ''دارالاقبال'' کہوں گا ۔ افسوس ہے کہ وقت کی قلّت کے سبب میں وہاں کے مشہور کتب خانوں کو نہ دیکھ سکا ۔

ڈاکٹر اقبال ان تمام صحبتوں میں شمع محفل تھے ۔ انھوں

نے ''شمع اور شاعر'' لکھا ہے لیکن میں نے تو لاہور میں خود شاعر کو شمع دیکھا اور قدر شناسوں کو اس کا پروانہ پایا ۔ ان کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بہت بلند کر رہی ہے ۔ ان کے فلسفیانہ نکات ، عالمانہ افکار اور شاعرانہ خیالات ان کی آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں ۔ ان کی ''زمزمہ پردازیوں'' کا نیا مجموعہ ''زبورِ عجم'' کے نام سے عنقریب سامعہ نواز ہونے والا ہے ۔ میں نے کہا کہ فلسفۂ عجم کے دشمن کو مناسب بھی یہی تھا کہ عجم کے ہاتھ میں زبور دے کر ان کے خیالی فلسفے کو مزامیرِ داؤد کی دعاؤں سے بدل دے اور ان کے کانوں کو زبور کا ''پردہ'' رکھ کر قرآن کی نغمہ سنجیوں سے مانوس کر دے ۔''

۴۱

ایک ملاقات

(سر اکبر حیدری ، ڈاکٹر سکارپا اور مسٹر و مسز وسوگر)

۱۹۲۶ء میں پنجاب یونیورسٹی نے سر اکبر حیدری کو حیدرآباد دکن سے بلایا کہ وہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد (کانووکیشن) کے موقع پر طلبہ سے خطاب کریں ۔ ایک روز میں صبح کے وقت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے سر اکبر حیدری کی لاہور میں آمد کا ذکر کیا اور فرمایا کہ کل ان سے ملنا ہے ۔ چنانچہ دوسرے روز میں اور مرحوم عبدالرحمٰن چغتائی علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ سر اکبر حیدری ہائی کورٹ کے قریب سر محمد شفیع کی اقبال منزل میں ٹھہرے ہوئے تھے ۔ جلسۂ کانووکیشن کے بعد جب وہ اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو علامہ بھی ہم دونوں کو ساتھ لے کر پہنچ گئے اور ان سے ملاقات کی ۔ دورانِ گفتگو میں عبدالرحمٰن چغتائی نے دیوانِ غالب کا ایک مصوّر ایڈیشن چھاپنے کا ارادہ ظاہر کیا تو سر اکبر حیدری نے اس تجویز کو بہت پسند کیا اور فرمایا کہ میں اس ضمن میں ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار ہوں ۔

یہاں سے فارغ ہو کر علامہ اپنی موٹر میں ہمیں فین روڈ پر لائے اور بخشی ٹیک چند کے مکان کے بالمقابل ذرا اندر کرکے ایکہ

مکان کے سامنے اتر گئے - یہاں ایک پارسی میاں بیوی مسٹر و مسز وسوگر رہتے تھے جن کے ہاں آن دنوں اٹلی کے ایک سکالر ڈاکٹر سکارپا آئے ہوئے تھے - یہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ یہ ملاقات اور اس میں ہونے والی گفتگو کا موضوع پہلے سے طے شدہ تھا - ڈاکٹر سکارپا افغانستان میں اطالوی سفیر کا مددگار تھا اور فلسفۂ اقبال پر گہری نظر رکھتا تھا - اسے اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' کے سلسلے میں بعض شبہات تھے جو اس ملاقات میں علامہ نے رفع کردیے -

مسٹر اور مسز وسوگر بھی علامہ کے عقیدت مند تھے اور وہ ان کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے - مسز وسوگر آکسفورڈ یونیورسٹی کی گریجویٹ تھیں اور ان دنوں ڈی - اے - وی کالج میں انگریزی کی اعزازی پروفیسر تھیں - انھوں نے اس ملاقات میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے ماسٹر آف دی کالج ڈاکٹر لنڈسے کا ذکر بھی کیا جو کلامِ اقبال سے واقف تھے اور ان دنوں ہندوستان آنے والے تھے - ڈاکٹر لنڈسے ثقافت کے موضوع پر کئی کتابوں کے مصنّف تھے اور غالباً مسز وسوگر کو پڑھا بھی چکے تھے -

۴۲

تاریخ گو اقبال

میں ایک مرتبہ مئی ۱۹۶۸ء میں علامہ اقبال پر تحقیق کے ضمن میں مظفر آباد (آزاد کشمیر) گیا تھا۔ جناب جسٹس سجاد صاحب اور میاں محمد شفیع (م۔ش) بھی میرے ہم سفر تھے۔ ایک صبح تفریح کے لیے ہم لوگ دریا کے کنارے بھی گئے تھے۔ ایم۔ عبدالرحیم افغانی بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ انھوں نے مندرجہ ذیل استفسار لکھا ہوا مجھے دیا تھا۔ افسوس کہ افغانی صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ بہرحال یہ بحث اقبال کے ضمن میں بہت اہم اور علمی اعتبار سے ضروری ہے۔ ان کا استفسار یہ تھا:

"ایک استفسار: بخدمت جناب علامہ چغتائی صاحب

کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال مرحوم نے کسی کی تاریخِ وفات نہیں کہی اور نہ کسی کا سہرا لکھا۔ مگر اپنے استاد (مولوی میر حسن صاحب مرحوم) کی تاریخِ وفات "وما ارسلنک الا رحمة للعالمین" (الآیة) سے نکالی اور ایک کتاب (ذکرِ حبیب در احوالِ پیر حیدر شاہ صاحب جلال پوری) میں درجِ ذیل قطعۂ وفات علامہ مرحوم کا کہا ہوا

ملتا ہے:

ہر کسے بر خاکِ مزارِ پیر حیدر شاہ رفت
تربتِ او را امینِ جلوہ ہائے طور گفت
ہاتف از گردوں رسید و خاکِ او را بوسہ داد
گفتمش سالِ وفاتِ او بگو، ''مغفور'' گفت

میں نے کافی تحقیق کی مگر کسی دوسری تصنیف میں یہ قطعہ نہیں دیکھا۔ اس قطعے کے متعلق میں نے جناب ممتاز حسن، ڈاکٹر رفیع الدین اور فقیر وحید الدین صاحبان سے بھی استفسار کیا۔ مؤخر الذکر نے جواب ہی نہیں دیا۔ اول الذکر ہر دو دانش وروں نے بھی اس سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ آنجناب اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں گے؟

والسلام ایم۔ عبدالرحیم افغانی، مظفر آباد

۱۱ - ۵ - ٦٨''

مجھے اقرار ہے کہ میں نے بھی مندرجہ بالا قطعے کو اقبال کے ضمن میں کہیں نہیں دیکھا اور نہ کسی سے سنا ہے۔ البتہ افغانی صاحب کے اس جملے: ''علامہ اقبال مرحوم نے کسی کی تاریخِ وفات نہیں کہی اور نہ کسی کا سہرا لکھا'' کا جواب میں نے ان کو اسی وقت دے دیا تھا؛ یعنی یہ کہ علامہ مرحوم نے بعض احباب اور اعزہ کی تاریخیں واقعی کہی ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے ان کو حفیظ ہوشیارپوری کے مضمون کا حوالہ بھی دیا تھا۔

ایک دفعہ ''نوائے وقت'' مورخہ ۲۸ جولائی ۱۹۷٦ع میں ایک مختصر سا مضمون بعنوان ''سید حیدر علی شاہ جلالپوری''۔ (یادِ رفتگاں) از قلم محمد اشرف ایڈووکیٹ طبع ہوا تھا جس میں علامہ

کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ قطعہ بھی شامل تھا جو آپ نے حضرت سید حیدر شاہ جلالپوری کی وفات (۱۳۲۶ھ) پر کہا تھا ۔ اسی اخبار میں اس کے نیچے ایک اور تاریخی معمّہ ''از لسان العصر خان بہادر اکبر حسین صاحب سیشن جج الہ آباد'' طبع ہوا تھا مگر جو قطعۂ تاریخ آپ نے کہا تھا وہ موجود نہ تھا ۔ اس پر میرا ایک مضمون ۴ نومبر ۱۹۷۶ع کو بعنوان ''سید حیدر علی شاہ جلالپوری ، حضرت علامہ اقبال اور حضرت اکبر الہ آبادی'' چھپا تھا جس میں میں نے لکھا تھا کہ اکبر الہ آبادی اور اقبال والے قطعۂ تاریخ کی بات بے بنیاد ہے ، کیونکہ اکبر کا قطعہ تو نوائے وقت میں موجود ہی نہ تھا اور اقبال کے سلسلے میں یہ اشتباہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ سال (۱۳۲۶ھ) ۱۹۰۸ع کے مطابق ہے جب کہ علامہ یورپ سے تازہ تازہ آئے تھے ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آپ نے اس قطعۂ تاریخ کو کب ارسال کیا اور کب لکھا ہوگا ۔ بالآخر مجھے ڈاکٹر عبدالغنی (معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی) کی بدولت اصل کتاب ''ذکرِ حبیب'' مصنفۂ ملک محمد الدین ، ایڈیٹر ''صوفی'' پنڈی بہاؤ الدین دیکھنے کا اتفاق ہوا تو اس کے ایک پورے صفحے پر یہ دونوں قطعات (از قلم علامہ اقبال و حضرت اکبر الہ آبادی) موجود تھے جو ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے ۔ اس کتاب سے معلوم ہوا کہ صوفی محمد الدین نے اس کا مقدمہ ۱۵ مئی ۱۹۲۳ع کو بمقام پنڈی بہاؤ الدین لکھا تھا ۔ چنانچہ وہ اس کے مقدمے میں لکھتے ہیں :

''میں ان حضرات کے ساتھ ملک کے نامور شعرا کا بھی رہینِ منّت ہوں جنھوں نے اپنے کلامِ بلاغت نظام سے مجھ کو ممتاز فرمایا ۔ چنانچہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم ۔ اے ، پی ایچ ۔ ڈی اور خان بہادر سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی

سے لے کر عام نغز گویانِ اردو تک کے نتائجِ افکار کتاب کے اوراق میں درج ہیں ۔"

چنانچہ افغانی مرحوم کا یہ کہنا کہ علامہ اقبال نے کسی کا قطعہ تاریخِ وفات یا سہرا نہیں لکھا ، واقعات کے خلاف ہے ۔

عبدالحفیظ ہوشیار پوری نے ۱۹۵۲ء میں ایک مفید مضمون روزنامہ ''آفاق'' لاہور میں لکھا تھا جس کا عنوان ''تاریخ گو اقبال'' تھا ۔ ہم ذیل میں اس مضمون کا ایک ملخّص پیش کرتے ہیں ۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ علامہ نے واقعی تاریخیں کہی ہیں ، تاہم وہ باقاعدہ تاریخ گو نہیں تھے :

اقبال نے ''ارمغانِ حجاز'' میں مندرجہ ذیل رباعی لکھی ہے :

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوی
بگوشِ مردۂ پیغامِ جاں گوی
ولے گویند این ناحق شناساں
کہ تاریخِ وفاتِ این و آں گوی

مگر اس کے باوجود اقبال نے اعزّہ و احباب اور مشاہیر کے مرنے پر مرثیے بھی لکھے اور تاریخیں بھی کہیں ۔ ان کے مرثیے ہمارے ادب کا لازوال سرمایہ ہیں لیکن تاریخ گوئی کو اقبال نے بطورِ فن کبھی اختیار نہیں کیا ۔

بعض دفعہ احباب کی فرمائشوں سے مجبور ہو جایا کرتے تھے اور کبھی کبھی خود بھی کسی واقعے سے متاثر ہو کر تاریخ کہہ دیتے تھے ۔ مندرجہ بالا قطعے میں اقبال نے خوبصورت انداز میں اُن لوگوں پر طنز کی ہے جو رسمی طور پر ان سے تاریخ گوئی کی فرمائش کرتے رہتے تھے ۔

جہاں تک مجھے یاد ہے ، اقبال کی تاریخ گوئی کی طرف آج تک

کسی نے توجہ نہیں کی ۔ اقبال نے اس میدان کو باقاعدگی سے بطور پیشے کے نہیں اپنایا ۔ مگر ضرورت پڑنے پر انھوں نے قریبی احباب اور ضروری واقعات کی تاریخیں کہی ہیں جو ذیل میں مختصر طور پر بیان کی جاتی ہیں :

۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسیّد بانیِ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا انتقال ہوا جبکہ اقبال ابھی گورنمنٹ کالج لاہور میں طالب علم تھے مگر اقبال نے قرآن مجید کی آیت سے یہ تاریخ برآمد کی تھی جو منشی وجاہت حسین جھنجھانوی کی کتاب کے صفحہ ۷۶ پر یوں درج ہے :

''انی متوفیک و رافعک الی و مطہرک'' جس سے ۱۳۱۵ھ کے اعداد نکلتے ہیں جو ۱۸۹۸ء کے مطابق ہیں ۔ تاریخ کے اوپر اقبال کا نام اس طرح لکھا ہے :

''منشی محمد اقبال صاحب طالب گورنمنٹ کالج لاہور ، تلمیذِ حضرتِ داغ ۔''

مذکورہ بالا تاریخ علی گڑھ میں سر سید کے لوحِ مزار پر آج بھی ثبت ہے ۔

۱۷ نومبر ۱۹۰۰ء کو امیر مینائی نے انتقال کیا تو اقبال نے قرآن کریم کی اس آیت سے تاریخ نکالی :

''لسانِ صدقٍ فی الآخرین ۔''

علامہ کے دوست محمد دین فوق نے ایک کتاب شالامار باغ پر لکھی تھی جس پر علامہ نے ایک قطعۂ تاریخ یوں کہا تھا : ''میسزد تصویر باغ جانفزا'' جس سے ۱۹۰۱ء برآمد ہوتے ہیں ۔

جب آپ کے استاد حضرت داغ کا انتقال ہوا تو آپ نے بیشمار تاریخی جملے نکالے جن سے ان کی تاریخِ وفات نکلتی تھی ۔ آپ کا انتقال

۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ کو ہوا تھا ۔ آخری مصرع یہ ہے :

"داغ نواب میرزا کہیے ۔"

جب کلامِ فوق شائع ہوا تو اقبال نے ایک طویل نظم لکھی جس کا یہ آخری مصرع تاریخ ہے :

"ہاتف نے کہا لکھ دے کمالِ نظرِ فوق"

ظہیر دہلوی کا انتقال ہوا تو آپ نے یہ تاریخ کہی :

"زبدۂ عالم ظہیرِ دہلوی"

جس سے ۱۳۲۹ھ نکلتے ہیں ۔

لاہور کی تاریخ میں بے شمار ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جنھیں دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے ۔ لاہور کے نقشۂ قدیم میں مسلسل تغیّر آتا رہا ہے ۔ لاہور کی پرانی کوتوالی اندرونِ شہر لاہور اور اندرونِ دہلی دروازہ ، مسجد وزیر خاں کے نزدیک واقع تھی ۔ غالباً یہاں قدیم مغل عہد کی کوئی عمارت تھی جسے انگریز نے لاہور پر قبضہ کرنے کے فوراً بعد رومن طرزِ تعمیر میں بدل دیا تھا ۔ رنجیت سنگھ کی تاریخ میں بھی مسجد وزیر خاں کے نزدیک اس پرانی کوتوالی کا یوں ذکر ملتا ہے کہ مائی سدا کور قلعۂ لاہور کے مشرقی دروازے سے نکل کر قدیم عقبی راستے سے مسجد وزیر خاں تک آئی ۔ میں نے یہ پرانی کوتوالی ہر پہلو سے دیکھی ہے ۔ حالات بدلے تو انگریز کو بیرونِ شہر ایک نئی کوتوالی تعمیر کرنے کا خیال آیا ۔ اس زمانے میں شہر لاہور کے کوتوال میاں غلام رسول مرحوم تھے اور سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر سکاٹ تھے ۔ پرانی کوتوالی کی عمارت کو نہ صرف چھوڑ دیا گیا بلکہ گرا دیا گیا اور بیرون دہلی دروازہ کوتوالی کی وہ نئی عمارت تعمیر ہوئی جو آج بھی موجود ہے ۔ میں اس زمانے میں نجی طور پر کوتوالِ شہر میاں غلام رسول کے بچوں کو پڑھاتا تھا ۔

انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ کوتوالی کی نئی عمارت میں سنگِ مرمر کی ایک تختی لگائی جائے۔ آنھوں نے مجھے بتایا کہ خود آنھوں نے مطلوبہ اردو اشعار تو لکھ لیے ہیں مگر وہ چاہتے ہیں کہ اس ضمن میں علامہ اقبال سے بھی مشورہ کیا جائے۔ چنانچہ میاں صاحب علامہ کے انارکلی والے مکان میں وہ اشعار لے کر گئے جن میں علامہ نے اصلاح بھی دی اور ان اشعار کا عنوان ''عمارت فرخ فرجام'' تجویز فرمایا۔ یہ تاریخی عنوان تھا کیونکہ ان الفاظ سے عمارت کی تاریخِ تعمیر (۱۹۱۵ع) نکلتی تھی۔ افسوس آج نہ وہاں سنگِ مرمر کی وہ تختی ہے اور نہ یہ تاریخی نام۔

علامہ کے دوست جسٹس شاہ دین ہمایوں کا جب ۲ جولائی ۱۹۱۸ع کو انتقال ہوا تو آپ نے ان کی تاریخ بھی کہی۔ جو قطعہ مرحوم کے مزار کی لوح پر کندہ ہے اُس کا آخری شعر یہ ہے:

''در گلستانِ دہر ہمایونِ نکتہ سنج

آمد مثالِ شبنم و چوں بوئے گل رمید''

آپ کے دوست نواب ذوالفقار علی نے لدھیانہ میں ایک ''گنج'' بنایا تھا جس کی تاریخ کا آخری مصرع یہ ہے:

''بر زمیں خلدِ بریں آراستہ''

جس سے ۱۹۲۱ع نکلتے ہیں۔

دو سگے بھائی ــــ ڈاکٹر سید محمد حسین اور سید نادر حسین ــــ علامہ اقبال کے ہم جماعت تھے۔ سید نادر حسین کے انتقال پر جب کسی نے تاریخ کہی تو یہ تاریخ علامہ کی نظر سے بھی گزری جسے آنھوں نے نا پسند فرمایا۔ پھر (۷ فروری ۱۹۱۹ع کو) خود ایک

قطعہ تاریخ کہا جس کا آخری شعر یہ تھا :

گفت ہاتف مصرعِ سالِ رحیل
کشت سیّد را یزیدے کافرے

جب آپ کے دوست میاں غلام رسول نے مسجدِ داتا صاحب تعمیر کی تو آپ نے مندرجہ ذیل شعر سے تاریخ نکالی :

''چشم بہ المسجد الاقصیٰ فگن
الذی بارکہ ہم بگو''(؟)

جس سے ۱۳۴۰ھ نکلتے ہیں -

جب کیمبرج یونیورسٹی میں پروفیسر ڈاکٹر براؤن کا انتقال ہوا تو آپ کے رفیق نکلسن کے کہنے پر آپ نے اس کی تاریخ وفات میں ایک قطعہ قلم بند کیا تھا جس کی کتابت منشی اسد اللہ نے اور نقاشی عبدالرحمٰن چغتائی نے کی تھی - یہ تاریخ قرآن مجید کی اس آیت سے نکلتی تھی : ''گفت ہاتف ذالک الفوز العظیم'' جس سے ۱۹۲۶ع نکلتے ہیں -

جب پروفیسر براؤن کا انتقال ہوا تو انھی دنوں علامہ کی اپنی بیوی کا بھی بچہ پیدا ہونے پر انتقال ہوگیا - آپ نے ایک قطعہ تاریخ کہا جس کے آخری مصرعے سے تاریخ نکلتی ہے :

''بشہادت رسید و منزل کرد''

جس سے ۱۳۴۳ھ نکلتے ہیں -

آپ نے مولوی محبوب عالم مالک ''پیسہ اخبار'' کی تاریخ اس طرح کہی تھی :

''معلیٰ تربتِ محبوبِ عالم''

جس سے ۱۳۵۱ھ نکلتے ہیں -

جب آپ میو روڈ والی کوٹھی میں آ گئے تو وہاں آپ کی ایک

اور بیوی کا انتقال ہوگیا اور اُن کو بیبیاں صاحب میں دفن کیا گیا ۔ ان کی تاریخ وفات ان الفاظ سے نکالی : ''سرمۂ ما ذاغ'' جس سے ہجری سال ۱۳۵۴ نکلتے ہیں ۔ یہ قطعہ اب بھی مرحومہ کی لوحِ مزار پر کندہ ہے ۔

جب ۱۹۳۵ء میں آپ نے مولانا الطاف حسین حالی کے صد سالہ جشن میں شرکت کی تو اس موقع پر ایک قطعۂ تاریخ کہا جس کے آخری مصرع سے تاریخ نکالی ۔ وہ مصرع یہ ہے :

''تا لالۂ شبنم زدہ را داغ جگر داد''

اس کے علاوہ علامہ نے اپنے والد مرحوم کی تاریخ ''آغوش نور'' کے الفاظ سے نکالی کیونکہ اُن کا نام ''نور محمد'' تھا ۔ اس سے ۱۳۴۹ھ نکلتے ہیں ۔

پھر اپنی والدۂ ماجدہ کی تاریخ ''رحلتِ مخدومہ'' سے نکالی تھی یہ دونوں قطعات سیالکوٹ میں ان کے والدین کی قبروں پر مع تمام اشعار کے کندہ ہیں ۔ وہیں ایک اور قطعۂ تاریخ آپ کے استاد شمس العلما مولانا سید میر حسن کی قبر پر بھی کندہ ہے ۔ یہ تاریخ قرآن کریم کی اس آیت پر مشتمل ہے : ''و ما ارسلنک الا رحمة للعالمین'' جس سے ۱۳۴۷ھ نکلتے ہیں ۔

بعض تاریخیں مذاحیہ انداز میں بھی آپ نے کہی ہیں ۔ چنانچہ ایک مرتبہ علامہ کے لدھیانے والے عزیزوں نے اگست ۱۹۲۸ء کو شملے میں آپ کی دعوت کی ۔ آپ ان کے ہاں جلسۂ پنجاب اسمبلی کے موقع پر مقیم تھے ۔ اس دعوت میں راقم کے علاوہ سر فیروز خاں نون ، نواب ذوالفقار علی خاں اور پروفیسر تاثیر بھی موجود تھے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کھانے میں کباب سرِ فہرست تھے اور

اس دعوت کا تمام مزہ اس کے کبابوں میں تھا ۔ جب ہم کھاتے کھاتے تھک گئے تو علامہ نے نہایت بے تکلفی سے میری طرف دیکھا اور فرمایا : ''ماسٹر خورد و مُرد ۔''

پروفیسر تاثیر نے ایک مضمون بعنوان ''اسماء الرجالِ اقبال'' لکھا تھا ۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے :

''اس آخری دور میں جو نئے لوگ باقاعدہ آتے تھے ان میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا نام سب سے پہلے آتا ہے ۔ چودھری محمد حسین اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی خوش مزاجی حضرت علامہ کی بے تکلفی کے لیے مہمیز کا کام دیتی تھی اور وہ وہ فقرے ہوتے تھے کہ باید و شاید ۔ ایک باب اطعمہ کا تھا جس کا خلاصہ اس مضمون میں پایا جاتا ہے جو ''اکّال الکل'' کے عنوان سے ''مخزن'' کے دورِ حفیظ میں شائع ہوا ۔ میں نے محض رپورٹ لکھی ہے ۔ فقرے میرے نہیں جو علامہ اقبال کی پھبتیوں کی مثالیں ہیں ۔ اس مضمون کو دیکھ لیں ۔''

''اکّال الکل'' والے مضمون میں پروفیسر تاثیر نے وہ سب کچھ لکھا ہے جو اس دعوت میں ہوا ۔ علامہ کی طرف سے ہنسی مذاق بھی ہوا اور پھبتیاں بھی اور خوب محفل جمی رہی ۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ ''ماسٹر خورد و مُرد'' والے جملے سے کوئی تاریخ نکلتی ہے یا نہیں مگر علامہ نے بطور تفنّن یہ جملہ نہایت بے تکلفی سے کہا اور دیر تک احباب میں اس کا چرچا رہا ۔

غرض یہ حقیقت ہے کہ علامہ نے تاریخیں کہی ہیں ۔ نہ صرف

وفات کی تاریخیں کہی ہیں بلکہ بعض موقعوں پر آپ نے شادیوں پر بھی تاریخیں نکالی ہیں۔

ہم نے ان سطور میں قطعاتِ تاریخ کو مختصراً درج کیا ہے۔ جن حضرات کو تفصیل مطلوب ہو وہ عبدالحفیظ ہوشیارپوری کا اصل مضمون ملاحظہ فرمائیں۔

☆ ☆ ☆

۴۳

اکبر الہ آبادی اور اقبال

بنگال کی ایک ریاست یا جاگیر ''آرہ'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس جاگیر کی ملکیت کے سلسلے میں ایک مقدمہ زیرِ سماعت تھا جس کی پیروی مشہور وکیل سی۔ آر۔ داس کر رہے تھے۔ جاگیر کی دستاویزات میں بعض فارسی مخطوطات بھی تھے جو اپنے قدیم رسم الخط کی وجہ سے پڑھے نہیں جا رہے تھے۔ وکیل مسٹر سی۔ آر۔ داس نے عدالت کو تجویز پیش کی کہ ان مخطوطات کو پڑھنے کے لیے علامہ اقبال کی خدمات حاصل کی جائیں اور انھیں لاہور سے بلایا جائے۔ چنانچہ جب علامہ سے خط و کتابت ہوئی تو آپ وہاں جانے پر آمادہ ہوگئے۔ علامہ کی اس سفر پر آمادگی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس طرح حضرتِ اکبر الہ آبادی سے ملاقات کی سبیل پیدا ہو رہی تھی جن کا وہ بے حد احترام کرتے تھے اور انھیں اپنا پیر و مرشد تک کہتے تھے۔ اس سے پہلے ۱۹۱۳ء میں بھی وہ اکبر سے ملاقات کر چکے تھے جب مسجدِ کانپور کے قضیے کے سلسلے میں آپ وکیل کی حیثیت سے کانپور تشریف لے گئے تھے۔

آرہ کے سفر میں منشی طاہر الدین بھی علامہ کے ساتھ تھے۔

آرہ پہنچ کر آپ نے نہایت عجلت میں مقدمے کے کاغذات وغیرہ پڑھے اور ایک رپورٹ لکھ کر فوراً واپس جانے کے لیے تیار ہو گئے ۔ چنانچہ واپسی پر آپ سیدھے الہ آباد پہنچے اور مولانا اکبر کے ہاں قیام فرمایا ۔

اس زمانے میں راقم الحروف لدھیانے میں ملازم تھا اور علامہ کے اعزّہ کے ہاں مقیم تھا ۔ ایک روز معلوم ہوا کہ علامہ کا خط آیا ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ میں فلاں تاریخ کو فلاں گاڑی سے لدھیانے سے گزروں گا ۔ چنانچہ میں بھی ڈاکٹر غلام محمد مرحوم کے ساتھ ریلوے سٹیشن پہنچا مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ علامہ سو رہے ہیں ۔ ہم نے انھیں بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا اور منشی طاہر الدین سے ان کی خیریت دریافت کر کے واپس آ گئے ۔

الہ آباد میں مولانا اکبر سے ملاقات کا ذکر علامہ نے اپنے دو خطوط میں خود بھی کیا ہے جو مولانا عبدالماجد دریا بادی اور خان نیاز الدین خاں کے نام ہیں ۔

مولانا اکبر سے علامہ اقبال کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ آپ نے خلافِ عادت ان کے تمام خطوط اپنے پاس محفوظ کر لیے تھے اور تنہائی میں ان کا مطالعہ کیا کرتے تھے ۔ ”بانگِ درا“ کی اشاعت کے زمانے میں آپ نے ان خطوط کو بھی شائع کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا یہاں تک کہ مسودہ بھی دارالاشاعت پنجاب کے حوالے کر دیا تھا ، مگر اس کے بعد آج تک نہ تو یہ خطوط شائع ہوئے اور نہ ہی مسودے کا سراغ مل سکا ۔ البتہ مولانا اکبر کے نام علامہ کے اپنے خطوط ”اقبال نامہ“ کی دوسری جلد میں شائع ہو چکے ہیں ۔

ملک محمد الدین کی کتاب ''ذکرِ حبیب'' میں مولانا اکبر اور علامہ اقبال کی کہی ہوئی تاریخ ہائے وفات بھی ان کے ہم مشرب ہونے کی دلیل ہیں۔

مولانا اکبر الہ آبادی ۹ ستمبر ۱۹۲۱ع کو فوت ہوئے۔

☆ ☆ ☆

۴۴

آم خوری

میاں نظام الدین صاحب رئیسِ اعظم لاہور نے حسبِ دستورِ قدیم اپنے آموں کے باغ میں بعض احباب کو آم کھانے کی دعوت دی ۔ حضرت میاں صاحب کے علاوہ خان صاحب میاں امیر الدین ، میاں محمد اسلم ، پروفیسر تاثیر اور میاں امین الدین صاحب آئی ۔ سی ۔ ایس دعوت کے میزبان تھے ۔ خان بہادر سردار حبیب اللہ خاں ، چودھری عبدالکریم ، چودھری محمد حسین (پریس برانچ) اور بعض دیگر معزز و محترم حضرات نہایت ذوق و شوق سے آم کھانے میں مصروف تھے ۔ حضرتِ علامہ اقبال مدظلہ العالی ، جو زمانۂ حاضر میں ''انبہ پسندی'' کے امام تسلیم کیے گئے ہیں ، اس پُرلطف صحبت کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے ۔

اس صحبت میں ایک دوست کی بہت بڑی کمی محسوس ہو رہی تھی ــ یادش بخیر پروفیسر محمد عبداللہ چغتائی ناسازیِ طبع کے باعث تشریف نہ لا سکے تھے اور حق یہ ہے کہ آپ کی غیر حاضری نے لطفِ محفل کرکرا کر دیا ۔ اس کمی کو پورا کرنے کی تدبیر یہ کی گئی کہ صبح سات بجے سے بارہ بجے دوپہر تک ایک لمحہ بھی ایسا نہ گزرا جس میں پروفیسر عبداللہ کا ذکرِ جمیل نہ ہوا ہو ۔

علی الخصوص علامہ اقبال تو اپنے اس ہمدمِ دیرینہ کی غیر حاضری سے بہت متاثر تھے ۔ بات یہ ہے کہ پروفیسر عبداللہ آم کھانے کے معاملے میں ایک لازوال شہرت حاصل کر چکے ہیں ۔ پروفیسر صاحب کا انکسار اس حقیقت کو تسلیم کرے یا نہ کرے لیکن ہمارا دعوےٰ ہے کہ آج شمالی ہند میں کوئی شخص آم کھانے کے معاملے میں پروفیسر عبداللہ کو شکست نہیں دے سکتا ۔ اور آم کھانے کا جو طریقہ آپ نے ایجاد کر رکھا ہے اس کی جدت تو اس قدر قابلِ داد ہے کہ آپ کو اس پر نوبل پرائز ملنا چاہیے ۔

ہمارا خیال ہے کہ جس طرح قربانی کا گوشت اور خون ، اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچتا بلکہ "تقویٰ" پہنچتا ہے ، اسی طرح اس صحبت میں ہم لوگوں کی انبہ خوری سے اگرچہ آم کا رس تو پروفیسر عبداللہ صاحب کے کام و دہن تک نہ پہنچا ہوگا مگر ان تمام ہزارہا آموں کا "تقویٰ" ضرور ان کے معدۂ معلیٰ تک پہنچ گیا ہوگا ، کیونکہ یہ فقرہ بار بار حاضرین کی زبان پر آ جاتا تھا کہ الٰہی ! ان آموں کا ثواب مولوی عبداللہ صاحب کی روح کو پہنچائیو ۔ یہاں تک کہ حضرتِ علامہ اقبال کا تخیّلِ عالی بھی اس فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور آپ نے ارتجالاً ارشاد فرمایا :

انبہ را کہ دریں باغ ندارند نگاہ
جائے او باد بہ نارِ شکمِ عبداللہ

پروفیسر عبداللہ صاحب نے آم کھانے کا جو انداز ایجاد کر رکھا ہے وہ صرف انھی کا حصہ ہے ۔ اس میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ اس انداز کا ذکر آج سے دو سال پیشتر "افکار" میں کیا جا چکا ہے ۔ اور ہم نے سفارش کی تھی کہ اس کی تصویر متحرّک تیار ہونی چاہیے کیونکہ الفاظ اس کو پوری طرح واضح کرنے سے عاری

ہیں ۔ اس طریق کی تقلید تو خارج از بحث ہے ۔ باقی رہا کثرت کا سوال تو یہ امر احباب کے لیے بے انتہا اطمینان کا باعث ہے کہ اس اعتبار سے یعنی بہ اعتبارِ کمیت چودھری محمد حسین نے اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی اور ان میں اور پروفیسر عبداللہ میں ، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ، صرف کوئی انیس بیس کا فرق رہ گیا ہے ، اللھم زد فزد ۔

ایک دفعہ پہلے بھی ہم نے چودھری صاحب کی رفتارِ انبہ خوری کا حساب قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کیا تھا ۔ آج پھر گزارش کرتے ہیں کہ چودھری صاحب کی رفتار بہت زیادہ تیز نہیں ہے ۔ آپ ایک منٹ میں صرف ایک آم نوش فرماتے ہیں ۔ اتوار کے دن ساڑھے سات بجے صبح سے ایک بجے بعد دوپہر تک آپ نے توقف نہیں فرمایا ۔ گویا ساڑھے پانچ گھنٹوں میں ساٹھ آم فی گھنٹہ کے حساب سے کل ۳۳۰ آم آپ نے نوش فرمائے ۔ اگر اس حساب میں کوئی فروگزاشت ہوگئی ہو تو چودھری صاحب اور دوسرے احباب اس کی تصحیح فرما سکتے ہیں ۔ ''افکار'' کا کالم ہر وقت ان کے لیے کھلا ہے ۔

حضرتِ اقبال ، سالک اور مہر متوسط درجے کے انبہ خور ہیں ، تاہم انھوں نے متواتر . . . آموں سے بھی کیا کم کھائے ہوں گے ۔ میاں محمد اسلم اور میاں امیر الدین محض میزبانی فرماتے ہیں ۔ آم کھانا ان کا کام نہیں ۔ جب دیکھا ہمیشہ کھلاتے ہی دیکھا ۔

قرار پایا کہ قلمی آموں کے لیے تو کھانے کا لفظ زیادہ صحیح ہے لیکن تخمی آموں کے لیے یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا ۔ چوسنا زیادہ اچھا لفظ ہے ۔ گو اہلِ زبان اسے غلط قرار دیں لیکن آخر تراش کر کھانے اور منہ سے لگا کر چوسنے میں بہت بڑا فرق ہے ۔ اگر ایک کی جگہ دو لفظ مقرر کر دیے جائیں جو مختلف مفہوم ادا کریں تو یہ کوئی بری بات نہیں ، بلکہ اس سے زبان میں وسعت

پیدا ہوگی ۔

اس پر کہا گیا کہ فارسی میں چوسنے کو ''مکیدن'' کہتے ہیں لہٰذا ''انبہ خوری'' کی بجائے ''انبہ مکی'' ، ''انبہ خورانی'' کی بجائے ''انبہ مکانی'' (فردوس مکانی ، جنّت مکانی) اور ''انبہ خور'' کی بجائے ''انبہ مک'' کہنا چاہیے ۔ مثلاً اگر پروفیسر عبداللہ کو آم کھانے کی ترغیب دینی ہو تو یہ مصرع یوں عرض کیا جا سکتا ہے :

لطف ایں انبہ نہ دانی بخدا تا نہ مکی

بہرحال یہ صحبت نہایت پُرلطف اور دلچسپ رہی ۔ اللہ تعالیٰ میاں نظام الدین صاحب کے باغوں میں دہ گونہ برکت عطا فرمائے اور اس کے ساتھ ہی پروفیسر عبداللہ چغتائی کو توفیق دے کہ وہ ایسے موقعوں پر بیان کردہ ناسازیِ مزاج کی آڑ میں پناہ لینے کی بجائے مردِ میدان بن کر سامنے آیا کریں ۔

[منقول از ''انقلاب'' (افکار و حوادث) ۲۸ جولائی ۱۹۲۷ء ، مطابق ۴ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ] ۔

میاں نظام الدین کے باغ میں آموں کی جو دعوت ہوئی تھی ، اس کے حالات ''افکار و حوادث'' میں پڑھ کر مختلف قسم کے خطوط موصول ہو رہے ہیں ۔ ایک محترم بزرگ سیالکوٹ سے لکھتے ہیں کہ آموں کی دعوت کا حال اخبار میں لکھ کر دور افتادوں کو ترسانا چہ معنی دارد ؟ اور پھر ایک پرائیویٹ محفل کے حالات کو پبلک کے اخبار میں شائع کرنا کہاں تک مناسب ہے ۔

ہماری گزارش یہ ہے کہ دنیا میں آم کھانے والوں کی ایک خاص برادری ہے جس کی کوئی بات (بشرطیکہ وہ انبہ خوری سے متعلق ہو) پرائیویٹ نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ جس محفل میں علامہ اقبال جیسے رہنماے جمہور اور اخباروں کے ایڈیٹر اور میونسپل کمشنر

موجود ہوں اس کے حالات اخباروں میں نہ چھاپنا پبلک کی توہین کرنا ہے ۔ یہ سب لوگ پبلک کے آدمی ہیں اور پبلک کو حق حاصل ہے کہ ان محفلوں کے حالات معلوم کرے ۔

ایک صاحب جمیل احمد صاحب میرٹھ سے لکھتے ہیں کہ چغتائی صاحب کے متعلق آپ کے حد سے بڑھے ہوئے خیالات اراکینِ ''بزمِ معدی کرب'' کے نام ایک کھلا ہوا چیلنج تصور کیے گئے ہیں ۔ غضب خدا کا ، جن لوگوں نے ساری عمر آم کھانے کے فن میں مہارت پیدا کرنے میں گزاردی انھیں نظرانداز کر کے ایک ایسے علاقے کا رہنے والا انسان ، جہاں آم بمنزلہ نفی کے ہوتا ہے ، اس فن میں استاد تسلیم کر لیا جائے ۔

یعنی میرٹھ میں آم کھانے والوں کی ایک باقاعدہ انجمن ''بزمِ معدی کرب'' کے نام سے قائم ہے جس کے معزز ارکان کو یہ معلوم کر کے بے حد تکلیف ہوئی ہے کہ ''افکار'' میں پروفیسر عبداللہ چغتائی کو انبہ خوری کا استاد تسلیم کیا گیا ہے ۔ ''بزمِ معدی کرب'' کے ایک ضروری اور خاص اجلاس میں قرار پایا کہ :

۱۔ ''چغتائی اینڈ کمپنی کو (حضرتِ علامہ مدظلہ' اس سے مستثنیٰ ہیں) دعوتِ مقابلہ دی جائے ۔ مقام میرٹھ ہوگا اس لیے کہ یہاں آم بکثرت پیدا ہوتا ہے ۔ صفائیِ معدہ کے سب اخراجات اراکینِ ''بزمِ معدی کرب'' کے ذمے ہوں گے ۔

۲۔ خان بہادر حاتم علی خاں صاحب کا وسیع باغ فریقین کے لیے تمام مقابلے تک وقف ہوگا ۔

۳۔ جیتنے والی ٹیم کے کپتان کو ''نواب پہاڑ جنگ'' بہادر کا خطاب دیا جائے گا ۔ اس کے گزٹ کرنے اور مشتہر

کرنے کے تمام مصارف ہم برداشت کریں گے ۔

۴۔ ہارنے والی ٹیم کو مندرجہ بالا رعایات کے علاوہ مندرجہ ذیل رعایات خصوصی حاصل ہوں گی :

ٹیم کے معزز ممبروں کی عزت افزائی ان کے کھائے ہوئے آموں کی گٹھلیوں سے گُندھے ہوئے ہاروں سے کی جائے گی جن کو زیبِ گلو کرنے کے بعد انھیں صرف ایک مرتبہ دہلی بازار میرٹھ سے گزرنا پڑے گا ۔

فوٹو اُتروانے ، اُنھیں ملکی اخبارات میں شائع کرانے اور شہر کے خوش فکروں کو جمع کرنے کے تمام اخراجات بزم کا خزانۂ عامرہ نہایت فراخ دلی سے برداشت کرے گا ۔

واضح رہے کہ آم خاص قسم کے ہوں گے جن کی گٹھلیاں نہایت نازک اور باریک ہوں گی تا کہ ان سے بنے ہوئے ہاروں کی خوب صورتی یو۔ پی کی نزاکت اور نفاست پسندی کو مجروح نہ کرے ، ہاں درازی بقدرِ شکم ہوگی اور ہونی بھی چاہیے ۔''

اب کیا فرماتے ہیں مولوی عبداللہ چغتائی اور چودھری محمد حسین بیچ اس مسئلے کے ۔ ہمارے نزدیک تو احبابِ میرٹھ کی تمام شرائط نہایت معقول ہیں ۔ اس ٹورنامنٹ کے تمام مصارف ، جن میں لاہور کی ٹیم کا کرایہ بھی شامل ہے ، وہی برداشت کر رہے ہیں اور آم بھی بہرحال انھی کو مہیا کرنے ہوں گے ۔ ہمارے نزدیک اس ضروری مسئلے پر غور کرنے کے لیے میاں نظام الدین صاحب ہی کے باغ میں یارانِ طریقت کی ایک ایمرجنسی میٹنگ منعقد ہونی چاہیے تاکہ اس چیلنج کا جواب بھی دیا جا سکے اور ٹیم انبہ خوری کا

ایک ریہرسل بھی کر لے۔

ہم نے لکھنؤ میں آموں کی حد سے زیادہ افراط کا ذکر کرنے کے بعد ملکِ صحافت کے نواب عبداللہ خاں صاحب ڈائرکٹر ''ہمدم'' کی خدمت میں گزارش کی تھی کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و احسان ہے۔ آموں کے موسم میں اپنے اخبار نویس بھائیوں کو فراموش نہ فرمائیے گا۔ اس ''ہمدم'' نے اس فروگزاشت پر کہ اس نے آموں کی فصل میں اخبار برادری کو نہ پوچھا، معذرت کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے:

''افسوس کہ برادر عزیز 'انقلاب' کو 'مشت بعد از جنگ' یاد آیا، کیونکہ اب آم کی فصل ختم پر ہے اور لکھنؤ کی منڈی بھی باہر کے مال سے چل رہی ہے۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ کچھ ''آما'' کے ٹوکرے اس سیلابِ عظیم میں آدھر بھی نہ بہہ نکلتے۔''

اس تاسف اور ندامت کے بعد ہم نے یہ تجویز پیش کی کہ لکھنؤ میں ایک ''آم کانفرنس'' منعقد کی جائے جس میں شرکت کے لیے تمام اخباری برادری کو دعوت دی جائے۔ اگر ہمارے بھائیوں نے آم کانفرنس کی شرکت گوارا فرمائی تو ثمرِ بہشت، کھجری اور فجری وغیرہ تو اب بھی باغوں میں موجود ہیں، ورنہ سالِ آیندہ انشاء اللہ کسی کو کہنے کا موقع نہ ملے گا کہ:

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ براندازِ چمن، کچھ تو ادھر بھی

کانفرنس کی اس تجویز کو آل انڈیا بنا دینا اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ لاہور کے رہنے والے اس میں شرکت کے لیے لکھنؤ پہنچیں۔ نواب صاحب قبلہ کو اخبار نویسوں کی مصروفیات اور ناداری دونوں

خصوصیتوں کا علم ہے :

راہ سیدھی تو بتا دی خضر نے
اونٹ کا لیکن کرایہ کون دے

اور اگر بفرضِ محال کرایہ بھی دینے پر آمادہ ہوگئے تو ہم لوگوں کی اس شامتِ اعمال کو کیا کیا جائے جس نے اخباروں کی صورت اختیار کر رکھی ہے ۔ اگر ہندوستان بھر کے اخبار نویس چند روز کے لیے لکھنؤ پہنچ جائیں تو یہ ظاہر ہے کہ اتنے دن تک اخبارات عدم آباد کی سیر کریں گے اور ملک بھر میں سنّاٹا چھایا رہے گا ۔ آم کانفرنس کیا ہوئی ، اچھا خاصا آرڈی ننس ہو گیا ۔

نواب صاحب قبلہ بھی جانتے ہیں کہ ادبی آدمیوں کو انبہ خوری کا خواہ کتنا شوق ہو ، بہرکیف پہنچنا بہت مشکل ہے ۔ اور خصوصاً اخبار نویسوں کے لیے جن کے پاس نہ روپیہ ہے نہ وقت لہٰذا اب کانفرنس کی دعوت دے کر پسینے چھوٹ رہے ہیں ۔

خیر یار زندہ صحبت باقی ۔ آیندہ سال ہی سہی ، لکھنؤ کے آموں کے لیے ایک سال کا انتظار ہرگز مشکل نہیں ۔ خدا کرے نواب صاحب آیندہ سال ہمیں یاد رکھیں ۔

(روزنامہ ''انقلاب'' لاہور : ۲۹ جولائی و ۴ ۔ اگست ۱۹۲۷ع ۔ اور ''انوارِ اقبال'' مرتّبہ بشیر احمد ڈار ، مطبوعہ اقبال اکیڈمی کراچی ۱۹۶۷ع ، ص ۳۱۳) ۔

☆ ☆ ☆

۴۵

پروفیسر ہیوم سے ملاقات

۱۹۲۷ء کے موسمِ سرما کا ذکر ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے پروفیسر ہیوم[1] کو "تقابلِ ادیانِ عالم" کے موضوع پر توسیعی لیکچروں کے سلسلے میں دعوت دی تھی اور انھوں نے یہاں آ کر چار لیکچر دیے تھے ۔ اُن دنوں سردی بہت زیادہ تھی ۔ میں علامہ کے ہاں حسب معمول بعدِ مغرب موجود تھا ۔ باہر بارش بھی ہو رہی تھی ۔ ہمارے پاس مسٹر شفاعت اللہ خاں بھی بیٹھے تھے جو اخباری دنیا کے بہت مشہور رکن تھے ۔ وہ مہر وسالک کے روزنامہ "انقلاب" کے اجرا میں شریک رہے تھے ۔ اس سے پیشتر وہ روزنامہ "زمیندار" میں رہ چکے تھے ۔ علامہ کے کمرے میں آگ کی انگیٹھی روشن تھی جس کی وجہ سے کمرہ خوب گرم تھا ۔ ہم علامہ اقبال کے ساتھ محوِ گفتگو تھے کہ اتنے میں علی بخش آیا اور کسی شخص کا تعارفی کارڈ لا کر علامہ کو دیا ۔ علامہ نے کارڈ دیکھ کر کہا کہ ان کو بلا لو ۔ چنانچہ علی بخش نے کمرے میں دو کرسیاں رکھ دیں جس

۱۔ روبرٹ ایلن ہیوم دراصل بمبئی میں پیدا ہوئے تھے ۔ ان کا انتقال امریکہ میں بروک لائن کے مقام پر ۲۴ جون ۱۹۲۹ء کو ہوا تھا ۔

پر علامہ نے کہا کہ وہ تو ایک آدمی ہے ، تم دو کرسیاں کیوں رکھ رہے ہو ؟ علی بخش نے کہا کہ موٹر میں دو شخص ہیں ۔

چنانچہ وہ دونوں صاحب یعنی ڈاکٹر ہیوم اور ان کے بھائی مسٹر ہیوم سیکرٹری وائی ۔ ایم ۔ سی ۔ اے اندر آئے اور مسٹر ہیوم نے اپنے بھائی ڈاکٹر ہیوم کا تعارف کرایا جو اس سے عمر میں بڑے تھے ۔ وہ دونوں تو کرسیوں پر بیٹھ گئے مگر علامہ اپنی عادت کے مطابق پلنگ پر ہی لیٹے رہے ۔ اس وقت وہ دھسّہ اوڑھے ہوئے تھے ۔ چند لمحے خاموشی رہی ، پھر علامہ نے خود ہی گفتگو شروع کی اور کہا کہ آپ نے جو لیکچر پنجاب یونیورسٹی میں دیے ہیں ، ان کا خلاصہ اخبار میں شائع ہوگیا ہے ۔ میں نے نہایت توجہ سے ان کا مطالعہ کیا ہے اور مستفید ہوا ہوں ۔ پھر علامہ نے اسی طرح پلنگ پر لیٹے لیٹے سوال کیا کہ ڈاکٹر ہیوم ! آپ کا کیا خیال ہے کہ عیسائی مذہب تبلیغی مذہب ہے ؟ اس پر ڈاکٹر ہیوم خاموش اور مبہوت سا ہوگیا ۔ پھر علامہ نے خود ہی کہا کہ میرے خیال میں آج دنیا میں صرف اسلام ہی تبلیغی مذہب ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے ۔ عرصہ ہوا عیسائیت ایک تبلیغی مذہب ہونے کی حیثیت سے مردہ ہو چکی ہے اور صرف اسلام ہی اس وقت زندہ مذہب دنیا میں ہے ۔ پھر آپ نے کہا کہ چونکہ آپ Comparative Religian پڑھاتے ہیں اور اسی پر لیکچر بھی دیے ہیں تو آپ نے اس نہج پر بھی سوچا ہوگا کہ بدھ مذہب ، جو آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ افراد کا مذہب ہے ، وہ بھی اسلام کے مقابلے میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا ۔ مگر ڈاکٹر ہیوم نے اس سلسلے میں کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا جس سے اس کے خیالات اور معیارِ علم کا پتہ چلتا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں آ کر پھنس گیا ہے ۔ چنانچہ اس نے اس مختصر سی گفتگو کے بعد

فوراً اجازت طلب کی اور رخصت ہو گیا ۔

علامہ کی عظمت ہم نے یہ دیکھی کہ جو گفتگو کسی شخص کے ساتھ ہوئی وہ اس کی موجودگی تک محدود رہی اور جب وہ شخص چلا گیا تو اپنا تذکرہ بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا اور فوراً نیا موضوع گفتگو شروع ہو گیا ۔ چنانچہ شفاعت اللہ خاں اور میں نے ڈاکٹر ہیوم کے جانے کے بعد کچھ تبصرہ کرنا چاہا مگر علامہ نے فوراً موضوع بدل دیا ۔ وہ کسی کی پیٹھ پیچھے اس پر تنقید کرنا نہایت معیوب خیال کرتے تھے ۔

۴۶

میر جلیل لکھنؤی

۱۹۲۶ء میں میر انیس اعلیٰ اللہ مقامہ کی فقیدالمثال سخن ورانہ روایات کی زندہ یادگار (ان کے نواسے) میر فرزند حسین جلیل لکھنؤی کچھ دنوں کے لیے واردِ لاہور ہوئے اور لاہور کے ہردلعزیز رئیس نواب محمد علی خاں قزلباش کے ہاں مقیم ہوئے۔ میر صاحب کو مرثیہ گوئی کا فن اپنے بلندپایہ خاندان سے ورثے میں ملا ہے اور آپ کی نازک خیالی سونے پر سہاگہ ہے۔

آپ کے لاہور میں وارد ہونے پر علامہ بھی ان کی دو مجلسوں میں شریک ہوئے تھے۔ ایک وہ مجلس جو نواب محمد علی خاں نے نواب پیلس میں منعقد کی تھی اور دوسری محلہ چہل بیبیاں میں نثار حویلی میں ہوئی تھی۔ اس میں شمولیت کی دعوت دینے کے لیے نواب صاحب موصوف خود بھی علامہ کے ہاں حاضر ہوئے تھے۔ اس مجلس میں کئی احباب شامل ہوئے تھے۔ خاص کر پروفیسر محمد دین تاثیر، راقم اور بعض دیگر احباب بھی موجود تھے۔ نواب صاحب نے علامہ سے یہ بھی بیان کیا تھا کہ میر جلیل کی خواہش ہے کہ اس مجلس میں لاہور کے اہلِ علم حضرات ضرور شرکت کریں۔ نواب صاحب نے بعض احباب کو چھپے ہوئے دعوت نامے بھی ارسال کیے تھے۔

نواب پیلس والی مجلس میں میر جلیل تین گھنٹے تک اپنا اور اپنے بزرگوں، خاص کر میر انیس، کا کلام پڑھتے رہے ۔ یہ نشست اسی طرح تھی جس طرح اہلِ شیعہ کے ہاں محرّم کی مجالس میں ہوتی ہے۔ تمام حضرات بہت متاثر ہوئے تھے اور خاص کر علامہ اقبال تو کئی دفعہ اشکبار ہوئے ۔ اسی طرح محلہ چہل بیبیاں والی مجلس میں بھی علامہ نے مع احباب کے شرکت کی تھی ۔ اُس روز منشی سراج الدین احمد کشمیر والے بھی موجود تھے اور اس محلے میں یہ مجلس ان کے مکان کے بالکل متصل ہوئی تھی ۔ یہ مجلس بھی پورے تین گھنٹے تک جاری رہی تھی ۔

حضرتِ جلیل نے اپنا طبع زاد کلام بھی سنایا تھا جو سب مرثیے تھے ۔ آپ کی عمر اُس وقت ساٹھ سال سے متجاوز تھی لیکن آپ کی آواز بالکل نوجوانوں کی سی تھی ۔ ایسا رنگ جما کہ ایک ایک بند اور ایک ایک شعر پر احسنت اور صلی علیٰ کے پھول برسائے گئے ۔

آپ کے لاہور میں وارد ہونے پر اہلِ لاہور کے ذوقِ سخن کو تازگی ملی اور آپ کی آمد مبارک تصور کی گئی ۔ خاص کر نواب محمد علی خاں قزلباش کا شکریہ ادا کیا گیا ۔ ان مجالس کے متعلق روزنامہ ''زمیندار'' کے ۲۶ اگست ۱۹۲۶ء کے شمارے میں ایک رپورٹ بھی شائع ہوئی تھی ۔

☆ ☆ ☆

۴۷

ناسازیِ طبیعت

عام طور پر ڈاکٹر سید محمد حسین ہر روز قریباً ۹ - ۱۰ بجے علامہ کی کوٹھی میں اپنے ٹانگے پر آتے اور بے تکلفی سے سیدھے زنانہ حصے میں جا کر خیر و عافیت دریافت کرتے ۔ وہ سیالکوٹ میں علامہ کے ہم مکتب رہ چکے تھے اور علامہ ان کی بے حد عزت کرتے تھے - واپس جانے سے پہلے وہ علامہ کی خیریت بھی دریافت کرتے اور کہتے ''اقبال کیا حال ہے ؟'' علامہ ادب سے جواب دیتے ''شاہ صاحب خیریت ہے -'' ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ اس شخص کا اپنا گھر ہے ۔ دوائی وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو علی بخش ان کے مطب واقع احمدیہ بلڈنگ سے لے آتا ۔ اقبال کے اپنے بعض احباب سے اسی طرح کے بے تکلفانہ تعلقات تھے جن کا عام لوگوں کو علم نہیں ہے -

ایک روز علامہ دردِ گردہ میں مبتلا تھے کہ مرحوم بشیر احمد ابنِ مولوی احمدالدین مزاج پرستی کے لیے آیا ۔ اقبال اس وقت اندرونِ خانہ تھے اور سکون حاصل کرنے کے لیے بلند آواز سے بیدل کی غزل کا یہ شعر بار بار دہرا رہے تھے :

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسبابِ جہاں
ہر چہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

معلوم نہیں اُنھیں بشیر احمد کی آمد کا علم کیسے ہوگیا کہ اسی حالت میں باہر آ گئے ۔ منشی طاہرالدین نے خیریت دریافت کی تو ان کو بھی جواب اسی شعر سے دیا ۔ پھر بشیر احمد مرحوم سے اس طرح ملے جیسے ان کا اپنا لڑکا آ گیا ہو ۔ اس کو جسم دبانے کی اجازت بھی نہ دی ۔

ایک مرتبہ بیماری سے کچھ اضافہ تھا مگر ہائے ہائے برابر کر رہے تھے ۔ منشی طاہر الدین نے دریافت کیا ”خیر تو ہے؟“ جواب دیا ”میں ذرا بیماری کی یاد تازہ کر رہا ہوں ۔“

میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں علامہ سے ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا اور علامہ اپنے ملاقاتیوں سے نہایت اخلاق سے پیش آتے تھے ۔ میں نے اس کوٹھی کو کبھی مرمت ہوتے نہیں دیکھا ۔ اکثر جگہ دیواروں سے پلستر تک غائب ہوگیا تھا ۔ ایک دفعہ گرمیوں کے موسم میں گورنمنٹ کالج کے پروفیسر ایرک ڈکنسن (جو ان دنوں تازہ تازہ علی گڑھ سے آئے تھے) علامہ کی اسی کوٹھی کے درمیانی کمرے میں بیٹھے تھے ۔ کمرے میں نہایت بے ترتیبی چھائی ہوئی تھی اور ایک دیوار پر ملکۂ وکٹوریہ کی رنگین تصویر بغیر شیشے کے آویزاں تھی ۔ پروفیسر ڈکنسن کی نگاہ تصویر پر پڑی تو مسکرا کر علامہ سے پوچھا کہ آپ کو تصاویر کا ذوق بھی ہے ! علامہ نے مسکرا کر تصویر کو اپنے ہاتھ کی ایک جنبش سے حرکت دی تو اس کے پیچھے سے دیوار کا پلستر غائب نظر آیا اور ایک شگاف نمودار ہوگیا ۔ اور یہی اس تصویر کا مصرف تھا ۔ گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ دارا شکوہ پر ایک ڈرامہ تیار کیا جائے مگر علامہ نے یہ ارادہ ملتوی کردیا ۔

☆ ☆ ☆

۴۸

سائمن کمیشن

ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا یک طرفہ فیصلہ کرنے کی غرض سے انگریزوں نے ۷ نومبر ۱۹۲۷ء کو ایک کمیشن قائم کیا تھا جس میں کسی ہندوستانی کو نمایندگی کا حق نہیں دیا گیا تھا ۔ اس کے تمام ممبر انگریز تھے اور صدر کا نام سر جان سائمن تھا ۔ اس کمیشن نے پہلے ۳ فروری ۱۹۲۸ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۲۸ء تک اور پھر ۱۱- اکتوبر ۱۹۲۸ء سے ۱۳ اپریل ۱۹۲۹ء تک ہندوستان بھر کے دورے کیے اور ہر مذہب و ملّت اور ہر طبقۂ خیال کے رہنماؤں سے مل کر ان سے ان کے مافی‌الضمیر کے مطابق تحریری بیانات حاصل کیے ۔ پھر ۱۹۳۰ء میں کمیشن کی رپورٹ دو جلدوں میں شائع کردی گئی ۔

ہندوستان پہلے ہی سیاسی بحران کا شکار تھا ، اس کمیشن کے قیام کا اعلان ہوا تو اس سے تعاون کے سوال پر مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے ۔ اس بات کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا کہ کمیشن میں کسی ہندوستانی کو نمایندگی کیوں نہیں دی گئی ۔ چنانچہ علامہ اقبال نے بھی اس سلسلے میں ۹ نومبر ۱۹۲۷ء کو ایک بیان جاری کیا جو ۱۳ نومبر کے ''انقلاب'' میں شائع ہوا ۔ اسی روز پنجاب مسلم لیگ

کا ایک جلسہ میاں سر محمد شفیع کے مکان پر ہوا ۔ اس میں ایک قرارداد پیش ہوئی جس میں کہا گیا کہ سائمن کمیشن تمام ہندوستانی باشندوں کے مفاد کے لیے بالعموم اور مسلمانانِ ہند کے لیے بالخصوص نقصان کا باعث ہے اس لیے اس کے مقاطعے کا فیصلہ کیا جاتا ہے ۔ یہ قرارداد ملک برکت علی کی ترمیم کے ساتھ منظور ہوئی اور اخبارات میں بھی شائع ہو گئی ۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ، علامہ اقبال اس کمیشن کی ہیئت سے تو متفق نہیں تھے اور انھوں نے اس کے خلاف احتجاج بھی کیا تھا ، تاہم وہ اس بات کے حق میں بھی نہیں تھے کہ کمیشن سے مراسر بائیکاٹ کی پالیسی پر عمل کیا جائے ۔ اس سلسلے میں ان کا بیان ''گفتار اقبال''[۱] میں دیکھا جا سکتا ہے ۔

سائمن کمیشن کی یہ رپورٹ دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی ۔ پہلی جلد کے صفحات ۴۱۰ ہیں اور دوسری جلد ۳۴۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اسے کلکتہ کی مرکزی پبلیکیشن نے ۱۹۳۰ع میں شائع کیا تھا اور قیمت چار روپے تھی ۔

☆ ☆ ☆

۱۔ گفتار اقبال : مرتبہ محمد رفیق افضل ، شائع کردہ دانش گاہ پنجاب لاہور ، صفحات ۱۱۳ - ۱۱۴ ۔

۴۹

دوسری گول میز کانفرنس

(حضرتِ علامہ کا ایک فاضلانہ خطبہ)

ہندوستان کے سیاسی مستقبل سے متعلق انگریز نے تین گول میز کانفرنسیں لندن میں منعقد کی تھیں ۔ یہ کانفرنسیں سائمن کمیشن کے بعد منعقد ہوئی تھیں ۔ پہلی کانفرنس ۱۹ جنوری ۱۹۳۰ء کو ختم ہوئی ، دوسری ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء کو شروع ہو کر یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک رہی اور تیسری نومبر ۱۹۳۲ سے شروع ہو کر ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء تک رہی ۔ دوسری اور تیسری کانفرنس میں علامہ شریک ہوئے تھے ۔

پہلی کانفرنس میں جہاں کانگریس اور مسلم کانفرنس کے دوسرے اکابر نے حکومتِ برطانیہ کے مدبّرین سے گفت و شنید کی تھی ، وہاں مولانا محمد علی جوہر بھی باوجود شدید علالت کے مع اپنی بیگم صاحبہ کے شریک ہوئے تھے ۔ لندن کی اس گول میز کانفرنس میں مولانا نے آزادیِ وطن کے موضوع پر اپنی زندگی کی آخری تقریر کی تھی ۔ آپ نے اپنی اس تقریر میں فرمایا تھا کہ میں لندن میں اس عزم کے ساتھ آیا ہوں کہ یہاں سے ہندوستان کی آزادی کا پروانہ لے کر جاؤں گا ۔ میں نے عہد کیا ہے کہ یا تو وطن کی آزادی لے کر جاؤں گا ورنہ یہیں اپنی جان دے دوں گا ۔ میں اپنی اہلیہ کو اس

لیے اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں تاکہ وہ میری موت کے بعد میری تجہیز و تکفین کا انتظام کریں - معلوم نہیں کیسے وقت میں اور کس جذبے سے مولانا نے یہ الفاظ اپنی زبان سے کہے تھے کہ آزادی تو اس موقع پر نہ مل سکی مگر ۴ جنوری ۱۹۳۰ء کو وہیں لندن میں انہوں نے اپنی جان دے دی اور یوں ایک دور کا خاتمہ ہو گیا - وہ ذیابیطس کے موذی مرض میں مبتلا تھے - چنانچہ مولانا کا جسدِ خاکی مفتیِ اعظم فلسطین اپنے ہمراہ بیت المقدس لے گئے اور علامہ اقبال اور دیگر اکابر کے مشورے سے انہیں مسجدِ اقصیٰ کے ایک گوشے میں سپردِ خاک کردیا گیا - اس موقع پر علامہ نے فرمایا تھا:

خاکِ قدس او را بہ آغوشِ تمنا گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

اس بطلِ حریت نے جس قدر اذیتیں اور صعوبتیں آزادیِ وطن کے لیے برداشت کیں، وہ ایک الگ داستان ہے - شہادت کی جو سعادت انہیں نصیب ہوئی وہ اور کسی کے حصے میں نہ آ سکی - جب ان کی وفات کی خبر ہندوستان میں پہنچی تو اہلِ وطن پھوٹ پھوٹ کر روئے - آج بھی ان کی یاد اور ان کی قربانیاں یاد کر کر کے دلوں کو ایک تازہ ولولہ نصیب ہوتا ہے -

اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس بھی لندن میں منعقد ہوئی جس میں علامہ اقبال نے بھی شرکت کی - آپ کے ہمراہ مولانا غلام رسول مہر مدیرِ ''انقلاب'' بھی تھے - یہ کانفرنس ۱۷ ستمبر سے شروع ہو کر یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک رہی تھی -

اس کانفرنس میں علامہ اقبال مسلمانوں کے حقوق و مطالبات منوانے کے لیے سب سے پیش پیش تھے - سر آغا خاں بھی اس کانفرنس میں آپ کے شریکِ مشورہ تھے اور وہ بھی لندن میں موجود تھے - اس

موقع پر متعدد علمی مجالس بھی منعقد ہوئی تھیں - سر فرانسس ینگ اُس زمانے میں انڈین سوسائٹی لندن کے صدر تھے - اسی زمانے میں علامہ نے ایک مضمون اپنے استاد میک ٹیگریٹ کے متعلق لکھا تھا جو آپ کے زمانۂ طالب علمی (کیمبرج ۱۹۰۷ع) میں پروفیسر تھا - یہ مضمون انڈین سوسائٹی لندن کے مجلے میں طبع ہو چکا ہے - لندن میں متعدد حضرات نے آپ سے ملاقاتیں کی تھیں اور کئی انجمنوں نے آپ کے اعزاز میں جلسے کیے تھے - چنانچہ ایک متحد جلسہ انڈین سوسائٹی لندن کے زیراہتمام ہوا تھا جس کی صدارت سوسائٹی کے صدر سر فرانسس ینگ نے کی تھی - اس جلسے میں علامہ نے اپنی فارسی تصنیفات سے متعدد اشعار بھی سنائے تھے - اس جلسے کی رپورٹ مولانا غلام رسول مہر صاحب نے روزنامہ ''انقلاب'' کے لیے بھیجی تھی جو ۲۲ نومبر ۱۹۳۱ع کو شائع ہوئی تھی - اسے ہم یہاں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں - اس سے واضح ہوگا کہ علامہ نے کس طرح اپنے کلام کو مربوط طریق پر پیش کیا ہے :

''انڈیا سوسائٹی کی دعوت پر علامہ اقبال کا فاضلانہ خطبہ''

اپنے شعر اور فلسفے کی دلکشا تشریح و تفسیر

(مولانا مہر کا مکتوب)

شام کو پانچ بجے انڈیا سوسائٹی کی دعوت پر حضرت علامہ اقبال نے ایک عالمانہ خطبہ ارشاد فرمایا - سر فرانسس ینگ اس جلسے کے صدر تھے - صاحبِ موصوف نے نہایت موزوں الفاظ میں حضرت علامہ کا تعارف کرایا اور فرمایا کہ سرزمینِ مشرق کا نہایت بلند پایہ شاعر و فلاسفر آج اپنے کلام کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرے گا -

حضرتِ علامہ نے خطبے کے آغاز میں فرمایا کہ بے شک میرے اشعار میں مختلف مسائل کے متعلق فلسفیانہ خیالات موجود ہیں لیکن میرا کوئی منظّم و مرتّب فلسفہ نہیں ہے - البتہ فلسفے کے ایک مسئلے

یعنی حیات بعد الممات کے ساتھ مجھے خاص دلچسپی رہی ہے۔ میں انسان کے شاندار اور درخشاں مستقبل کا پختہ یقین رکھتا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسان نظامِ کائنات میں ایک مستقل عنصر کی حیثیت حاصل کرنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے۔ یہ عقیدہ میرے خیالات و افکار میں آپ کو عموماً جاری و ساری نظر آئے گا۔ چنانچہ حضرتِ علامہ نے متعدد اشعار اس عقیدے کی توضیح کے سلسلے میں پیش فرمائے اور ان کا انگریزی ترجمہ سنایا:

فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از گردشِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے
خیالِ ما کہ او را پرورش دادند از طوفاں
ز گردابِ سپہرِ نیلگوں بیروں شود روزے
یکے در معنیِ آدم نگر، از من چہ مے پرسی
ہنوز اندر طبیعت مے خلد، موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیرِ او پُرخوں شود روزے

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرم سار تر گردد

ازاں مرگے کہ می آید، چہ باک است
خودی چوں پختہ شد، از مرگ پاک است

اس کے بعد حضرتِ علامہ نے فرمایا کہ پروفیسر ڈاکٹر آرنلڈ نے شاعری کی تعریف یہ کی ہے کہ یہ زندگی کا انتقاد ہے (Criticism of Life)۔ میں اس کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں بشرطیکہ محض "لائف" نہیں بلکہ

ڈیوائن لائف کا انتقاد کہا جائے ۔ پھر حضرت علامہ نے ڈیوائن لائف کے انتقاد کے اسلوب و انداز کی وضاحت کرتے ہوئے ذیل کے اشعار مع ترجمہ سنائے :

این جہاں چیست صنم خانۂ پندار من است
جلوۂ او گرو دیدۂ بیدار من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من
چہ زمان و چہ مکاں شوخی افکار من است
ساز تقدیرم و صد نغمۂ پنہاں دارم
ہر کجا زخمۂ اندیشہ رسد، تار من است
اے من از فیض تو پایندہ، نشان تو کجاست ؟
این دو گیتی اثر ماست، جہان تو کجاست ؟

حسن و زوال :

پھر حضرت ممدوح نے اپنی نظموں میں سے تین مختلف ٹکڑے اپنی شاعری کے عام انداز و اسلوب کی وضاحت کے سلسلے میں پیش کیے ۔ سب سے پہلی اردو کی نظم ''حسن'' تھی ۔ آپ نے فرمایا کہ آج سے تقریباً ۲۵ سال پیشتر کیمبرج میں یہ نظم لکھی گئی تھی ۔ اصل خیال جرمن شاعر سے لیا گیا تھا لیکن میں نے اس کو بہت وسیع کر دیا :

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی
حسین وہی ہے، حقیقت زوال ہے جس کی

حضرت نے فرمایا کہ یہاں تک جرمن شاعر کا خیال تھا۔ آگے جو کچھ ہے، وہ میرا ہے:

کہیں قریب تھا، یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی، اخترِ سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا، سوگوار گیا

حور و شاعر:

دوسری نظم ''حور و شاعر'' سنائی جس کے اشعار درج ذیل ہیں:

حور:

نہ بہ بادہ میل داری، نہ بہ من نظر کشائی
عجب این کہ تو نہ دانی رہ و رسمِ پارسائی
ہمہ ساز جستجوئے، ہمہ سوز آرزوئے
نفسے کہ می گذاری، غزلے کہ می سرائی
بہ نوائے آفریدی، چہ جہانِ دلکشائے
کہ ارم بہ چشمم آید چو طلسم سیمیائی

شاعر:

دلِ رہرواں فریبی بہ کلامِ نیش دارے
مگر این کہ لذتِ او نہ رسد بہ نوکِ خارے
چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ، ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے نہ دارم کہ بہ میرم از قرارے
چو ز بادۂ بہارے ، قدحے کشیدہ خیزم
غزلے دگر سرایم بہ ہوائے نوبہارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد
بہ نگاہِ ناشکیبے ، بہ دلِ امیدوارے
دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے
نہ نواے دردمندے ، نہ غمے ، نہ غمگسارے

بوئے گل :

تیسری نظم 'بوئے گل' تھی :

حورے بہ کنجِ گلشنِ جنّت تپید و گفت
مارا کسے ز آنسوے گردوں خبر نہ داد
ناید بہ فہمِ من سحر و شام و روز و شب
عقلم ربود ایں کہ بہ گویند مُرد و زاد
گردید موجِ نکہت و از شاخِ گل دمید
با ایں چنیں بہ عالمِ فردا و دی نہاد
وا کرد چشم و غنچہ شد و خندہ زد دمے
گل گشت و برگ برگ شد و بر زمیں فتاد
زاں نازنیں کہ بند زپایش کشادہ اند
آہے است یادگار کہ بُو نام دادہ اند

اسرارِ خودی ، رموزِ بیخودی ، پیامِ مشرق :

یہ تین نظمیں سنانے کے بعد حضرتِ علامہ نے اپنی فارسی تصانیف کی مختصر سی کیفیت بیان فرمائی - آپ نے فرمایا کہ میری مثنوی ''اسرارِ خودی'' کا ترجمہ پروفیسر نکلسن انگریزی زبان میں کر چکے ہیں ، اس لیے اس کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں - میری دوسری مثنوی ''رموزِ بے خودی'' ہے - ''اسرارِ خودی'' فرد کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے اور ''رموزِ بے خودی'' میں قوموں اور جماعتوں کی زندگی کے اسرار و معارف بیان کیے گئے ہیں - میری تیسری تصنیف ''پیامِ مشرق'' ہے جو گوئٹے کے دیوان کے انداز و اسلوب پر لکھی گئی تھی - اس کے بعض حصوں میں جرمن شاعر ہائنا اور گوئٹے کا جواب ہے - آغاز میں رباعیات ہیں جو مشہور صوفی شاعر بابا طاہر عریاں کے تتبع میں لکھی گئی ہیں - مثلاً آرٹ اور نیچر کی بحث کے متعلق یہ رباعی :

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت
فروغِ زندگی تابِ شرر بود
و لیکن گر نہ رنجی با تو گویم
صنم از آدمی پاینده تر بود

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور
کہ جانِ تو ز خود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

اس کتاب میں یورپین مسائل کے متعلق بھی نظمیں ہیں - مثلاً

جس زمانے میں سمندروں کی آزادی پر بحث ہو رہی تھی ، میں نے اس مسئلے کے متعلق لکھا تھا :

بطے می گفت بحر آزاد گردید
چنیں فرماں ز دیوانِ خضر رفت
نہنگے گفت رو ہر جا کہ خواہی
ولے از ما نباید بے خبر رفت

"زبورِ عجم" کے معانیِ عالیہ :

"پیامِ مشرق" کے بعد میری تصنیف "زبورِ عجم" شائع ہوئی جس کے تین حصے ہیں ؛ اوّل غزلیات ، دوم گلشنِ راز ، سوم بندگی نامہ۔ حصۂ اوّل پھر تین حصوں میں منقسم ہے ؛ اوّل خدا ، دوم انسان ، سوم بزمِ قدرت ۔ "گلشنِ راز" سے آپ آگاہ ہوں گے اس لیے کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے ۔ یہ ایران کے مشہور صوفی اور فلاسفر محمود شبستری کی مثنوی ہے ۔ خراسان کے باشندوں نے محمود سے تیرہ سوال کیے تھے جن کا جواب ترتیب وار اس نے 'گلشن راز' میں دیا ہے ۔ میں نے ان میں سے نو سوال لیے ہیں اور موجودہ زمانے کے مقتضیات و احوال کو مدِ نظر رکھ کر ان کا جواب دیا ہے ۔ اس ضمن میں یورپ کی جمہوریت ، مذہب و سیاست کی علیحدگی اور اس قسم کے بہت سے اہم مسائل زیرِ بحث آئے ہیں ۔ مثلاً جمہوریت کے متعلق میں نے لکھا ہے :

فرنگ آئینِ جمہوری نہاد است
رسن از گردنِ دیوے کشاد است
گروہے را گروہے در کمین است
خدایش یار گر کارش چنین است

مذہب و سیاست کی علیحدگی کے متعلق لکھا ہے :

خرد را با دلِ خود ہم سفر کن
یکے بر ملّتِ ُترکاں نظر کن
بہ تقلیدِ فرنگ از خود رمیدند
میانِ ملک و دیں ربطے نہ دیدند
بہ کف بردن جہانِ چار سو را
مقامِ نور و صوت و رنگ و بو را
فزونش کم ، کمِ او بیش کردن
دگرگوں بر مرادِ خویش کردن
بہ رنج و راحتِ او دل نہ بستن
طلسمِ ُنہ سپہرِ او شکستن
فرو رفتن چو پیکاں در ضمیرش
ندادن گندمِ خود با شعیرش
شکوہِ خسروی این است این است
ہمیں ملک است کو توام بہ این است

"گلشن راز جدید" کے اردو اشعار بھی حضرتِ علامہ نے سنائے لیکن "بندگی نامہ" کا ذکر نہ کیا ۔

"جاوید نامہ" کا ذکر :

آخر میں فرمایا کہ میری ایک تازہ تصنیف "جاوید نامہ" بھی مطبع میں جا چکی ہے اور غالباً ایک دو مہینے میں چھپ جائے گی ۔ یہ حقیقت میں ایشیا کی "ڈیوائن کامیڈی" ہے جیسے ڈانٹے کی تصنیف یورپ کی "ڈیوائن کامیڈی" ہے ۔ اس کا اسلوب یہ ہے کہ شاعر

مختلف ستاروں کی سیر کرتا ہے اور اس میں مختلف مشاہیر کی روحوں سے مل کر ان سے باتیں کرتا ہے ۔ پھر جنّت میں جاتا ہے اور آخر میں خدا کے سامنے پہنچتا ہے ۔ اس تصنیف میں دورِ حاضر کے تمام جماعتی ، اقتصادی ، سیاسی ، مذہبی ، اخلاقی اور اصلاحی مسائل زیر بحث آ گئے ہیں ۔ اس میں صرف دو شخصیتیں یورپ کی آئی ہیں ؛ اوّل کچنر ، دوم نٹشا ۔ باقی تمام شخصیتیں ایشیا کی ہیں ۔ ڈانٹے نے اپنا رفیقِ سفر یا خضرِ طریق ''ورجل'' کو بنایا تھا ۔ میرے رفیقِ سفر یا خضرِ طریق ''مولانا روم'' ہیں ۔ میں اس تصنیف میں سے صرف ایک دو مثالیں ہی پیش کر سکتا ہوں ؛ مثلاً چاند میں ہندوستان کے مشہور ہندو صوفی وشوامتر سے ملاقات ہوتی ہے جس کا نام میں نے ''جاوید نامہ'' میں ''جہاں دوست'' رکھا ہے ، اس لیے کہ وشوامتر کے معنی جہاں دوست کے ہیں ۔ وشوامتر سے جو باتیں ہوئیں ، انھیں میں نے '''نہ تا سخن از عارفِ ہندی'' کے عنوان سے پیش کیا ہے :

گفت مرگِ عقل ؟ گفتم ترکِ فکر
گفت مرگِ قلب ؟ گفتم ترکِ ذکر
گفت آدم ؟ گفتم از اسرارِ اوست
گفت عالم ؟ گفتم او خود روبروست
گفت ایں علم و ہنر ؟ گفتم کہ پوست
گفت حجّت چیست ؟ گفتم روئے دوست
گفت دینِ عامیاں ؟ گفتم شنید
گفت دینِ عارفاں ؟ گفتم کہ دید

کچنر اور فرعون :

آپ حیران ہوں گے کہ کچنر اس ضمن میں کیسے آ گیا ہے ؟

"جاوید نامہ" میں کچنر اور فرعون آپس میں باتیں کرتے ہیں ۔ فرعون ، کچنر کو طعنہ دیتا ہے کہ یورپ کے لوگ بڑے بے رحم اور بڑے بے درد ہیں ۔ انھوں نے ہماری قبریں تک کھود ڈالی ہیں ۔ کچنر جواب دیتا ہے کہ ہمارا مقصد سائنس کی خدمت ہے ، علم الآثار کی خدمت ہے ۔ قبریں اس لیے کھودی گئی ہیں کہ معلوم ہو کہ آج سے تین چار ہزار سال قبل دنیا کی حالت کیا تھی ۔ فرعون اس تشریح کے جواب میں کہتا ہے :

قبرِ ما را علم و حکمت بر کشود
لیکن اندر تربتِ مہدی چہ بود ؟

(قارئینِ کرام کو معلوم ہوگا کہ لارڈ کچنر کی قیادت میں جب انگریز امِ درمان پر قابض ہوئے تھے تو مشہور ہے کہ انھوں نے سوڈان کی تحریکِ آزادی کے عظیم رہنما حضرت مہدی سوڈانی رحمتہ اللہ علیہ کی قبر تک کھدوا ڈالی تھی ۔ اوپر کے شعر کے آخری مصرع میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے) ۔

الواحِ اربعہ :

حضرتِ علامہ نے فرمایا کہ ایک مقام پر میں نے چار الواح لکھی ہیں : لوحِ بدھ ، لوحِ مسیح ، لوح زرتشت اور لوحِ محمدؐ ۔ لوحِ مسیح میں ٹالسٹائے کا ایک خواب ہے ، لوحِ زرتشت میں اسلامی تصوّف کے مشہور مسئلے فضیلتِ نبوّت بر ولایت یا ولایت بر نبوت کے متعلق بحث ہے ۔ لوح محمدؐ کا مضمون یہ ہے کہ کعبے میں بت ٹوٹے پڑے ہیں ۔ ابوجہل کی روح گریہ و زاری کر رہی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے کہہ رہی ہے کہ انھوں نے ہمارے دین

کو برباد کردیا ، ہماری خاندانی بلند پایگی زائل کر ڈالی اور مساوات کی تعلیم دینی شروع کردی جو مزدکیوں سے حاصل کی گئی ہے وغیرہ ۔

مسٹر عبداللہ یوسف علی کی تقریر :

آخر میں حضرتِ علامہ نے فرمایا کہ وقت بہت کم تھا ، اس لیے کہ آج اسی وقت لارڈ ارون اور لیڈی ارون کی طرف سے بھی ایک پارٹی ہے جس میں بعض دوستوں کو جانا ہے اور خود مجھے بھی جانا ہے ، اس لیے میں اس لکچر کو ختم کرتا ہوں ۔ سر فرانسس ینگ ہسبینڈ نے آخر میں پھر حضرتِ علامہ کا شکریہ ادا کیا اور مسٹر عبداللہ یوسف علی کو صدرِ جلسہ بنا کر صاحبِ موصوف چلے گئے ۔ مسٹر عبداللہ یوسف علی نے سب سے پہلے حاضرین سے کہا کہ اگر کسی صاحب کو حضرتِ علامہ اقبال سے سوال کرنا ہو تو کرے ۔ ایک صاحب نے ایک دو سوالات انسانی ''انا'' یا خودی کے متعلق پوچھے ۔ اس کے بعد خود مسٹر عبداللہ یوسف علی نے حضرتِ علامہ کے بعض اشعار پڑھ کر ان کی تشریح کی ۔ آخر میں کہا کہ حضرت علامہ فرانس کے شاعر اور ڈرامہ ٹسٹ پال کلوڈے سے مشابہت رکھتے ہیں جو اس وقت زندہ ہے ، لیکن افسوس کہ انگلستان کے لوگ اس سے زیادہ باخبر نہیں ہیں ۔ پال کلوڈے کی تصانیف کی دو خوبیاں ہیں ؛ اولاً وہ جو کچھ لکھتا ہے ، مثال کے رنگ میں لکھتا ہے ۔ ثانیاً وہ رومن کیتھولک مذہب کے کسی خیال کو لے کر موجودہ زمانے کے حقائق کے رنگ میں بیان کرتا ہے ۔ اس کے تمام جذبات کا محرک دین کا احیا ہے ۔ یہی دو خصوصیتیں میرے خیال میں حضرت علامہ

اقبال کی ہیں ۔ آخر میں مسٹر عبداللہ یوسف علی نے دوبارہ حضرتِ علامہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ٦ نومبر کو حضرت کے اعزاز میں جس خاص تقریب کا انتظام کیا گیا ہے ، اُمید ہے کہ اس تقریب میں ہمیں حضرتِ علامہ سے استفادے کا مزید موقع ملے گا ۔ سات بجے کے قریب یہ صحبت ختم ہوئی ۔

۵۰

مولوی محمد شفیع داؤدی

آپ صوبہ بہار کے رہنے والے تھے - پٹنے میں ان کا مکان تھا جہاں راقم نے بھی ایک مرتبہ قیام کیا تھا - مشہور سیاسی کارکن تھے اور اکثر اسمبلیوں کے رکن منتخب ہوتے رہے تھے - ۱۹۳۱ع میں جب علامہ اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن گئے تھے تو مولوی محمد شفیع داؤدی کو بھی گورنمنٹ نے اس کانفرنس میں بھیجا تھا - اس موقعے پر مولانا غلام رسول مہر مرحوم بھی حضرتِ علامہ کے ہمراہ تھے - مولوی صاحب بڑے دلچسپ آدمی تھے - کانفرنس کے موقعے پر ان کی نشست و برخاست بیشتر علامہ کے ساتھ رہتی تھی اور علامہ ہمیشہ انھیں اپنی حسِ مذاح کا نشانہ بنائے رکھتے تھے - اس موقعے پر مولوی صاحب سے بہت سے لطیفے سرزد ہوئے جنھیں حضرتِ علامہ مزے لے لے کر اپنے دوستوں کو سنایا کرتے تھے - ایک روز فرمانے لگے کہ کانفرنس کے دنوں میں ایک دن صبح ہی صبح ایک لیڈی نے مولوی صاحب کو ٹیلیفون کیا اور بتایا کہ آدھے گھنٹے کے بعد ایک جلسہ ہو رہا ہے جس میں آپ کی شرکت نہایت ضروری ہے - مولوی صاحب نے انگریزی میں جواب دیا کہ I am not yet dressed - لیڈی ان کی انگریزی سے بہت

محظوظ ہوئی اور پوچھنے لگی Dressed ?—Are you a . . . or what ۔
مولوی صاحب بہت پریشان ہوئے کہ کیا جواب دیں ۔ پھر جب انہوں نے علامہ سے اس گفتگو کا ذکر کیا تو وہ بہت ہنسے اور دیر تک انہیں Dressed up کے معنی سمجھاتے رہے ۔

مولوی محمد شفیع صاحب جب کانفرنس سے فارغ ہوئے تو پیرس دیکھنے کا ارادہ کیا اور حضرتِ علامہ سے درخواست کی کہ پیرس میں اپنے کسی جاننے والے کے نام رقعہ دے دیجیے تاکہ وہ مجھے پیرس کی سیر کرا دے ۔ چنانچہ علامہ نے انہیں اقبال شیدائی کے نام رقعہ دے دیا اور وہ پیرس پہنچ گئے ۔ اقبال شیدائی نے انہیں پیرس کی جو سیر کرائی ، مولوی صاحب اس سیر سے کچھ زیادہ مطمئن نہ ہوئے اور فرمانے لگے کہ شیدائی صاحب ! ''اصل پیرس'' کی سیر بھی تو کرائیے ۔ ''اصل پیرس'' سے ان کی مراد نائٹ کلب وغیرہ سے تھی ۔ چنانچہ شیدائی صاحب نے ان کی یہ خواہش بھی پوری کر دی ۔ مگر بقول شیدائی کے وہ وہاں کے ہر عمل میں بذاتِ خود شامل ہونا چاہتے تھے ۔ چند روز بعد جب علامہ اقبال خود بھی پیرس پہنچ گئے تو اقبال شیدائی نے وہ تمام لطائف ، جو مولوی صاحب سے سرزد ہوئے تھے ، من و عن انہیں سنا دیے جس سے حضرت علامہ بہت محظوظ ہوئے اور پھر ہمیں بھی سناتے رہے ۔

ایک مرتبہ حضرتِ علامہ نے فرمایا کہ گول میز کانفرنس سے واپسی پر جب ہم عدن کی بندرگاہ پر پہنچے تو جہاز سے اتر کر کنارے پر آ گئے ۔ یہاں چھوٹے چھوٹے غوطہ خور لڑکے سمندر سے سکے پکڑنے کے کرتب دکھا رہے تھے ۔ جہاز کے مسافر چھوٹے چھوٹے سکے سمندر میں پھینکتے اور یہ لڑکے نہایت پھرتی سے غوطہ لگا کر وہ پیسے دانتوں میں پکڑ کر باہر نکال لاتے اور

پھر انھیں اپنے منہ میں رکھ لیتے - ہم لوگ یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ دفعتہً مولوی شفیع داؤدی صاحب کے چیخنے کی آواز آئی - وہ ان لڑکوں کو مخاطب کر کے مختلف آیتیں پڑھے جا رہے تھے - پہلے تو وہ لڑکے کچھ نہ سمجھے مگر جب مولوی صاحب نے عین اپنے سامنے سمندر کی طرف بار بار ہاتھ سے اشارہ کیا تو ایک لڑکے نے وہیں غوطہ لگایا اور تھوڑی دیر بعد پانی میں بھیگی ہوئی ایک کتاب نکال لایا اور اسے مولوی صاحب کی طرف اُچھال دیا — ہوا دراصل یوں تھا کہ جب ہم لوگ لڑکوں کے کرتب دیکھ رہے تھے تو مولوی صاحب کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جو عالمِ محویت میں ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر سمندر میں جا پڑی - چونکہ مولوی صاحب عربی زبان سے ناواقف تھے لہٰذا پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں، لڑکوں کو مخاطب کرنے کے لیے، اُنھوں نے عربی کے وہ تمام فقرے اور آیات پڑھ ڈالیں جو انھیں یاد تھیں - مثلاً ''یا شیخ ! یا شیخ —— ذالک الکتاب لا ریب فیہ —— لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم —— ان اللہ علٰی کل شیئی قدیر'' وغیرہ - ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جب ہمیں اصل صورتِ حال کا علم ہوا تو ہم ہنستے ہنستے لوٹ گئے -

☆ ☆ ☆

۵۱

اٹلی اور مصر و فلسطین کی سیاحت

علامہ اقبال جب ۱۹۳۱ء کی دوسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہوئے تو مقررہ پروگرام کے تحت مؤتمر عالم اسلامی (بیت المقدس، فلسطین) میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے۔ فلسطین پہنچنے کا پروگرام دراصل فرانس، اٹلی اور مصر (قاہرہ) کے راستے طے ہوا تھا۔ چنانچہ اٹلی میں آپ نے امیر امان اللہ خاں اور مسولینی سے ملاقات کی اور پھر وہاں سے قاہرہ آ گئے۔ آپ نے شیخِ جامعۂ ازہر پروفیسر مصطفیٰ شلطوط کو اپنی آمد کا خط لکھا تھا اور ملاقات کی خواہش کی تھی۔ چنانچہ جامعہ کے پروفیسر عبدالوھاب عزام پاشا نے آپ کا خیرمقدم کیا (یہ صاحب، پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان میں مصر کی طرف سے سفیر بھی رہ چکے ہیں)۔ انھوں نے علامہ کے جامعۂ ازہر جانے پر ہفتہ وار اخبار ''السبوعہ'' میں تین نہایت جامع مضامین بھی لکھے تھے۔ آپ فارسی زبان کے بھی عالم تھے۔ انھوں نے ان مضامین میں علامہ کو پہلی بار عربی دنیا سے روشناس کرایا تھا اور آپ کی کتاب ''پیامِ مشرق'' کا عربی میں ترجمہ بھی (۱۹۵۰ء میں) کیا تھا جو پاکستان میں طبع ہوا تھا۔ بعد میں علامہ صاحب وہ مضامین، جو ''السبوعہ'' میں طبع ہوئے تھے، اپنے ہمراہ لائے تھے اور مجھے بھی

عنایت کیے تھے ۔ اخبار ''السبوعہ'' اقبال اکیڈمی میں محفوظ ہے ۔ قاہرہ میں علامہ نے پروفیسر عزام پاشا کے کہنے پر لیکچر بھی دیے تھے ۔

چنانچہ ان ملکوں کی سیاحت کے بعد ڈاکٹر صاحب ۵ دسمبر ۱۹۳۱ء کو بذریعۂ ریل فلسطین پہنچے اور بیت المقدس میں مؤتمر عالمِ اسلامی میں شرکت فرما کر ایک دلآویز عالمانہ تقریر فرمائی ۔ مؤتمر میں علامہ کی شرکت دراصل مفتیِ اعظم فلسطین سیّد امین الحسینی کی مساعیِ جمیلہ کا ثمرہ تھی جن کا ڈاکٹر صاحب بہت احترام کرتے تھے ۔ وہ اس کانفرنس کے ذریعے فلسطین میں یہودیوں اور عیسائیوں کی عرب دشمنی اور مسلم کش پالیسیوں کے خلاف تمام دنیائے اسلام کی رائے عامہ بیدار کرنا چاہتے تھے ۔ علامہ کی تقریر کا موضوع ''اتحاد بین المسلمین'' تھا جو ایک یادگار تقریر تھی ۔

اس کانفرنس کے بعد آپ نے بیت المقدس اور فلسطین کے آثارِ قدیمہ بھی دیکھے جن کا وہ اکثر احباب سے ذکر کیا کرتے تھے ۔ قرآن کریم کی آیت ''یخرجونھم من النور الی الظلمات'' کی تشریح یوں کیا کرتے تھے کہ اسلام نے دنیا میں نور اسلام پھیلایا ورنہ اس سے پیشتر یہ دنیا ظلمات یعنی اندھیروں میں لپٹی ہوئی تھی ۔ گفتگو میں وہ اکثر وہاں کے آثار کا ذکر کیا کرتے تھے ۔

بیت المقدس میں آپ نے مولانا محمد علی جوہر کی قبر پر فاتحہ بھی پڑھا تھا ۔ پھر فلسطین سے ۱۵ دسمبر کو بمبئی کے لیے روانہ ہوئے اور بمبئی پہنچ کر خلافت ہاؤس میں قیام فرمایا ۔ ۳۰ دسمبر کو آپ لاہور کے لیے روانہ ہوگئے ۔

☆ ☆ ☆

۵۲

تیسری گول میز کانفرنس

(سید امجد علی کی رفاقت)

لاہور کے معروف گھرانوں میں سید مراتب علی شاہ کا خاندان ایک ممتاز خاندان شمار ہوتا ہے - ۱۹۳۲ء میں جب علامہ اقبال نے تیسری گول میز کانفرنس میں ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر غور و خوض کرنے کے لیے انگلستان کا سفر اختیار کیا تو سید امجد علی شاہ آپ کے رفیقِ سفر تھے - سید امجد علی صاحب ، مسلم ڈیلیگیشن کے آنریری سیکرٹری کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے تھے - وہ آخر تک علامہ کے ساتھ رہے - انھوں نے ایک ساتھ لاہور سے سفر شروع کیا - بمبئی پہنچے تو افغانستان کونسل خانے کے سربراہ مسٹر سلجوق نے آپ کا استقبال کیا - قیامِ بمبئی کے دوران میں عطیہ بیگم کے ہاں بھی سید امجد علی کے ہمراہ گئے - پھر بمبئی سے اکٹھے جہاز میں سوار ہوئے - علامہ راستے میں کچھ علیل بھی ہو گئے تھے - جب وینس پہنچے تو علامہ اقبال نے بقیہ سفرِ یورپ بذریعۂ ریل اختیار کیا اور دو روز بعد یہ دونوں حضرات پیرس پہنچ گئے -

پیرس کے سٹیشن پر ان کا استقبال سردار امراؤ سنگھ شیر گل مجیٹھیا نے کیا جو سردار سندر سنگھ مجیٹھیا کے بھائی تھے اور علامہ

کے خاص احباب میں سے تھے ۔ علامہ نے پیرس پہنچ کر سابقہ پروگرام کے تحت نپولین بوناپارٹ کا مقبرہ دیکھا اور اس کے بعد پروفیسر لوئی میسینیون سے ملاقات کی ۔ امراؤ سنگھ اور سید امجد علی بھی آپ کے ہمراہ رہے ۔ اس ملاقات میں شیخِ اکبر محی الدین ابن عربی کی کتاب ''فصوص الحکم'' پر گفتگو ہوئی اور نظریۂ وحدت الوجود زیرِ بحث آیا ۔ سردار امراؤ سنگھ کی لڑکی امرتا شیر گل اس زمانے میں وہاں کے ایک اعلیٰ آرٹ کالج میں مصوری کی تعلیم حاصل کر رہی تھی جو بعد میں ہندوستان کی مایۂ ناز مصور بنی ۔ امراؤ سنگھ نے ''اے وائس فرام دی ایسٹ'' (نواب ذوالفقار علی خاں نے علامہ کے متعلق انگریزی میں یہ کتاب لکھی تھی) کا مقدمہ بھی انگریزی زبان میں لکھا تھا ۔ قیامِ پیرس کے دوران میں آپ کی ملاقات مسٹر اقبال شیدائی اور ان کی اہلیہ سے بھی ہوئی تھی جو ایک فرانسیسی خاتون تھیں ۔ پیرس سے فارغ ہو کر یہ حضرات لندن پہنچ گئے ۔ لندن میں آپ ملکہ این کے محل میں فروکش ہوئے تھے اور وہیں سب احباب آپ سے ملاقات کی غرض سے آتے تھے ۔ نو مسلم خالد شیلڈرک اور جان برائٹ نے یہاں آپ کا استقبال کیا تھا ۔

لندن میں ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں نیشنل لیگ آف لندن کی جانب سے سینٹ جیمز پیلس میں ایک استقبالیہ دعوت کا انتظام ہوا جس میں متعدد اہلِ علم نے شرکت کی تھی ۔ اس دعوت میں سر آغا خاں اور گول میز کانفرنس کے بیشتر شرکا کے علاوہ بعض رؤسائے غیر ممالک نے بھی شرکت کی تھی ۔ اس استقبالیے میں علامہ نے اسلامی نقطۂ نگاہ سے اور مسلمانوں کی خدمات کے ضمن میں ایک شاندار تقریر کی تھی ۔ میں بھی اس دعوت میں موجود تھا ۔ سید امجد علی شاہ نے اس کانفرنس کے انعقاد میں بہت کوشش کی تھی ۔ لارڈ

لیمنگٹن ، جو صوبہ بمبئی کے گورنر رہ چکے تھے ، اس کانفرنس کے صدر تھے اور انھوں نے ایک تقریر بھی کی تھی۔ اس جلسے کی تمام مطبوعہ کارروائی اقبال اکیڈمی میں موجود ہے۔

ان ایام میں علامہ لندن میں بیمار پڑ گئے تھے اور ان کی ناک پر ، بالکل کونے میں ، ایک پھوڑا سا پیدا ہو گیا تھا جس نے آپ کو بہت پریشان کیا تھا ۔ اس کی وجہ سے کچھ بخار بھی آپ کو ہو گیا ۔ اُس وقت ڈاکٹر رحمت اللہ قریشی ، جو ایبٹ آباد کے باشندہ تھے ، لندن میں پریکٹس کرتے تھے اور انھوں نے ہی آپ کا علاج کیا تھا ۔ مجھے یاد ہے کہ ان کی ہدایت کے مطابق میں اور سید امجد علی ، علامہ کی ناک پر ٹکور کیا کرتے تھے مگر تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔

ایک شام بعض ارکانِ کانفرنس ، جن میں سر اکبر حیدری ، ملک عمر حیات خاں ٹوانہ ، سر ظفر اللہ خاں اور سر شفاعت احمد خاں شامل تھے ، آپ کی مزاج پُرسی کے لیے آ گئے اور انھوں نے نہایت ہمدردانہ طریقے پر آپ کو حوصلہ دیا ۔ دورانِ گفتگو میں ملک عمر حیات ٹوانہ نے پنجابی زبان میں از راہِ بے تکلفی کہا کہ میرے ایک دوست کی ناک پر بھی اسی طرح پھوڑا ہو گیا تھا اور وہ مر گیا تھا جس پر علامہ بہت پریشان ہوئے ۔ سید امجد علی شاہ سے کہا کہ اسی وقت لاہور میں مختار (علامہ کے بھائی کے لڑکے) کو تار دو کہ وہ جاوید اور جاوید کی والدہ کو لے کر فوراً یہاں پہنچ جائے تاکہ وہ میری تیمار داری کریں اور مجھے کسی طرح لاہور لے جائیں ۔ ان تمام حضرات نے یہ دیکھ کر کہ اقبال نے اس سے بہت برا اثر لیا ہے ، نہایت متانت سے ان کے صحت مند ہونے کا یقین دلایا مگر وہ بالکل مطمئن نہ ہوئے ۔

بیماری کے دنوں میں میں بھی علامہ کے ہاں ایک رات رہا تھا

کیونکہ اس روز آپ بہت بے چین تھے ۔ میں نے اور سید امجد علی نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق عمل کیا تو علامہ کو نیند آ گئی ۔ جب وہ سوگئے تو میں سید امجد علی کو ان کے پاس چھوڑ کر اپنے گھر واپس آ گیا مگر لندن کی بسوں سے مایوس ہو کر مجھے تمام راستہ پیدل چلنا پڑا ۔

علامہ کے شفایاب ہونے پر سید امجد علی شاہ نے اکیلے یورپ کی سیاحت کا پروگرام بنایا ۔ اس پروگرام میں آسٹریا کا شہر وائنا بھی شامل تھا جس کے متعلق علامہ نے کہا کہ وہاں کے گرم حمام بہت مشہور ہیں ۔ چنانچہ جب وہ واپس آئے تو اپنا سفرنامہ علامہ کو سنایا جس سے علامہ بہت محظوظ ہوئے ۔ انھوں نے واپس آ کر تمام بل وغیرہ ، جو علامہ کے نام تھے ، ادا کر دیے کیونکہ علامہ کا تمام حساب کتاب سفر میں وہی کرتے تھے ۔ سید امجد علی شاہ صاحب کی وجہ سے علامہ صاحب بہت آرام سے رہے ۔

☆ ☆ ☆

۵۳

پروفیسر لوئی میسنگ نون

میں نے جب ایک روز علامہ اقبال سے دوران گفتگو ذکر کیا کہ میرے پاس ''فصوص الحکم'' مصنفۂ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا ایک قلمی نسخہ ہے تو آپ نے اس کے مطالعے کی خواہش ظاہر کی - جب علامہ کسی کتاب کی بابت سنتے تھے تو اس کے دیکھنے کے لیے بے چین ہو جاتے - چنانچہ انھوں نے مجھے اس ضمن میں مندرجہ ذیل خط بھی لکھا :

''۲۲ اکتوبر ۱۹۲۷ء

ڈیر ماسٹر عبداللہ !

آپ ''فصوص الحکم'' کا قلمی نسخہ ، جو آپ کے پاس ہے ، ایک دن کے لیے مرحمت فرمائیے اور اس کارڈ کے دیکھتے ہی مجھ تک پہنچا دیجیے - محمد اقبال ، لاہور''

بات دراصل یہ تھی کہ ان دنوں علامہ اقبال مسئلۂ وحدت الوجود پر تحقیق کر رہے تھے اور اس کتاب کا اسی مسئلے کے سلسلے میں مطالعہ کرنا چاہتے تھے ، کیونکہ شیخ اکبر کا مسئلۂ وحدت الوجود سے بنیادی تعلق تھا - اس مسئلے نے یورپ کے بعض محققین کو بھی الجھا رکھا تھا - چنانچہ جب علامہ ۱۹۳۲ء میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

کے سلسلے میں یورپ گئے تو آپ نے پیرس میں فرانسیسی پروفیسر میسنگ نون سے بھی ملاقات کی اور گفتگو کا موضوع یہی مسئلہ تھا ۔ آپ کے نزدیک یورپ میں مسئلۂ وحدت‌الوجود کو لوگوں نے اپنے لیے سہارا بنا لیا تھا ۔ علامہ نے اس عقیدے کی محض اسلامی نقطۂ نظر سے مخالفت کی ہے ۔ جب میں یورپ میں تھا تو آپ نے پروفیسر میسنگ نون کا ذکر کرتے ہوئے مجھے مندرجہ ذیل خط لکھا تھا :

”۔۔۔ آج کل پیرس میں خوب موسم ہوگا ۔ قادیان کے احمدیوں میں خانہ جنگی ہو رہی ہے اور خلیفۂ قادیان پر ان کے باغی مریدوں کی ایک جماعت نے نہایت فحش الزام لگائے ہیں ۔ نقصِ امن کے احتمال سے وہاں کل سے دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کیا گیا ہے ۔ سید راس مسعود وزیرِ معارف بھوپال دفعتاً اس جہانِ فانی سے انتقال فرما گئے ہیں ۔ خدا تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت کرے ۔ بڑے مخلص اور دردمند آدمی تھے ۔ پروفیسر میسنگ نون سے آپ کی ملاقات ہو تو میری طرف سے ان کی خدمت میں سلام عرض کیجیے ۔ والسلام

محمد اقبال“

میں پروفیسر میسنگ نون سے اپنے قیامِ پیرس کے دوران میں ، ۱۹۳۷ء میں ، ملا ہوں اور کالج میں مڈل ایسٹ پر ان کا لیکچر بھی سنا ہے ۔ پیرس کے علمی حلقوں میں ان کو بہت شہرت حاصل تھی اور مشرقِ وسطیٰ پر ان کو محقق تصور کیا جاتا تھا ۔ انھوں نے مسئلۂ فلسطین اور یہودیوں کی مشرقِ وسطیٰ میں مداخلت پر تحقیق کی ہے اور اس موضوع پر کالج میں لیکچر بھی دیے ہیں ۔ غرض کہ علامہ اقبال ان کو مسئلۂ وحدۃ الوجود اور منصور حلاج کے سلسلے

میں بہت بڑا محقق تصور کرتے تھے اور ان مسائل سے چونکہ علامہ کو خاص دلچسپی تھی اس لیے وہ ان کے حالات اور ان کی علمی تحقیقات سے باخبر رہنا چاہتے تھے ۔

علامہ کے انتقال کے بعد جب پروفیسر میسنگنون نے ۱۹۴۵ع میں ایشیا کا سفر کیا تھا تو انھوں نے غزنی میں روضۂ حکیم سنائی پر بھی حاضری دی تھی جبکہ آپ کے ہمراہ مرحوم سرور گویا اعتمادی بھی تھے - ۱۹۳۳ع میں جب علامہ اقبال افغانستان گئے تھے تو اس وقت سرور گویا علامہ کے ہمراہ تھے - پروفیسر میسنگنون جب ۱۹۴۵ع میں لاہور آئے تھے تو ۱۵ جون کو ڈاکٹر جاوید اقبال کی معیت میں علامہ اقبال کے مزار پر بھی حاضری دی تھی ۔

۵۴

قیامِ لندن کی یادداشت

اکتوبر ۱۹۳۲ء میں علامہ اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے سید امجد علی کے ہمراہ لندن پہنچے تھے ۔ آپ کا قیام ملکہ این (۱۷۰۰ء - ۱۷۱۴ء) کے محل میں تھا ۔ میں بھی اُن دنوں لندن میں ہائی گیٹ کے ایک مکان میں مقیم تھا ۔ سید امجد علی نے جب مجھے علامہ کی لندن میں آمد سے مطلع کیا تو مجھے بے حد مسرت ہوئی اور میں فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا ۔ جب میں وہاں پہنچا تو آپ کیمبرج میں زیر تعلیم ایک پنجابی نوجوان سے محوِ گفتگو تھے اور پنجابی ہی میں بات چیت کر رہے تھے ۔ مجھے دیکھا تو بہت خوش ہوئے ۔ ابھی ہم گفتگو کا آغاز کرنے والے تھے کہ اسی اثنا میں ایک اور صاحب آ گئے ۔ علامہ نے ان صاحب کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ آپ سردار اقبال علی شاہ ہیں ۔ انھوں نے افغانستان کی صورتِ حال پر اُن دنوں بہت کچھ لکھا تھا اور اس سلسلے میں خاصی شہرت حاصل کی تھی ۔ افغانستان کی باگ ڈور ان دنوں جنرل نادر شاہ کے ہاتھ میں تھی اور علامہ بھی اپنے مہمان کے ساتھ انھی کے متعلق بات چیت کر رہے تھے ۔ اُس زمانے میں افغانستان کی جو سیاسی صورتِ حال تھی اس کی وجہ سے دنیا بھر

میں یہ ملک موضوعِ گفتگو تھا ۔ اسی روز شام کے وقت طلبہ کا ایک گروہ علامہ سے ملنے کی غرض سے آ گیا جن میں ایک طالب علم عبدالوحید صاحب بھی تھے جو بعد میں ڈاکٹر عبدالوحید (فیروز سنز) کہلائے ۔ ابھی یہ لوگ بیٹھے ہی تھے کہ میےفئر ہوٹل سے کسی نے فون کیا اور علامہ کی آمد کی تصدیق چاہی ۔ چنانچہ حاضرین میں سے کسی صاحب نے یہ فون سنا اور علامہ کی آمد کی تصدیق کی ۔ ان طلبہ نے اپنے مقالات کے موضوعات کے بارے میں علامہ سے مشورہ کیا ۔ آپ نے ان لوگوں کو نصیحت کی کہ فقط ڈگری حاصل کرنے کے لیے مقالات لکھنا یا امتحان دینا کوئی معنی نہیں رکھتا ، جیسا کہ ہمارے ہاں کے طلبہ کا وطیرہ ہے ۔ آپ لوگ صرف علم حاصل ہی نہ کریں بلکہ علم پیدا بھی کریں تاکہ اپنے ملک اور قوم کا نام روشن کر سکیں ۔ اس گفتگو میں چونکہ خاصا وقت صرف ہو گیا تھا لہٰذا ہم لوگ واپس آگئے ۔

دوسرے روز میں دوپہر کے وقت برٹش میوزیم سے ہوتا ہوا علامہ کی خدمت میں پہنچا ۔ میرے ساتھ فلسطین کے ایک عرب طالب علم مسٹر اسحاق حسینی بھی تھے جو مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی کے عزیزوں میں سے تھے ۔ میں نے ان کا تعارف علامہ سے کرایا اور بتایا کہ وہ ان دنوں ابنِ قتیبہ کی کتاب ''المعارف'' پر پی ایچ ۔ ڈی کے لیے مقالہ لکھ رہے ہیں ۔ اس وقت علامہ ہندوستان کے سیاسی مسائل پر کسی صاحب سے گفتگو کر رہے تھے مگر جب انھیں ابن قتیبہ پر سید اسحاق حسینی کی تحقیق کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ ہماری طرف متوجہ ہو گئے ۔ انھوں نے اسحاق حسینی سے ابن قتیبہ کی ایک اور کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ'' کا ذکر کیا جس کے مصنف کے بارے میں علما میں شکوک پائے جاتے ہیں ۔ اسحاق حسینی

نے بھی اس سے اتفاق کیا اور بتایا کہ واقعی ابنِ خلکان اور بعد کے بعض مصنفین نے اس کتاب کے صحیح مصنف کے بارے میں شبہات ظاہر کیے ہیں ۔ انھوں نے بتایا کہ اس کتاب کے کچھ نسخے برٹش میوزیم میں بھی موجود ہیں ۔

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ لندن میں ریاست پٹیالہ کے نمائندے مسٹر مقبول ، علامہ سے ملنے کے لیے آگئے ۔ یہ ایک وجیہ اور خوش گفتار نوجوان تھے اور ان کی آنکھیں ان کی ذہانت کی غماز تھیں ۔ ان کے آنے سے محفل نہایت شگفتہ ہو گئی اور کئی لطیفے انھوں نے اور دوسرے لوگوں نے سنائے ۔ کئی شعرا کا کلام بھی زیر بحث آیا اور ان کے اشعار سنائے گئے ۔ اسی محفل میں لاہور کے ایک صاحب میر مقبول بھی تھے جو گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانۂ طالب علمی میں مباحثوں میں حصہ لے کر اول آیا کرتے تھے اور واقعی بہت مقبول تھے ۔ انھوں نے بہت سے مذاحیہ اشعار سنائے ۔ پھر لفظ ''حلالہ'' زیر بحث آیا اور انھوں نے حلالہ کے سلسلے میں ایک واقعہ بھی سنایا کہ ایک عورت اپنے خاوند سے طلاق حاصل کر کے بہت پچھتائی اور اس سے دوبارہ شادی کرنے کی غرض سے حلالہ کیا ۔ چنانچہ حلالہ کرنے کے لیے جس دوسرے شخص سے شادی کی وہ اسے اس قدر پسند آیا کہ اس نے طلاق لینے سے انکار کر دیا اور اسی کے ساتھ رہنے لگی ۔ اس واقعے سے محفل زعفران زار بن گئی اور خوب قہقہے لگے ۔ علامہ نے فرمایا کہ آزادیِ رائے کا یہ بھی ایک طریقہ ۔

اسی زمانے میں ، جب کہ میں اپنی علمی تحقیقات کے سلسلے میں برٹش میوزیم میں بیٹھا تھا ، ایک روز علامہ کا پیغام موصول ہوا کہ پکتھال نے قرآن مجید کا جو انگریزی ترجمہ کیا ہے ، اس

میں سے سورۂ النمل کی حسبِ ذیل آیت کا ترجمہ درکار ہے :

''حتٰی اذا آتوا علٰی واد النمل قالت نملۃ یا ایھا النمل ادخلوا مساکنکم . . . الآیۃ ۔''

(یہاں تک کہ جب آئے اوپر وادی چیونٹیوں کے ، کہا ایک چیونٹی نے اے چیونٹیو ! داخل ہو جاؤ اپنے گھروں میں . . . الخ) ۔ چنانچہ میں نے اسی وقت آپ کے ارشاد کی تعمیل کردی اور مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ انھیں فوراً بھیج دیا ۔ پھر جب شام کے وقت میں ان کی خدمت میں پہنچا تو انھوں نے ترجمہ بھیجنے کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ دراصل یہ ترجمہ ایک عورت کی تشفی کی غرض سے مجھے درکار تھا اور اب وہ ضرورت پوری ہو گئی ہے ۔ پھر انھوں نے بتایا کہ اُس عورت کا نام مس روزیٹا فوربس ہے جس نے علمی تحقیقات کے سلسلے میں دور دراز کا سفر کیا ہوا ہے ۔ علامہ نے بتایا کہ اس عورت نے مجھے اپنے گھر کھانے پر بلایا تھا ۔ میں اس کا گھر دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ اُس نے اپنے گھر کو اسلامی طرز کے مطابق آراستہ کیا ہوا تھا ۔ خاص کر ایرانی قالین تو اپنی نفاست اور عمدگی میں نہایت لاجواب تھے ۔ کھانے کے دوران تو اُس نے مکان کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا مگر جب میں چلنے لگا تو بولی کہ ڈاکٹر صاحب ! میرے مکان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟ میں نے کہا کہ آپ نے تو اپنی زندگی میں ہی بہشت تخلیق کر لی ہے جبکہ میں ابھی اس کی جستجو میں ہوں ۔ علامہ نے بیان فرمایا کہ بالکل الف لیلوی انداز میں مکان کو سجایا گیا تھا ۔

ایک روز میں علامہ کی خدمت میں پہنچا تو آپ ایک صاحب سے مصروفِ گفتگو تھے جو کیمبرج سے آئے تھے ۔ میں نے پہلی مرتبہ ان صاحب کو دیکھا تھا ۔ پھر جب علامہ نے ان سے تعارف کرایا

تو معلوم ہوا کہ آپ چودھری رحمت علی ہیں ــــ وہی چودھری رحمت علی جو لفظ ''پاکستان'' کے خالق ہیں ۔ گویا اُس وقت تصوّرِ پاکستان کے خالق اور لفظِ پاکستان کے خالق یکجا ہو گئے تھے ۔ یہ طویل القامت اور بارعب شخص اُس وقت علامہ کے پاس بیٹھ کر اُردو زبان کا ایک خط پڑھ رہا تھا جو جرمنی سے آیا تھا اور جس میں جرمن پروفیسر کیمف کا ذکر تھا ۔ پروفیسر کیمف علامہ اقبال کی کتاب ''پیامِ مشرق'' سے بخوبی واقف تھا اور ہندوستان میں قادیانیوں کی تحریک کو بھی جانتا تھا ۔ وہ گاندھی جی کا سخت مخالف تھا ۔ چودھری رحمت علی مسلمانانِ ہند کے سیاسی مستقبل پر علامہ کے ساتھ گفتگو کرتے رہے ۔ وہ اپنی گفتگو میں علامہ کے خطبۂ الہ آباد کا بار بار حوالہ دیتے تھے ۔

ایک روز میں نے ایک خوبرو جرمن لڑکی کے ساتھ علامہ کو گفتگو کرتے دیکھا جس کا نام ایلزا تھا ۔ یہ مصوّرِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کے ساتھ آئی تھی اور دیر تک علامہ سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتی رہی ۔ اس کی تفصیل اسی کتاب کے مضمون ''پیامِ مشرق'' میں بیان کر دی گئی ہے ۔

ایک دن میں علامہ کے پاس دوپہر سے قبل پہنچا ۔ آپ چھوٹے کمرے میں تشریف فرما تھے اور ایک یورپی کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے ۔ گفتگو کا موضوع اسلامی قانون تھا ۔ آپ نے میرا تعارف اس شخص سے کرایا ۔ اس کا نام مائیکل لورینٹ تھا اور وہ بین الاقوامی ادارۂ اطلاعات کا نمائندہ تھا ۔ وہ علامہ کی تمام گفتگو نوٹ کرتا جا رہا تھا اور نہایت قابلیت سے ہر بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا ۔ تقریباً دو گھنٹے تک یہ شخص علامہ کے پاس رہا اور پھر یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ میں دوبارہ آؤں گا اور اس

مرتبہ اسلام میں عورت کے مقام پر آپ کے خیالات معلوم کروں گا۔
چنانچہ دو روز بعد جب میں حسبِ معمول علامہ کے پاس گیا تو مائیکل لورینٹ بھی آ گیا۔ اس مرتبہ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اپنی نئی نویلی خوبصورت دلھن کو بھی ساتھ لایا تھا۔ اُس نے علامہ کے ساتھ مصافحہ کیا اور پھر اپنی بیوی کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد علامہ سے درخواست کی کہ وہ ان کی ایک تصویر بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ علامہ اس کے سامنے بیٹھ کر اُس کی بیوی سے بات چیت میں مصروف ہوگئے اور وہ رنگ اور برش وغیرہ نکال کر ان کی تصویر بنانے لگا۔ مَیں حیران تھا کہ صحافت سے وابستہ یہ شخص مصوّری میں بھی کس قدر درک رکھتا ہے۔ وہ واقعی ایک چابک دست مصوّر تھا اور اس نے نہایت عمدہ تصویر بنائی تھی۔ تصویر مکمل ہوئی تو اُس نے علامہ سے اس پر دستخط کرنے کی درخواست کی جو انھوں نے کر دیے۔ میں نے اس سے کہا کہ جب یہ تصویر چھپ جائے تو اس کی ایک کاپی مجھے بھی دے دے۔ اس کے بعد اُس نے طے شدہ موضوع یعنی ''اسلام میں عورت کا مقام'' پر بات چیت شروع کر دی۔ علامہ بولتے جا رہے تھے اور وہ لکھتا جا رہا تھا۔ بات چیت مکمل ہوئی تو اس نے اپنے نوٹس علامہ کو سنائے اور پھر کہا کہ یہ مضمون میں ضرور کسی پرچے میں چھپواؤں گا۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء میں مَیں بمبئی گیا تو وہاں کے ہفتہ وار انگریزی پرچے ''بمبئی کرانیکل'' میں یہ مضمون متذکرہ بالا عنوان کے تحت چھپا ہوا دیکھا۔ پھر مَیں نے مائیکل لورینٹ کو اُس کے پرانے پتے پر خط بھی لکھا تھا جس کا اس نے فوراً جواب دیا تھا۔ اس کے بعد ۱۰ مئی ۱۹۷۵ء کے ''نوائے وقت'' میں مائیکل لورینٹ کی بیوی کی تصویر شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ جنگ کے دوران میں

دونوں میاں بیوی کا ڈھاکہ میں خاتمہ ہو گیا ہے۔

لاہور میں ایک مرتبہ عید میلاد النبی کے موقع پر نماز مغرب کے بعد اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں ایک جلسے کا انتظام کیا گیا جس کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی ۔ دیگر مقررین میں سے دو آدمیوں کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں ۔ ایک مولانا میر ابراہیم سیالکوٹی متوفی ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء اور دوسرے مسٹر شمس الدین خاور ۔ حاضرین زیادہ تر علامہ اقبال کی تقریر سننے کے متمنی تھے ۔ علامہ نے اسلام میں عورت کے مقام پر تقریر شروع کی اور قرآن مجید کی آیت "الرجال قوامون علی النساء" کی تلاوت فرمائی ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب علامہ نے مذکورہ آیت کی تشریح شروع کی تو مولانا میر ابراہیم سیالکوٹی کھڑے ہوگئے اور انھوں نے اس آیت کے ضمن میں ایک نئے اور مفید نکتے کا اضافہ کیا ۔ انھوں نے بتایا کہ عربی صرف و نحو کی رو سے جب لفظ ''قام" کا صلہ ''علیٰ" آتا ہے تو اس کے معنی حفاظت یا تحفظ کے ہو جاتے ہیں ۔ اس طرح اس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ مرد عورتوں کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں ۔ چنانچہ علامہ نے میر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور تقریر جاری رکھتے ہوئے مردوں کو عورتوں کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ٹھہرایا ۔ پھر آپ نے عورتوں کے حقوق کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسی صورت میں جب کہ عورتیں مردوں کے تحفظ کی محتاج ہیں ، عورتوں اور مردوں کے حقوق مساوی نہیں ہو سکتے ۔ مردوں کا فرض یہ ہے کہ وہ عورتوں کو صحیح تعلیم و تربیت مہیا کریں اور عورتیں اپنے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کریں ۔ ایک ہی مقصد کے لیے دونوں فریقوں کو الگ الگ فرائض تفویض کیے گئے ہیں اس لیے ہر فریق کو اپنے دائرۂ کار کے

اندر رہ کر اپنے فرائض انجام دینے چاہییں ۔ معاشرے اور خانوادے کی فلاح کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان عورت اسلام کی معاشرتی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے فرائض انجام دے ۔ عورت کو اسلام معاشرتی نظام کا آئینہ دار ہونا چاہیے کیونکہ اپنی اولاد کی پرداخت اور تربیت کی ذمہ دار عورت ہی ہے اور اسی کی تربیت پر آیندہ نسلوں کی فلاح و اصلاح کا مدار ہے ۔

انھی دنوں ارسطوطولین سوسائٹی لندن کی دعوت پر علامہ نے ایک لیکچر دیا تھا جس کا موضوع تھا ''کیا مذہب ممکن ہے ؟'' اس لیکچر کی دعوت انھیں مس فورک ہارسن نے دی تھی اور انھی نے اس جلسے کا انتظام بھی کیا تھا ۔ جب علامہ نے یہ تقریر لکھ لی تو طے پایا کہ پہلے اس کو چھپوا لیا جائے ۔ چنانچہ اس کی طباعت کا انتظام میرے سپرد ہوا اور میں نے اسے چیئرنگ کراس لندن میں چھپوایا ۔ پہلا پروف میں نے خود پڑھا ، دوسرا پروف علامہ کو دکھایا اور لیکچر چھپ گیا ۔ لاہور میں بھی علامہ نے اس لیکچر کو چھپوایا تھا ، مگر جب اس کی مانگ بڑھ گئی تو انھوں نے اسے اپنے لیکچروں کے مجموعے میں شامل کر لیا جو اب تک شامل ہے ۔

☆ ☆ ☆

۵۵

علامہ اقبال اندلس میں

جب علامہ اندلس پہنچے تو روزنامہ ''الڈیبیٹ''[1] نے لکھا :

''ڈاکٹر سر محمد اقبال اندلس میں تشریف لائے ہیں ۔ آپ نے سپین کے عربی مدرسے کے فضلا سے بھی رابطہ قائم کیا ہے ۔ کل شام آپ نے ایک خطبہ شعبۂ فلسفہ و ادب کی نئی عمارت میں دیا جس کا عنوان تھا : 'اسلامی دماغی دنیا اور سپین ۔'

کل پروفیسر آسن مائگل آسین پلینس نے بیان کیا کہ سر اقبال ایک نکتہ رس فلسفی اور شاعر ہیں ۔ وہ اسلامی دنیا کی اُن چند سرگرم اور فعّال ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے مساویانہ کامیابی سے شاعری جیسے الہامی فن اور الٰہیّات کا گہرا مطالعہ کیا ہے ۔ انھوں نے بتایا کہ گاندھی جی اور دیگر ہندو مسلم مشاہیر کے ہمراہ سر اقبال

۱۔ یہ تمام مضمون دراصل میڈرڈ (اسپین) کے ایک روزنامہ ''ال ڈیبیٹ'' (El-Debate) کی ۲۵ جنوری ۱۹۳۳ء کی خبر کا ترجمہ ہے جو علامہ کے وہاں جانے اور لیکچر دینے پر چھپی تھی ۔ اس ترجمے کے لیے میں اپنے دوست ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ کا ممنون ہوں ۔ یہ پرچہ علامہ اقبال خود وہاں سے لائے تھے اور اب یہ اقبال اکیڈمی پاکستان میں محفوظ ہے ۔ لاہور پہنچنے پر علامہ نے یہ پرچہ مجھے بھی دیا تھا ۔

نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کی ہے لیکن ہمارا مہمان سر اقبال مہاتما گاندھی سے مختلف نظریات رکھتا ہے ۔۔ نہ صرف مذہب کے معاملے میں بلکہ ہر معاملے میں ۔ گاندھی جی ماہر سیاسیات اور ہندوستانی قومیت کے بہت بڑے دیوتا ہیں مگر اقبال فکر و تخیّل کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں ۔ سیاست میں دخل اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ان کی شرکت محض اتفاق ہے ۔ وہ یورپین اشیا کے استعمال کی ممانعت نہیں کرتا جیسا کہ گاندھی کرتا ہے ۔ مغربی لباس کے متعلق اس کی رواداری اس لیے ہے کہ اقبال کی قانونی تعلیم کیمبرج کے مدرسۂ قانون میں ہوئی اور وہ بظاہر یورپین نظر آتا ہے ۔ ان کے سر کا لباس (ٹوپی) ان کی ملّت کا ممتاز لباس ہے ۔ اس سفر میں آپ کی لڑکی[1] بھی ہم سفر ہے جو ایک نوجوان ، خوبصورت اور اعلیٰ خدوخال والی یورپین عورت کی طرح ہے ۔ آپ نے اپنے خطبے میں کامل اطمینان کے ساتھ اس اثر کو بیان فرمایا جو اسلامی شعرا اور فلاسفہ نے مشرقِ اقصیٰ کی اسلامی دنیا کے مسلمان فضلا پر ڈالا ہے ۔ خاص کر انھوں نے ابن خلدون ، البیرونی ، مسعودی اور کندی کی تعلیمات کو بیان کیا اور ان کی بہت سی تحقیقات کی طرف اشارہ کیا جو اس ضمن میں کی گئی ہیں ۔

پروفیسر آسین مائگل نے اپنی تعارفی تقریر میں علامہ کو ایک مقنّن کی حیثیت سے پیش کیا ہے جو مشرق میں اسلامی دنیا کے ایک دور افتادہ گوشے سے تشریف لائے ہیں ۔ یہ گویا صدائے بازگشت

۱۔ علامہ کی کوئی لڑکی آپ کے ہمراہ نہیں گئی تھی ۔ ایک عورت کو بطور مترجم کے آپ نے لندن سے اپنے ہمراہ لے لیا تھا ۔ خبر میں اسی عورت کی وجہ سے یہ مغالطہ ہوا ہے ۔

ہے اسلامی روح کی جو دور دراز ملک سے آئی ہے اور اس نے ہمارے اندر قرونِ وسطیٰ کے سپین کی یاد تازہ کر دی ہے ، جیسا کہ وطن کا شائق مریض اپنے گم شدہ وطن کو یاد کرے ۔ انھوں نے اپنی کتاب ''ایران میں ارتقائے مابعد الطبیعیات'' کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے ۔

اپنے لیکچر میں آپ نے ایرانی صوفیوں کے نظامِ تصوف کو ابن العربی کے حوالے سے بیان کیا ہے ۔ اقبال نے اپنی نظم 'اسرارِ خودی' میں اپنے فلسفیانہ نظریات کا اظہار بھی کر دیا ہے ۔ نیز آپ نے ابن العربی کے سلسلے میں اپنی تحقیقات کو بیان کرنے کے بعد کہا کہ ہندوستان اور اندلس دنیا کے آخری کناروں پر واقع ہیں مگر ایک مؤرخ کے لیے ان کے تہذیب و تمدن میں بہت سی مشترک علامتیں پائی جاتی ہیں ۔ جہاں ہندوستان کی اسلامی ثقافت میں ایرانی اور آرین تہذیب کی ملاوٹ ہے ، وہاں اندلس میں مغربی یونانی اور مسیحی تہذیب ملی ہوئی ہے اور ابھی تک یہ آمیزش قائم ہے ۔ ان دور افتادہ ملکوں کی چیدہ چیدہ ہستیاں آج بھی ویسی ہی سائنس اور ادب کے موضوعات سے دلچسپی رکھتی ہیں ۔''

علامہ جس روز یورپ کے اس دور دراز سفر سے واپس لاہور آئے تو لاہور ریلوے سٹیشن پر احباب کے ایک مجمعِ کثیر نے آپ کا استقبال کیا ۔ بعضوں نے تو فرطِ محبت سے (اور خاص کر میں نے) آپ کو ٹرین سے نکلنے سے پیشتر ہی اپنے کندھوں پر اٹھا لیا ۔ اس جوش و خروش کا ذکر روزنامہ ''ایسٹرن ٹائمز'' لاہور نے مکمل چھاپا تھا ۔ بعد میں آپ نے بتایا تھا کہ قرطبہ کی مسجد جامع میں نماز نوافل ادا کرنے سے پیشتر انھوں نے بلند آواز سے اذان بھی کہی تھی ۔

ان احباب میں پروفیسر خواجہ عبدالحمید مرحوم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن کے تاثرات ''معارف'' اعظم گڑھ کی جلد نمبر ۴۲ میں بعنوان ''اقبال : چند جواہر ریزے'' دو اشاعتوں میں شائع ہوئے تھے - قرطبہ میں علامہ جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے اس کے منیجر سے آپ نے پوچھا کہ کیا اس علاقے میں قدیم مراکشی نسل کے لوگ بھی آباد ہیں ؟ اس نے جواب دیا کہ بہت بڑی تعداد میں - آپ نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے ان میں سے کسی ایک سے ضرور ملایا جائے - منیجر مسکرا کر بولا کہ اس کام کے لیے ہوٹل سے باہر جانے کی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں خود مراکشی الاصل ہوں - جنوبی ہسپانیہ کے باشندوں کو ''مورسکو'' کہا جاتا ہے - آپ کو پرانی عمارتیں دکھانے کے لیے جو رہبر مقرر کیا گیا وہ انگریزی جانتا تھا اور شرط بھی یہی تھی کہ وہ انگریزی زبان جانتا ہو - حسن اتفاق سے وہ بھی مراکشی الاصل تھا - علامہ نے فرمایا کہ آج بھی اس علاقے میں عربی مراکشی اثر لوگوں کے چہروں کی ساخت سے پوری طرح نمایاں ہے - چنانچہ آپ نے اپنی نظم ''مسجد قرطبہ'' میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارے کیے ہیں - ''بالِ جبریل'' کی اس نظم ، یعنی ''مسجدِ قرطبہ'' میں ، جو آپ نے وہیں لکھی تھی ، قرطبہ کی عظیم الشان مسجد کے فنِ تعمیر کی خوبیاں بیان کرنے کے علاوہ مراکشی باشندوں کی یہ خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں - اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے - نظم کا پہلا شعر یہ ہے :

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات

سلسلۂ روز و شب ، اصلِ حیات و ممات

اس بند کا آخری شعر یہ ہے:

اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

کچھ اور اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے:

اے حرمِ قرطبہ، عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

کافرِ ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلواۃ و درود، لب پہ صلواۃ و درود

شوق مری لے میں ہے، شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ھُو میرے رگ و پے میں ہے

اقبال نے اس طویل نظم میں مسجد بنانے والوں کا ذکر کرنے کے بعد یہاں کے لوگوں کے حسن کو جس طرح بیان فرمایا ہے اس کی جھلک اشعارِ ذیل میں دیکھیے:

جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل وگرم اختلاط، سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

''بال جبریل'' میں یہ پوری نظم گیارہ صفحات میں درج ہے -
اس کا ایک ایک شعر اندلس کی مسلم تاریخ و ثقافت کا آئینہ ہے -

ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ ان دنوں ہسپانیہ میں قومیت اور وطنیت کی ایک نئی لہر دوڑ رہی ہے - وہاں کے نوجوان اور اہلِ علم ہسپانیہ میں سات سو سالہ اسلامی حکومت کے کارناموں کو فخریہ بیان کرتے تھے اور اس دور کو اندلس کا بہترین زمانہ کہہ کر یاد کرتے تھے - یہ اسی تحریک کا نتیجہ تھا کہ مسجد قرطبہ کو کیتھولک چرچ کے مختلف فرقوں سے چھین لیا گیا تھا حالانکہ کئی سو سال سے ان فرقوں نے مسجد کے مختلف حصوں میں اپنی عبادت گاہیں بنا رکھی تھیں - وطنیت کی اس تحریک کا چونکہ مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا اس لیے مسجد کو محکمۂ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا گیا تھا - اس ضمن میں حضرت علامہ نے قدرتِ الٰہی کا ایک دل پسند کرشمہ بھی بیان فرمایا تھا مگر سب سے پہلے نظم ''ہسپانیہ'' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے - یہ نظم بھی ''بالِ جبریل'' (ص ۱۴۰) میں موجود ہے :

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں مسجد کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
روشن تھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں
خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں
غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن
تسکینِ مسافر نہ سفر میں ، نہ حضر میں

حضرتِ علامہ نے بیان فرمایا کہ یہ مسجد ، جو فنِ تعمیر کے

لحاظ سے دنیا کی نادر عمارتوں میں سے ہے ، جب عیسائی راہبوں کے قبضے میں آئی تھی تو انھوں نے آیاتِ قرآنی پر ، جو نہایت اعلیٰ عربی رسم الخط میں سنہری حروف سے مسجد کی دیواروں اور محرابوں پر لکھی گئی تھیں ، پلستر کرا دیا تھا ۔ مگر آج کم و بیش چھ سو سال کے بعد جب وہ پلستر محکمۂ آثار قدیمہ کے حکم سے اکھیڑا گیا تو یہ قدیم نقوش اور آیاتِ قرآنی ایک مرتبہ پھر اپنی سابقہ آب و تاب اور آن بان سمیت دنیا کے سامنے جلوہ گر ہو گئی ہیں ۔ اگر پلستر کے ذریعے انھیں محفوظ نہ کر دیا گیا ہوتا تو شاید آج یہ نقوش مدھم پڑ گئے ہوتے یا ان میں سے بعض محو ہوگئے ہوتے ، مگر قدرت کو یہ نقوش محفوظ کرنے تھے لہٰذا انھیں دشمنوں کے ہاتھوں محفوظ کرایا ۔ کیا یہ قدرت کا ایک نہایت دل پسند کرشمہ نہیں ہے ؟ پروفیسر حمید مرحوم لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ فقرہ میرے ذہن پر نقش ہوگیا ہے کہ ''مسجد اور اس کے نقوش کو دیکھ کر اور ان آیاتِ قرآنی کے مفہوم کو سمجھ کر جو لذت حاصل ہوئی ، وہ میں بیسیوں تفسیروں سے حاصل نہ کر سکا ۔''

ایک بات ڈاکٹر صاحب نے سپین کے سفر میں بطور خاص نوٹ کی کہ آن دنوں پرانی مساجد بہت ہی کم تھیں ۔ انھوں نے فرمایا کہ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں ؟ یا تو مسلمانوں کے ہسپانیہ سے اخراج کے بعد عیسائیوں نے تعصب کی وجہ سے ان تمام مساجد کو بے دردی سے گرا دیا اور یا پھر مراکشی اندلسی مسلمانوں کو بے ضرورت مساجد تعمیر کرنے کا وہ شوق نہیں تھا جو ہندوستانی مسلمانوں کو ہے ۔ غالباً پہلا خیال صحیح ہے ۔

ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ دو سال سے ہسپانیہ کی سیاسی صورتِ حال اچھی نہیں ہے ۔ انھوں نے فرمایا کہ آج بھی جنرل

فرانکو کی فوج میں بے شمار مراکشی سپاہی اور رضاکار خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ہسپانیہ کے سفر کو مختلف عنوانات کے تحت مختلف نظموں میں بیان فرمایا ہے جو "بال جبریل" کے صفحہ ۱۲۳ سے ۱۴۴ تک موجود ہیں۔ وہ عنوانات یہ ہیں: دعا، مسجد قرطبہ، قید خانے میں معتمد کی فریاد، عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت، ہسپانیہ اور طارق کی دعا۔ ان نظموں کو پڑھ کر علامہ کے جذبات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے جو اسلام کے لیے وہ اپنے دل میں رکھتے تھے۔ اگرچہ تصویر اتروانے سے وہ گھبراتے تھے مگر مسجدِ قرطبہ میں انھوں نے بطور خاص تصاویر بھی اتروائی تھیں۔

☆ ☆ ☆

۵۶

سر علی امام اور جہاز 'ملوجا' کے ہم سفر

ایک مرتبہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر لندن جانے کے لیے جب علامہ اقبال ۱۹۳۰ء کے ماہ ستمبر میں بمبئی سے جہاز میں سوار ہوئے تو سر علی امام بھی آپ کے ہم سفر تھے۔ آپ کے ایک خط سے واضح ہے کہ جب آپ کے جہاز نے پورٹ سعید سے نکل کر بحیرۂ روم میں سیدھا انگلینڈ کا رخ کیا اور قدرتی طور پر خانۂ کعبہ اور مدینۂ منورہ بالکل بالمقابل آگئے تو آپ نے دیکھا کہ سر علی امام نے آیاتِ قرآنی اور درود شریف پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ سر علی امام علامہ کا بہت احترام کرتے تھے۔ جب آپ نے ۱۹۱۰ء میں مثنوی ''اسرار خودی'' شائع کی تھی تو اسے آپ نے سر علی امام کے نام معنون کیا تھا۔ انتساب کا پہلا شعر یہ ہے:

اے امامِ سیّدِ والا نسب

دودمانت فخرِ اشرافِ عرب

جب آپ دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے فارغ ہو کر ۱۹۳۲ء کے اخیر میں واپس آ رہے تھے تو آپ کے جہاز ''ملوجا'' میں ایک یورپی میاں بیوی بھی سفر کر رہے تھے۔ وہ اکثر کھانے کی میز پر آپ کے ساتھ ہوتے تھے۔ ان صاحب کا نام Lively Garden

تھا - کھانے سے فارغ ہو کر اکثر وہ میاں بیوی مختلف موضوعات پر آپ سے گفتگو کیا کرتے تھے - ایک روز جب مسجد پر گفتگو ہوئی تو علامہ نے ان سے کہا تمام روئے زمین مسجد ہے - چنانچہ اس کے بعد جب وہ علامہ کو کرسمس کے موقع پر کارڈ بھیجتے تھے تو اس تہنیت نامے پر یہ عبارت لکھ دیا کرتے تھے :

To our good friend of India of Maloja.
Mr. and Mrs. Lively Garden.
"The whole Earth is a Mosque."

اسی ''ملوجا'' جہاز پر نظام حیدرآباد کے دوسرے صاحبزادے شہزادہ معظم جاہ بھی سفر کر رہے تھے - ایک روز وہ اپنی امارت کے گھمنڈ میں علامہ کے پاس اپنی ایک غزل لے کر آئے - ان کی خواہش تھی کہ علامہ کو اپنی غزل سنائیں تاکہ اس کی اصلاح بھی ہو جائے - مگر علامہ نے ان کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ صحیح شعر کہنے کا ذوق صرف تمہارے دادا میر محبوب علی خاں کو تھا اور بس - نہ تمہارے باپ میں یہ ذوق ہے اور نہ کسی اور میں - اس طرح ان کی غزل پڑھنے کی نوبت ہی نہ آئی اور اس کے بعد علامہ نے ان سے دوسری باتیں شروع کردیں - یہ سب باتیں علامہ اقبال نے خود برسبیلِ تذکرہ بتائی تھیں -

۵۷

پروفیسر رشید احمد صدیقی

علی گڑھ - 'سہیل'

۱۹۱۱ء میں علامہ اقبال نے سر سید کے علی گڑھ کالج میں ایک خطبہ دیا تھا جسے بعد میں ''ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کے عنوان سے مولوی ظفر علی خاں نے اُردو کا جامہ پہنایا تھا۔ اس خطبے میں اُنھوں نے ملّتِ اسلامیہ کے لیے جن جذبات کا اظہار کیا ہے اس سے اسلام سے ان کی گہری وابستگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ یورپ سے واپسی کے بعد تو اسلام سے ان کا والہانہ لگاؤ عروج پر پہنچ گیا تھا۔

۱۹۲۲ء میں علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا اور اس کے پہلے جلسۂ تقسیمِ اسناد کے موقع پر یونیورسٹی کی چانسلر بیگم صاحبہ بھوپال نے ۲۲ دسمبر ۱۹۲۲ء کو اسٹریچی ہال میں خطبۂ صدارت پڑھا۔ ہم موٹر میں قبل دوپہر علی گڑھ پہنچے اور سیدھے جلسے کا رخ کیا۔ جب جلسہ گاہ میں پہنچے تو بیگم صاحبہ یہ کلمات ادا کر رہی تھیں:

''میرے پیارے بچو! حضرت علیؓ کا قول ہے:

'من تعلّم حرفاً من احد فھو مولاہ'

یعنی جس نے کسی سے ایک لفظ بھی پڑھ لیا ، وہ (پڑھانے والا) اس کا مولا یا قابلِ احترام آقا بن گیا ۔"

۱۹۲۵ء میں علی گڑھ کالج کی سلور جوبلی منائی گئی جس میں راقم نے بھی شرکت کی ۔ اس موقع پر پروفیسر رشید احمد صدیقی سے بھی ملاقات ہوئی جو اُن دنوں ایک رسالہ "سہیل" کے نام سے جاری کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے ۔ آنھوں نے مجھ سے بھی اس رسالے کا ذکر کیا اور فرمائش کی کہ میں علامہ اقبال اور مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی (مرحوم) سے "سہیل" کے لیے ان کے فن پارے عنایت کرنے کی درخواست کروں ۔ چنانچہ جب جنوری ۱۹۲۶ء کو سہ ماہی "سہیل" کا پہلا شمارہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا (جو ۱۶۲ صفحات پر مشتمل تھا اور راقم نے لاہور سے چھپوایا تھا) تو اس میں دیگرمعروف اہلِ قلم کے علاوہ میری کوشش سے حضرتِ علامہ اقبال کے سات فارسی اشعار بھی مصورِ مشرق چغتائی مرحوم کی تصاویر کے ساتھ شائع ہوئے تھے ۔ اسی شمارے میں پروفیسر محمود شیرانی کے ایک مضمون "فارسی شاعری اور اس کی قدامت" کی پہلی قسط بھی شائع ہوئی ۔ خود رشید احمد صدیقی نے بھی علامہ اقبال کے فکر و فن پر ایک عالمانہ مقالے "پیامِ اقبال" کی پہلی قسط اس شمارے میں شامل کی جس کی تکمیل دوسرے شمارے میں ہوئی جو اپریل ۱۹۲۶ء کو شائع ہوا ۔ اسی طرح پروفیسر محمود شیرانی کے متذکرہ مضمون کی دوسری اور آخری قسط بھی اسی دوسرے شمارے میں شائع ہوئی تھی ۔ اس شمارے کی ضخامت ۱۶۶ صفحات تھی ۔

"سہیل" کے دوسرے شمارے میں "اسلامیات" کے ایک مستقل عنوان کے تحت مباحثے کا آغاز کیا گیا اور پہلے مباحثے کے لیے "علومِ اسلامیہ" کا موضوع منتخب ہوا جس میں صاحبزادہ آفتاب احمد

خان وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اور علامہ اقبال نے حصہ لیا۔ شروع میں مدیر یعنی صدیقی صاحب کا ایک نوٹ ہے اور اس کے بعد مباحثے کا آغاز ہوگیا ہے۔ چنانچہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مجوزہ موضوع کے سلسلے میں سوالات کرتے ہیں اور حضرتِ علامہ جواب دیتے ہیں۔ علامہ کے یہ جوابات اس قدر بلند پایہ ہیں کہ علومِ اسلامیہ کے باب میں ان کی غیر معمولی بصیرت اور مجتہدانہ اسلوب قاری کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔

علامہ ۱۹۲۹ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لیکچر دینے کی غرض سے تشریف لے گئے تو راقم بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ آپ نے ڈاکٹر ظفرالحسن کے ہاں قیام فرمایا تھا۔ ان دنوں یونیورسٹی کے وائس چانسلر سیّد راس مسعود تھے جو علامہ اقبال کے بہت بڑے قدردان اور عقیدت مند تھے۔ علی گڑھ میں آپ کی تشریف آوری اور آپ کے لیکچروں کی وجہ سے وہاں ایک ناقابلِ فراموش علمی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ علامہ کے گرد اہلِ علم اور طلبہ کا ایک ہجوم جمع رہتا تھا اور مختلف علمی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔ ان دنوں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور پروفیسر رشید احمد صدیقی علیل تھے۔ پہلے آپ صاحبزادہ صاحب کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور پھر صدیقی صاحب کی مزاج پرسی کی غرض سے ان کے گھر گئے۔ واپسی پر مولانا سلیمان اشرف خاں کے ہاں بھی کچھ دیر قیام کیا جنھوں نے مولانا شبلی کے بارے میں بعض واقعات سنائے۔ علی گڑھ کے دوران قیام میں جن حضرات نے علامہ کے اعزاز میں ضیافتوں کا اہتمام کیا ان میں ڈاکٹر غلام محمد بٹ، پروفیسر غلام السیّدین اور بشیر زیدی صاحب پیش پیش تھے۔

"سہیل" بعض ناگزیر حالات کی بنا پر کچھ عرصہ بند رہا

مگر جنوری ۱۹۳۶ع کو پھر جاری ہو گیا ۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۶ع کا شمارہ سال نامے کی شکل میں شائع ہوا ۔ آنھی دنوں مولانا الطاف حسین حالی کی صد سالہ تقریب پانی پت میں منائی گئی تھی جس میں کئی سرکردہ اہلِ علم نے شرکت فرمائی تھی ۔ اس تقریب کی صدارت نواب حمید اللہ خاں والیِ بھوپال نے فرمائی تھی اور نواب راس مسعود نے اس میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا تھا ۔ دوسرے اہلِ علم میں پروفیسر رشید احمد صدیقی علی گڑھ سے ، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں دہلی سے اور علامہ اقبال لاہور سے تشریف لے گئے تھے ۔ اس تقریب میں جو مقالات اور نظمیں پڑی گئیں ، ''سہیل'' کے مذکورہ سال نامے میں وہ تمام شائع ہوئیں ۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی ایک مرتبہ لاہور آئے اور بعض مسائل کے سلسلے میں استفادے کی غرض سے علامہ کی خدمت میں بطور خاص حاضر ہوئے ۔ اس صحبت میں آنھوں نے جو فیض علامہ سے حاصل کیا اس کی کیفیت ایک مضمون میں بیان کردی جو ''بیادِ اقبال'' کے نام سے علامہ کی وفات کے بعد رسالہ ''جوہر'' دہلی میں ۱۹۳۸ع میں شائع ہوا ۔ وہ لکھتے ہیں :

''علامہ نے زیادہ تر وہی باتیں کہی ہیں جو قرآن اور حدیث میں ہیں ، آئمہ کے اقوال میں ہیں اور بزرگوں کے کارناموں میں ہیں ۔''

ایک مرتبہ یومِ اقبال کے موقع پر آنھوں نے وہاں ایک خطبہ بھی دیا ۔ اسی طرح دارالعلوم ندوۃ العلما میں بھی آنھوں نے دسمبر ۱۹۶۷ع میں ایک خطبہ علامہ کی شاعری کے موضوع پر دیا تھا ۔ غرض پروفیسر رشید احمد صدیقی نے علامہ کے فکر و فن کی اشاعت اور اس کی تحسین کا کوئی موقع کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا ۔

مئی ۱۹۳۵ء میں علامہ کی اہلیہ محترمہ (والدۂ جاوید) کا انتقال ہوگیا جس سے علامہ کی صحت پر بہت برا اثر پڑا ۔ بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت کا کوئی مناسب انتظام نہیں تھا جس سے آپ سخت پریشان تھے ۔ اُنھی دنوں کسی ذریعے سے معلوم ہوا کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ہاں ایک جرمن خاتون مس ڈورا قیام پذیر ہیں جو ضرورت مند ہیں اور بچوں کی گورنس کے طور پر نہایت موزوں ہیں ۔ علامہ نے احباب سے مشورے کے بعد پروفیسر صدیقی کو لکھا کہ ان خاتون کو فوراً میرے پاس بھیج دیں ، اور تمام شرائط اور فرائض بھی لکھ دیے ۔ چنانچہ یہ خاتون لاہور پہنچ گئیں اور پوری طرح بچوں کو سنبھال لیا جس سے علامہ کو اطمینان نصیب ہوا اور وہ پروفیسر صدیقی کے بے حد ممنون ہوئے ۔ یہ خاتون ریلوے سٹیشن کے قریب رہتی تھیں اور اُنھیں جاوید منزل تک لانے لے جانے کا کام میاں محمد شفیع اور علی بخش کے سپرد تھا ۔

مجھے کئی مرتبہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ہاں جانے اور قیام کرنے کا اتفاق ہوا ۔ وہ بے حد ملنسار اور خلیق انسان تھے ۔ ایک دفعہ میں ڈاکٹر محمود حسین خاں کے ساتھ بھی ان کے ہاں گیا تھا ۔ ان دنوں وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں پڑھا رہے تھے ۔ کافی عرصہ ان سے خط و کتابت بھی رہی مگر ان کے بیشتر خطوط ضائع ہوگئے ہیں ۔ اتفاق سے صرف ایک خط میرے پاس محفوظ رہ گیا ہے جو ذیل میں درج کر رہا ہوں ۔ یہ خط اُنھوں نے ''مرقع چغتائی'' کی رسید کے طور پر مجھے لکھا تھا ۔ دراصل ''مرقع چغتائی'' کی اشاعت کے فوراً بعد میں نے اُنھیں اس کا ایک نسخہ بھیجا تھا اور ساتھ ہی مئی ۱۹۳۸ء کو ایک خط بھی لکھا تھا جس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں :

"برادرم ! سلام مسنون ۔ 'مرقع' کا ایک نسخہ فضل الٰہی[1] صاحب سے مل گیا تھا اور میری بدنصیبی کہ میں آپ کو شکریے کا خط نہ لکھ سکا ۔ میری کل ہی کل میں اتنے دن ہوگئے ۔ بہرحال زیادہ دن گزر جانے سے شراب اور شکر دونوں پُرلطف ہو جاتے ہیں ۔ برادرم مکرّم چغتائی سے بھی شکریہ عرض کروں گا ۔ آپ کے جذبۂ لطف و کرم کے بعد یہ بہترین چیز تھی جو آپ اپنے نیازمندوں کو ہدیہ کر سکتے تھے ۔ مزید شکریہ ۔ اگر آپ نے اس کا موقع دیا تو یونیورسٹی ۱۵ جون سے بند ہو کر یکم اکتوبر کو کھلے گی ۔ ۲۰ ماہ حال کو آپ کا انتظار رہے گا ۔

ایک زمانے میں بہتوں کو یقین تھا کہ علامہ (اقبال) پبلک سروس کمیشن میں آ سکیں گے ۔ اب کسی دوسرے کی ... ہو رہی ہے ۔ آپ کو کچھ معلوم ہے ؟ ... علامہ کے دعا گو ہیں ۔

ادھر عرصے سے چغتائی صاحب کے نقوش کہیں نظر نہیں آئے ۔

۵ مئی ۱۹۳۸ع آپ کا رشید"

پروفیسر رشید احمد صدیقی ان دنوں مسلم یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر تھے اور اردو ادب کے نقاد اور محقق کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند تھا ۔ اسی زمانے میں دہلی ریڈیو سٹیشن کی نشریات کا آغاز ہوا تھا اور احمد شاہ بخاری مرحوم اس کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے

۱۔ فضل الٰہی صاحب لاہور کے رہنے والے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لائبریرین تھے ۔

تھے ۔ آنھوں نے علامہ اقبال پر گفتگو کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا تھا جو خاصا مقبول ہوا تھا ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے پبلک سروس کمیشن میں علامہ کی شمولیت کے بارے میں جو اشارہ اپنے خط میں کیا ہے ، میرے لیے یہ بات بالکل نئی ہے ۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی ضلع جونپور کے قریہ مریاہو کے رہنے والے تھے ۔ طویل عمر پا کر ۱۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو علی گڑھ میں آنھوں نے انتقال فرمایا اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ۔

۵۸

خطباتِ مدراس کا پس منظر

راؤ علی محمد خاں ، جو لدھیانہ کے علاقے رائے کوٹ کے باشندہ تھے ، کئی برسوں کے بعد ۱۹۲۲ء میں امریکہ سے واپس وطن آئے اور اپنے ساتھ ایک کتاب بھی لائے جس کا نام تھا :

Mohammadan Theories of Finance, by Nicholas P. Aghnider

(یعنی ''مسلمانوں کے نظریاتِ مالیات'' ، مصنفہ نکولاس پی ۔ اغنیدر) جو کولمبیا یونیورسٹی نیویارک سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی تھی ۔ یہ کتاب خاص طور پر علامہ اقبال کے لیے امریکہ کی مسلم ایسوسی ایشن کے صدر چودھری رحمت علی خاں نے بھیجی تھی اور کتاب کے اندر پہلے ورق پر مندرجہ ذیل الفاظ انھوں نے خود لکھے تھے :

> ''اس کتاب کا ماخذ مندرجہ ذیل مستند کتب ہیں : الھدایہ ، فقہ الاکبرِ امام اعظم ، درۃ المختار ، قُدوری اور مسندِ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ و برکاتہ ـــــ رحمت علی خاں ۔''

چودھری رحمت علی خاں عرصہ دراز سے امریکہ میں سکونت پذیر تھے ۔ وہ ضلع ہوشیار پور کے باشندہ تھے اور قومی تحریک کے بہت بڑے کارکن تھے ۔ انھوں نے لالہ لاجپت رائے اور ٹیگور جیسی ہندوستانی شخصیتوں کو مالی سہولتیں فراہم کر کے

امریکہ بلایا تھا ۔ اسی طرح علامہ اقبال کو بھی انھوں نے امریکہ آنے کی دعوت دی تھی مگر وہ نہ جا سکے ۔ میں ان دنوں لدھیانہ کے ٹیکنیکل سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا ۔

راؤ علی محمد خاں ، امریکہ کی مذکورہ مسلم ایسوسی ایشن کے سیکرٹری تھے اور چودھری رحمت علی خاں صدر تھے اور کئی سالوں سے یہ لوگ امریکہ میں مقیم تھے ۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی طرح علامہ بھی امریکہ آئیں ۔ جب علامہ نے لاہور میں اپنی نظم "طلوعِ اسلام" ۱۹۲۳ع میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھی تھی تو آپ کی خدمت میں میں نے یہ کتاب راؤ علی محمد خاں کی موجودگی میں پیش کی تھی ۔ آپ نے کتاب کو دیکھتے ہی خوشی کا اظہار فرمایا اور فوراً عینک لگا کر اس کا مطالعہ شروع کردیا ۔ یہ صبح قریباً ۸-۹ بجے کا واقعہ ہے ۔ میں وہاں سے نکل کر اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا اور پھر بعد دوپہر ۳-۴ بجے کے قریب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "ماسٹر ! وہ کتاب جو تم دے گئے تھے ، بہت دلچسپ ہے ۔ اس میں ایک مقام ایسا بھی ہے جس کی تحقیق لازمی ہے ۔

علامہ کا اندازِ مطالعہ بالکل نرالا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مطالعے کے دوران میں پوری کتاب کا لبِ لباب ان کے سامنے آ گیا ہے ؛ یعنی یہ کہ کتاب کا اصل موضوع کیا ہے اور مصنّف کے ذہن میں کیا ہے ؟ حالانکہ اکثر پڑھنے والے مصنف کی تصنیف سے ناآشنا ہی رہتے ہیں ، خواہ وہ کتاب کو بارہا پڑھیں ۔ صفحہ ۹۱ پر آپ نے جو نشان رکھا تھا ، اس کی ضروری عبارت یہ ہے :

"*As regards the ijma'* some Hanifites and the Mu'tazilites held that the ijma' can repeal the Koran and the Sunnah."

چنانچہ کتاب کی متذکرہ عبارت علامہ کے لیے علمی جستجو کا باعث بن گئی اور جو شخص بھی علامہ سے ملنے کے لیے آتا ، اس موضوع پر خوب گفتگو اور بحث ہوتی ۔ میں اُس وقت مستقل طور پر لاہور آ چکا تھا ۔ بدقسمتی سے انھی ایام میں علامہ کی لدھیانے والی اہلیہ کی شدید علالت کی خبر لدھیانے سے آئی اور آپ فوراً وہاں تشریف لے گئے ۔ زچگی کا معاملہ تھا لہٰذا نومولود بیٹے اور بیوی دونوں کا انتقال ہوگیا ۔ جب انتقال کی خبر لاہور پہنچی تو راقم ، منشی طاہر الدین اور چودھری محمد حسین فوراً لدھیانہ روانہ ہوگئے ۔ ہم نصف شب کے قریب وہاں پہنچے ۔ علامہ ہمارے پہنچنے پر اٹھ کر بیٹھ گئے ۔ آپ کی آواز خاصی بیٹھی ہوئی تھی اور بے کسی کا عالم تھا ۔ اسی شام دونوں ماں اور بچے کو دفنایا گیا تھا ۔ علامہ نے نہایت درد انگیز الفاظ میں وفات سے لحد میں اتارنے تک کے حالات ہم کو آبدیدہ ہوکر سنائے ۔ کافی دیر تک ہم بیٹھے رہے ۔ مرحومہ کے اعزّہ نے بھی کیفیتِ مرض کو بیان کیا ۔

صبح کے وقت لدھیانہ کے اکثر شرفا اور مرحومہ کے رشتہ دار تعزیت کے لیے آئے ۔ ان لوگوں میں قابلِ ذکر حضرات یہ تھے : مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی ، مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی اور میاں عبدالحی لدھیانوی (جو بعد میں وزیرِ تعلیم بھی ہوگئے تھے) ۔ علامہ لدھیانہ میں تین دن رہے ۔ ہم لوگ بھی ان کے ساتھ تھے ۔ ہر روز مجمعِ احباب لگتا اور کئی موضوعات زیرِ بحث آتے ۔ جب کوئی نکتہ ذہن میں پیدا ہو جاتا تو علامہ اسی پر متواتر گفتگو کرتے رہتے ۔ آپ کا رویہ ایک طرح استصواب کا ہوتا اور کوشش یہ ہوتی کہ موضوع کی تہہ تک پہنچا جائے ۔ ان دنوں ''اجماع فی الاسلام'' کے موضوع پر گفتگو زیادہ ہوتی تھی ۔

اسی زمانے میں لدھیانہ کے مدرسۂ اہلِ حدیث میں ایک مولوی محمد امین صاحب لدھیانوی رہتے تھے ۔ یہ مدرسہ میاں عبدالحی کے خسر میاں عبدالرحیم صاحب نے اپنے مکان سے ملحق مسجد میں قائم کر رکھا تھا ۔ دوسرے روز علامہ کے فرمانے پر میں مولوی محمد امین مرحوم کو مدرسے سے علامہ کی خدمت میں لے آیا ۔ وہ علمِ معقولات کے ضمن میں نہایت ٹھوس قابلیت رکھتے تھے ۔ علامہ نے ان سے بھی اجماع کے موضوع پر گفتگو کی ، مگر ہنوز گفتگو کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ ہم لدھیانہ سے لاہور آ گئے ۔ پھر یہاں بھی یہ سلسلۂ گفتگو برابر جاری رہا ۔

چنانچہ لاہور آ کر میں علامہ کے حکم پر ان کی خدمت میں مولوی سید طلحہ ، مولوی اصغر علی روحی اور مولوی غلام مرشد صاحب کو لے کر گیا اور ان کے ساتھ طویل ملاقاتیں ہوئیں ۔ اسی طرح بعض دیگر حضرات سے بھی گفتگو اور استصواب کیا گیا ۔ میں نے سید طلحہ کے مشورے سے امام شاطبی کی ''کتاب الموافقات'' خریدی جو علامہ کے زیر مطالعہ رہی ۔ افسوس کہ وہ کتاب پروفیسر تاثیر سے کہیں ضائع ہوگئی ۔

جب علامہ اس سلسلے میں اپنے طور پر مطمئن ہوگئے تو آپ نے ان تمام بحثوں اور مطالعے کو سامنے رکھ کر انگریزی زبان میں ایک طویل مقالہ بعنوان ''اجتہاد فی الاسلام'' لکھنا شروع کیا ۔ جب تمام مسودہ آپ نے اپنے ہاتھ سے لکھ لیا تو میں ان کے فرمانے پر اپنے گھر سے ''ٹائپ رائٹر'' لے آیا اور میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں بیٹھ کر آپ کے زیرِ ہدایت مسودے کو ٹائپ کیا ۔ گرمیوں کی تعطیلات کے دن تھے ۔ علامہ کا انگریزی خط نہایت صاف تھا ۔ ٹائپ کے دوران میں وہ خود کہیں کہیں اصلاح بھی فرماتے تھے ۔

اس طرح تمام مقالہ آپ نے اپنے سامنے ٹائپ کرایا اور آخر دم تک تصحیح فرماتے رہے ۔ پھر اس بحث کو علامہ دیگر تحریروں میں بھی استعمال کرتے رہے ۔ اس دوران میں بعض لطائف بھی ہوئے جن کو یہاں بیان کرنا بے محل ہوگا ۔

جب یہ مضمون تیار ہوگیا تو آپ نے اسے دسمبر ۱۹۲۸ء کو اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں زیرِ صدارت شیخ عبدالقادر پڑھا ۔ اس جلسے میں کافی اہلِ علم حضرات موجود تھے جن میں ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ مرحوم اور مولانا محمد علی مرحوم امیرِ جماعتِ احمدیہ لاہور قابلِ ذکر ہیں ۔ اس جلسے میں مولانا ظفر علی خاں بھی موجود تھے اور تمام ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا ۔

مضمون پڑھنے سے پیشتر علامہ نے اس کی اہمیت اور اس کا پس منظر بھی بیان کیا ۔ پھر مولوی محمد علی امیرِ جماعتِ احمدیہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں نے بارہا آپ سے عرض کی ہے کہ اگر مرزا غلام احمد صاحب کوئی نئی شریعت لے کر آئے ہیں تو آپ لوگوں کا فرض تھا کہ آپ اسے پیش کرتے ۔ نبی عام طور پر نئی شریعت لاتا ہے اور ماقبل کی شریعت میں رد و بدل کرتا ہے مگر آپ کی طرف سے ابھی تک کوئی ثبوت نہیں دیا گیا ۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ علامہ نے اپنے میکلوڈ روڈ والے مکان پر بھی مولانا محمد علی سے اسی طرح کی گفتگو کی تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات موضوعِ گفتگو تھی ۔

حاضرین نے یہ مضمون نہایت توجہ سے سنا لیکن چونکہ مضمون انگریزی زبان میں تھا اس لیے لوگوں نے اس سے کماحقہ' استفادہ نہ کیا ۔ لوگ عام طور پر علامہ سے نظم سننے کے عادی تھے ۔ مضمون کے اختتام پر صدرِ جلسہ شیخ عبدالقادر نے اپنے صدارتی کلمات میں

فرمایا کہ اقبال کا یہ علمی کارنامہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ پھر مولوی ظفر علی خاں نے مشورہ دیا کہ یہ مضمون اُردو زبان میں منتقل ہونا چاہیے جس پر علامہ نے کہا کہ میں بہ طیبِ خاطر اس کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ مولانا ظفر علی صاحب خود اس کا اُردو ترجمہ کرنے کی زحمت فرمائیں، کیونکہ وہی اس کا بہتر ترجمہ کر سکتے ہیں۔

اختتامِ مضمون پر علامہ نے یہ بھی فرمایا کہ مضمون ہنوز نامکمل ہے۔ فی الحال یہ مقصد مدِ نظر ہے کہ لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا جائے اس لیے اس پر کسی قسم کی تنقید یا تبصرے کی ضرورت نہیں۔ تاہم اخبارات میں اس مضمون کا بہت چرچا ہوا اور اس سے لوگوں کو علامہ کی تازہ علمی تحقیقات کا علم ہوا۔

مدراس میں ایک مخیّر مسلمان سیٹھ جمال محمد رہتے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے تاجرِ چرم اور ایک درد مند مسلمان تھے۔ انھوں نے مدراس میں اپنے نام پر ایک ''مدرسۂ جمالیہ'' بھی قائم کر رکھا تھا جس کا نظامِ تعلیم ندوۃ العلوم لکھنؤ کے طرز پر مرتّب کیا جاتا تھا۔ سیٹھ جمال محمد صاحب اکثر علمائے دین کو ہندوستان کے مختلف شہروں سے لیکچروں کی دعوت دیا کرتے تھے۔ علامہ سے پیشتر مولانا سیّد سلیمان ندوی اور مارما ڈیوک پکتھال جیسے فضلا بھی آپ کی دعوت پر اسلام کی حقانیت پر لیکچر دے چکے تھے جو بصورتِ کتاب طبع ہو چکے ہیں۔

جب اخبارات میں علامہ کے مذکورہ مضمون کا چرچا ہوا تو مدراس سے سیٹھ حمید حسن نے سیٹھ جمال کی طرف سے علامہ کو

۱۔ اقبال نامہ، حصہ دوم، ص ۲۳۳، لاہور ۱۹۵۱ء۔

بھی لیکچر دینے کے لیے دعوت نامہ ارسال کیا ۔ جب احباب کو اس دعوت کا علم ہوا تو سب نے مشورہ دیا کہ اس دعوت کو ہر حالت میں قبول کرنا چاہیے ۔

چنانچہ احباب کے مشورے پر علامہ نے اس دعوت کو قبول فرما لیا اور طے پایا کہ اس موقع پر علامہ چھ لیکچر تیار کریں گے ۔ تاہم مدراس روانہ ہونے سے پیشتر بمشکل تین لیکچر تیار ہو سکے تھے جن کی تیاری کے سلسلے میں راقم نے بھی بہت تگ و دو کی تھی ۔ سب سے پہلے ایک ایسے سٹینو کی ضرورت تھی کہ زیادہ زیرباری بھی نہ ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ شخص خود علامہ کے مکان پر آ کر ان سے اِملا لے سکے ۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک دیرینہ ملاقاتی سٹینو محمد یعقوب سے ذکر کیا تو وہ مان گئے ۔ وہ اُن دنوں کوآپریٹو سوسائٹی کے رجسٹرار سر ڈارلنگ کے اسٹینو تھے ۔ اُن سے معاملہ اس طرح طے ہوا کہ وہ فرصت کے وقت علامہ کے پاس آ کر ان سے املا لیا کریں گے اور پھر ٹائپ کر کے علامہ کو دکھایا کریں گے ۔ اس امر کی تصدیق علامہ کے حسب ذیل خط سے بھی ہوتی ہے جو راقم کے نام ہے[1] :

”۳۰ اپریل ۱۹۲۷ء

ڈیئر ماسٹر صاحب ۔ السلام علیکم

کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ مسٹر محمد یعقوب ہر روز کسی ایسے وقت ، جو ان کے لیے اور میرے لیے موزوں ہو ، یہاں آیا کریں ۔ آپ نے آج صبح بتایا تھا کہ وہ ۷ مئی کو شملہ جانے والے ہیں اس واسطے ضروری ہے کہ ان کے جانے سے پہلے جس قدر بھی میں لکھوا سکوں لکھوا لیا جائے ۔ مہربانی کر کے ان سے دریافت

کر کے مجھے مطلع فرمائیں ، بلکہ بہتر ہوگا ان کو ساتھ
لے آئیں ، تاکہ زبانی گفتگو ہو جائے ۔ شاید چار بجے کے
بعد وہ آسکتے ہوں گے ۔ میں ان سے پہلا لیکچر ، جو
دیباچے کے طور پر ہوگا ، لکھوانا شروع کر دوں گا ۔ اس
طرح ممکن ہے کہ دسمبر تک سب لیکچر ختم ہو جائیں ۔
محمد اقبال ، لاہور"

چنانچہ مسٹر محمد یعقوب نے نہایت محنت اور کاوش سے ، بغیر
کسی اجرت یا معاوضے کے ، تمام کام انجام دیا ۔ یہاں یہ بیان کرنا
بھی بے محل نہ ہوگا کہ مسٹر محمد یعقوب لدھیانے کے رہنے والے تھے
اور علامہ کی لدھیانے والی اہلیہ کے عزیزوں میں سے تھے ۔ وہ
علامہ کی اس مرحومہ بیوی سے منسوب بھی رہ چکے تھے مگر علامہ
کو اس بات کا علم نہیں تھا ۔ وہ کشمیری برادری کے ایک ممتاز
فرد تھے ۔

غرضکہ اس طرح تین لیکچر تیار ہو سکے اور یہی لیکچر
مدراس ، حیدرآباد دکن اور علی گڑھ میں دیے گئے تھے ۔ باقی تین
لیکچر بعد میں تیار ہوئے تھے ۔ ایک اور لیکچر آپ نے لندن میں
بھی تیار کیا تھا جو بعد میں "مجموعۂ خطبات" میں شامل کیا
گیا تھا ۔

☆ ☆ ☆

۵۹

سفرِ مدراس کا آغاز

جیسا کہ پہلے بیان ہوا ، جب اخبارات میں علامہ کا لیکچر اور تمام حالات شائع ہوئے اور مدراس کے ذی علم حضرات نے ان کا مطالعہ کیا ، اور خاص طور پر سیٹھ جمال محمد اور ان کے سیکرٹری سیٹھ حمید حسن نے اس خبر کا مطالعہ کیا تو ان کی انجمن ''مسلم ایسوسی ایشن نے علامہ کو مدراس بلانے کا فیصلہ کیا ۔ چنانچہ انھوں نے ایسوسی ایشن کی طرف سے آپ کو مدراس آ کر لیکچر دینے کی دعوت دی اور لکھا کہ ہم آپ کے تمام اخراجات برداشت کریں گے ۔ اس کے علاوہ لیکچروں کا معاوضہ بھی ادا کریں گے ۔ اس سے پیشتر ہمارے ہاں علامہ سیّد سلیمان ندوی اور مسٹر مارما ڈیوک پکتھال کے لیکچر بھی ہو چکے ہیں ۔

جب یہ دعوت نامہ علامہ اقبال کے پاس آیا تو طویل سفر کی وجہ سے انھوں نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی ۔ تاہم احباب نے علامہ کو یہ دعوت قبول کرنے پر آمادہ کر لیا ۔ تاریخ اور دن کا معاملہ علامہ کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ۔

جب آپ نے مدراس میں لیکچر دینے کا پختہ ارادہ کر لیا تو لیکچرز کی تیاری کے سلسلے میں دوڑ دھوپ باقاعدہ شروع کر دی ۔

سب سے پہلے آپ نے اسلام کی فلسفیانہ روایات کی تشکیلِ نو پر اپنی تحقیقات شروع کر دیں ، حالانکہ ابھی تک کسی لیکچر کا عنوان طے نہیں ہوا تھا اور نہ ہی لیکچرز کی تعداد کا ذکر ہوا تھا ۔ میں آن دنوں آپ کے ہاں صبح شام جاتا تھا اور ضروری ماخذ کے حصول اور بعض علما سے علامہ کی بالمشافہ مشاورت کا انتظام کرتا تھا ۔ میں اس علمی جستجو کی مکمل کیفیت کسی اور جگہ تفصیلاً پیش کر چکا ہوں ۔

لیکچرز کی دعوت قبول کرنے کے بعد کئی قسم کی مصروفیات اور ہنگامے حائل ہوئے جن میں انتخابِ کونسل ، مسجد شہید گنج کا واقعہ اور ''رنگیلا رسول'' کا مقدمہ قابلِ ذکر ہیں ۔ اس کے علاوہ آپ کی خانگی اور گھریلو زندگی کے مسائل بھی گوناگوں تھے جن کی وجہ سے سفر مدراس میں کچھ تاخیر ہوگئی ۔ انھی مصروفیات کی بدولت مدراس جانے سے پیشتر علامہ صرف تین لیکچر تیار کر سکے تھے ، حالانکہ اعلان چھ لیکچروں کا ہو چکا تھا ۔ چنانچہ باقی تین لیکچر مدراس سے واپسی پر شامل کیے گئے تھے جن کا مواد آپ کے ذہن میں تیار تھا ۔

بالآخر دسمبر ۱۹۲۸ع میں علامہ نے مدراس جانے کا مصمّم ارادہ کرلیا ۔ اس ضمن میں مسلم ایسوسی ایشن مدراس کے تمام متعلقہ حضرات اور سیٹھ جمال محمد کو بھی مطلع کر دیا گیا ۔

انھی دنوں دہلی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس بھی سر آغا خان کی زیرِ صدارت منعقد ہو رہی تھی جس میں شرکت کے لیے علامہ صاحب ، آغا خان کی دعوت پہلے ہی قبول فرما چکے تھے ۔ یہ کانفرنس دسمبر ۱۹۲۸ع کے آخر میں منعقد ہونا قرار پائی تھی ۔ اس میں شرکت کے لیے پنجاب سے ملک فیروز خاں نون ، مولٰنا غلام رسول مہر

اور مولانا عبدالمجید سالک بھی جا رہے تھے ۔ دہلی کے ریلوے سٹیشن پر علامہ کی رہائش کے لیے ملک فیروز خاں نون نے دو کمروں کا انتظام کروایا تھا ۔

۳۰ دسمبر ۱۹۲۸ع کو اس طویل سفر کا آغاز ہوا ۔ راقم کے علاوہ چودھری محمد حسین کی رفاقت کا پروگرام بھی طے ہو چکا تھا ۔ چنانچہ صبح صبح ہم لوگ ریلوے سٹیشن پر جانے کے لیے علامہ کی موٹر میں چل دیے ۔ ہمارا پروگرام ایکسپرس ٹرین سے جانے کا تھا ۔ علامہ کے سفر کا یہ پروگرام بظاہر کسی کے علم میں نہیں تھا مگر جب ہم لاہور ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو خواجہ محمد سلیم وہاں ہار لے کر موجود تھے ۔ لاہور سے دہلی تک کا یہ سفر ہم نے اور مولانا مہر و سالک وغیرہ نے ایک ہی گاڑی میں طے کیا ۔ قریباً ۸ بجے شام ہم لوگ دہلی پہنچ گئے ۔ پروگرام کے مطابق ہم تو دہلی کے ریلوے اسٹیشن کے مخصوص شدہ کمروں میں چلے گئے ، جبکہ مولانا مہر اور سالک کے لیے شہر میں انتظام کیا گیا تھا ۔ وہ وہاں تشریف لے گئے ۔

٦٠

آل پارٹیز مسلم کانفرنس دہلی

(یکم جنوری ۱۹۲۹ء)

یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ جب حضرت علامہ سفرِ مدراس پر روانہ ہوں گے تو پیشتر ازیں یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو دہلی میں منعقد ہونے والی آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں بھی شرکت فرمائیں گے جس کی صدارت سر آغا خان کرنے والے تھے ۔ ہم لوگ (علامہ اقبال ، چودھری محمد حسین مرحوم اور راقم) ۳۰ دسمبر کو مدراس کے لیے لاہور سے روانہ ہوئے تو سٹیشن پر خواجہ سلیم نے علامہ کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر رخصت کیا ۔ جن دوسرے لوگوں نے اس کانفرنس میں شرکت کرنی تھی وہ بھی ہمارے ساتھ اسی گاڑی سفر کر رہے تھے جس میں ہم لوگ جا رہے تھے ۔ ان میں قابلِ ذکر ہمارے کرم فرما اور بے تکلف دوست مولانا غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک تھے جن کی معیت علامہ کے لیے بطورِ خاص باعثِ مسرت تھی ۔ دوسرے لوگوں میں ملک فیروز خاں نون اور میاں سر محمد شفیع قابلِ ذکر ہیں ۔ ملک فیروز خاں نون ان دنوں پنجاب کے وزیرتعلیم بھی تھے ۔

۳۱ دسمبر کو ہم لوگ دہلی پہنچ گئے اور ریلوے سٹیشن کے آن

کمروں میں آرام کیا جن کا انتظام ملک فیروز خاں نون نے پہلے ہی کر رکھا تھا ۔ ایک طرح ہم لوگ ملک صاحب ہی کے مہمان تھے ۔ کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر حکیم جمیل احمد خاں تھے جو حاذق الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے صاحبزادے ہیں ۔

سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ مسلمانوں کے لیے بہت آزمائش کا تھا ۔ مسلمانوں کی سیاست کا نقشہ یوں تھا کہ مرکزی مجلسِ خلافت میں مولانا شوکت علی ، مولانا محمد علی جوہر ، شیخ عبدالمجید سندھی ، سیٹھ عبداللہ ہارون اور دوسرے مجاہدین اسلام تھے ۔ جمعیت العلمائے ہند کی قیادت اُس وقت مولانا مفتی کفایت اللہ ، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا احمد سعید جیسے علما کے ہاتھ میں تھی ۔ یہ جماعتیں کانگرس کی مسلم کش پالیسی سے بیزار ہو چکی تھیں جو ایک طرح ہندو مہاسبھا کا کردار کر رہی تھی ۔ ادھر مسلم لیگ دو دھڑوں میں بٹ چکی تھی ۔ ایک گروہ کے صدر مسٹر محمد علی جناح تھے اور دوسرے کے صدر سر محمد شفیع تھے جن کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ اصلاحات کے لیے موزوں فضا اور مناسب وقت آنے والا ہے اس لیے مسلمانوں کو منظم ہو جانا چاہیے ۔ اب ضروری ہوگیا ہے کہ لیگ کے دونوں دھڑے یک زبان ہو کر مسلمانان ہند کے مفادات کا تحفّظ کریں ۔ ان دونوں دھڑوں میں بنیادی اختلاف اس بات میں تھا کہ مسٹر جناح مخلوط انتخابات کے حامی تھے جبکہ سر محمد شفیع کا مطالبہ یہ تھا کہ دونوں قوموں کو جداگانہ نیابت کا حق دے کر جداگانہ انتخابی حلقے قائم کیے جائیں ۔ مسٹر جناح ان ایام میں کلکتہ کنونشن کی دعوت پر چلے گئے تھے جہاں تمام کانگرسی ہندو جمع تھے ۔ اُنھوں وہاں یہ تجویز پیش کی کہ ہر صوبے میں مسلمانوں کے تناسبِ آبادی کے مطابق نشستیں مخصوص کر دی جائیں مگر انتخاب مخلوط ہی رہے ، لیکن ان

کی اس تجویز پر بھی کسی نے کوئی توجہ نہ دی۔ غرض کہ یہ پس منظر تھا جس میں مسلمانوں نے اپنی الگ آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔

مولانا سالک اور مولانا مہر ۳۱ دسمبر اور یکم جنوری کو دو دن کے لیے اپنا اخبار ''انقلاب'' بند کر کے اس جلسے میں شامل ہو رہے تھے۔ سالک نے اس سے پہلے دہلی نہیں دیکھی تھی اور وہ مہر کی ترغیب پر پہلی مرتبہ یہاں آئے تھے۔ انھوں نے اپنے قیام کے لیے چاندنی چوک میں دو تین ہوٹل دیکھے مگر پسند نہ آئے۔ بالآخر وہ بھی ریلوے اسٹیشن کے ریٹائرنگ میں آ گئے۔ ان کے لیے ایک الگ کمرے کا انتظام کر دیا گیا اور وہ ہمارے ساتھ مقیم ہو گئے۔ ان کی وجہ سے ہماری محفل میں اچھی خاصی گرما گرمی رہتی تھی اور گپ شپ میں بڑا اچھا وقت گزرتا تھا۔ جب ملک فیروز خاں نون کو معلوم ہوا کہ سالک پہلی مرتبہ دہلی آئے ہیں تو وہ بہت حیران ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے سالک کو اپنا مہمان بنا لیا اور دہلی میں گھومنے کے لیے ایک ٹیکسی کا بندوبست بھی کر دیا۔

دوسرے روز یکم جنوری کو جامع مسجد دہلی کے سامنے کھلے میدان میں کانفرنس شروع ہو گئی۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، کانفرنس کے صدر سر آغا خاں بطورِ خاص انگلستان سے آئے تھے اور وائسرائے کے مہمان تھے۔ سٹیج نہایت عمدگی سے آراستہ کی گئی تھی۔ صاحبِ صدر کی سنہری کرسی کے پیچھے خاص نمایندے یعنی علامہ سر محمد اقبال، میاں سر محمد شفیع، سر ابراہیم رحمت اللہ اور سر عبد القیوم تشریف فرما تھے۔ صدر کے دائیں بائیں مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید اور دیگر علمائے کرام رونق افروز تھے۔ مرکزی مجلس خلافت کے نمایندے مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، شیخ

عبدالمجید سندھی ، نواب محمد اسماعیل خان اور تمام صوبوں کی مجالسِ قانون ساز کے منتخب نمایندے بھی سٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے ۔

مسلمانوں کی یہ کانفرنس ہندوستان کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے ۔ اس کے بعد آج تک ایسا عظیم الشان اجتماع نہیں دیکھا گیا ۔ حتٰی کہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آ جانے کے بعد بھی اس پیمانے کی نمایندہ کانفرنس پھر دیکھنے میں نہیں آئی ۔ کافی تعداد میں قادیانی ممبر بھی اس میں شامل تھے ۔ میں اپنے نقطۂ نظر سے اس کانفرنس کو ایک طرح پاکستان کی بنیاد تصور کرتا ہوں ۔

صاحبِ صدر سر آغا خان کا ستقبال نہایت جوش و خروش سے کیا گیا اور وہ تلواروں کے سائے میں سٹیج پر تشریف لا کر کرسیِ صدارت پر متمکن ہوئے ۔ ان کا خطبۂ صدارت بہت مختصر تھا جو صرف چار صفحات پر مشتمل تھا ۔ غالباً یہ انگلستان میں لکھا گیا تھا اور وہیں طبع بھی ہوا تھا ۔ سب سے پہلے راقم نے اس کی کچھ کاپیاں لے جا کر سٹیج پر بیٹھے ہوئے احباب اور دیگر زعما میں تقسیم کیں ۔ خطبے کا آغاز بادشاہ جارج پنجم کی صحت یابی پر اظہار اطمینان سے ہوا تھا ۔ پھر سیاسی امور پر عالمانہ انداز میں تھوڑا سا تبصرہ بھی کیا گیا تھا ۔ مسلمانوں کو ہر جگہ "مسلم نیشن" کے الفاظ سے خطاب کیا گیا تھا ۔

خطبۂ صدارت کے بعد میاں سر محمد شفیع نے مخلوط انتخاب کے مطالبے پر مشتمل قرارداد پیش کی اور اس کی تائید میں ایک مدلل تقریر فرمائی ۔ ان کے بعد مفتی کفایت اللہ صاحب نے قرارداد کی تائید میں نہایت جامع تقریر فرمائی ۔ یہ عجیب و غریب اجتماع تھا کہ ایک ہی سٹیج پر مختلف الخیال لوگ جمع تھے ۔ مفتی کفایت اللہ صاحب کے بعد مولانا محمد علی کھڑے ہوئے اور مخلوط انتخابات کے حق میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں نیشنلزم کے طریق پر ہی

زندگی بسر کرنی ہوگی لہٰذا مخلوط انتخابات ناگزیر ہیں ۔ ان کی اس تجویز کے خلاف ہر طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں ۔ اگرچہ کوئی بھی ان کی بات سننے پر آمادہ نہ تھا مگر وہ ڈٹے رہے ۔ اس تقریر کے بعد کچھ اور زعما نے بھی خطاب کیا اور پھر دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا ۔ اس طرح اجلاس کی پہلی نشست اختتام پذیر ہوئی ۔ سر آغا خاں لنچ پر جاتے وقت یہ اشارہ کرتے گئے تھے کہ کسی طرح مولانا محمد علی کو ہموار کر لیا جائے ۔

مولانا محمد علی کو ہم خیال بنانے کا مسئلہ معمولی نہیں تھا مگر مولانا مہر اور مولانا سالک نے اس سلسلے میں جو کردار ادا کیا وہ ناقابلِ فرموش ہے ۔ بالآخر انھوں نے مولانا کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اگر اس قرارداد میں ترمیم کردی جائے تو وہ بھی متفق ہو جائیں گے ۔ ترمیم یہ تھی کہ اگر ہندو ، مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کر لیں تو پھر مخلوط انتخابات پر بھی انھیں رضامند کیا جا سکے گا ۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ صبح کے اجلاس میں سر میاں محمد شفیع اور مفتی کفایت اللہ صاحب کی تقریروں کے بعد مولانا شفیع داؤدی اور علامہ اقبال نے بھی خطاب کیا تھا ۔ حضرتِ علامہ کی پُرمغز تقریر کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے :

”گزشتہ تین چار سال سے ہم کو جو مشاہدات اور تجربات حاصل ہو رہے ہیں وہ نہایت مفید اور نتیجہ خیز ہیں ۔ ہم کو جو باتیں برادرانِ وطن کے متعلق قیاسی طور پر معلوم تھیں ، اب وہ یقینی طور پر ہمارے علم میں آ گئی ہیں ۔ میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سرسید احمد خاں علیہ الرحمہ نے مسلمانوں کے لیے

جو راہِ عمل متعین تھی وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد اب اس راہ کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔

حضرات! آج میں نہایت صاف لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان ہونے کے زندہ رہنا ہے تو ان کو جلد از جلد ایک علیحدہ پولیٹیکل پروگرام بنانا چاہیے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے بعض حصے ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض حصے ایسے ہیں جن میں وہ قلیل تعداد میں ہیں۔ ان حالات میں ہم کو علیحدہ طور پر ایک پولیٹیکل پروگرام بنانے کی شدید ضرورت ہے۔ آج ہر قوم اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے سعی و کوشش کر رہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے کوئی کوشش نہ کریں۔ آج اس کانفرنس میں جو ریزولیوشن پیش ہوا ہے وہ نہایت صحیح ہے اور اس کی صحت کے لیے میرے پاس ایک مذہبی دلیل ہے: وہ یہ ہے کہ ہمارے آقائے نامدار حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری اُمت کا اجتماع کبھی گمراہی پر نہیں ہوگا۔" (نعرہ ہائے "اللہ اکبر" اور مسلسل اظہارِ مسرت)۔

دوپہر کے کھانے کے بعد جلسے میں وہ گہما گہمی نہیں تھی جو صبح کے اجلاس میں دیکھنے میں آئی تھی۔ سر آغا خان خود بھی کافی دیر کے بعد آئے تھے۔ آخر میاں محمد شفیع نے آغا خان کے مشورے سے اس طرح تقریر شروع کی کہ میرے بھائی محمد علی نے جو ترمیم تجویز کی ہے، مجھے منظور ہے۔ اس کے بعد صاحبِ صدر نے حاضرین کی رائے

طلب کی تو متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور کرلی گئی۔

اس کانفرنس کی اہمیت مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی واضح ہوتی ہے جو سائمن کمیشن کی رپورٹ سے لیا گیا ہے۔ (سائمن کمیشن کی رپورٹ ١٩٣٠ء میں منظرِ عام پر آئی تھی) :

”دو مسلمان ارکانِ کمیٹی اپنے رفقا سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی سفارشات سے اتفاق کرتے ہیں جو دہلی میں جنوری ١٩٢٩ء میں منعقد ہوئی تھی۔ یعنی یہ کہ ہر مقام پر جداگانہ انتخاب بحال رکھا جائے، موجودہ بنیادوں پر ایسے صوبوں میں جن میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور مردم شماری کی بنیاد پر ایسے صوبوں میں جن میں وہ اکثریت میں ہیں۔“

سائمن رپورٹ کے جس حصے سے یہ اقتباس نقل کیا گیا ہے وہ خاصا طویل ہے۔ کمیشن کی اس رپورٹ میں مذکورہ کانفرنس کا پورا ریزولیوشن موجود ہے اور اس سے مطالبات کے تمام پہلو واضح ہوتے ہیں۔

اس وقت لوگوں کا خیال تھا کہ مسٹر جناح، جن کو کانگرس کے اجلاس میں کافی خفّت اٹھانی پڑی تھی، دہلی ضرور تشریف لائیں گے، مگر وہ سیدھے بمبئی چلے گئے اور دو تین ماہ تک ان کی طرف سے کسی ردعمل کا اظہار نہیں ہوا۔ اپریل ١٩٢٩ء میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے مہر اور سالک کے ذریعے کوشش کی کہ لیگ کے دونوں دھڑے یک جا ہو جائیں کیونکہ جناب محمد علی جناح مسلمانوں کے رجحان سے اب بخوبی واقف ہو چکے تھے اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے مطالبات سے ملک بھر کے مسلمان متفق تھے۔ ڈاکٹر کچلو جب مہر اور سالک کی معیت میں علامہ اقبال سے ملے تو پہلے تو کچھ

طنز اور استہزا کی باتیں ہوئیں مگر بالآخر یہ طے پایا کہ دہلی میں دونوں دھڑوں کا ایک مشترکہ اجلاس بلایا جائے اور ایک مرتبہ پھر اُنھیں ایک دوسرے میں مدغم کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور سر محمد شفیع، جنابِ جناح کے حق میں صدارت سے دست بردار ہوگئے اور اس طرح مسلم لیگ پھر ایک ہوگئی۔

اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد حکومتِ برطانیہ نے سائمن کمیشن کی رپورٹ کو دیکھ کر اور ملکی حالات کے پیش نظر ۱۹۳۰ع میں لندن میں گول میز کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کردیا۔ مسلم مندوبین کی فہرست میں مسٹر جناح بھی تھے اور علامہ اقبال بھی تھے۔ مسٹر جناح اس کانفرنس کی ناگوار فرقہ وارانہ بحثوں اور دلآزار کشمکشوں سے اس قدر بیزار ہوئے کہ پہلی گول میز کانفرنس کے بعد لندن میں مقیم ہوگئے اور وہیں وکالت شروع کردی۔ پھر وہ ۱۹۳۴ع میں ہندوستان واپس تشریف لائے۔

مذکورہ آل انڈیا مسلم کانفرنس میں، جو ۱۹۲۹ع میں دہلی میں منعقد ہوئی تھی، ایک صاحب حفظ الرحمٰن بی۔ اے مالک و مدیر "علی گڑھ میل" نے بہت سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ اُنھوں نے اس کانفرنس کی ایک مفصّل رپورٹ بھی مرتّب کی تھی جو میری نظر سے نہیں گزری۔

کانفرنس کا دوسرا اجلاس نومبر ۱۹۳۰ع میں لکھنو میں منعقد ہوا جس کی صدارت نواب محمد اسماعیل خاں نے کی تھی۔ اس کی جو رپورٹ حفظ الرحمٰن صاحب نے مرتّب کی تھی وہ میرے سامنے ہے۔ اس میں اُنھوں نے کانفرنس کے پہلے اجلاسِ دہلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں بحیثیت پریس رپورٹر کے شریک ہوا تھا اور سیکرٹری صاحب کے ایما پر اُردو اور انگریزی میں ایک با تصویر رپورٹ بھی

تیار کی تھی۔

دوسرے اجلاس کے مندوبین میں محترم غلام رسول مہر کا نام بھی شامل ہے اور کانفرنس کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ مسلمانوں نے جداگانہ انتخابات کی تائید کی تھی اور اس سلسلے میں ریزولیوشن بھی پاس ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

٦١

خطباتِ مدراس

سفرِ مدراس کی بقیہ روداد یوں ہے کہ ہم لوگ ۲ جنوری ۱۹۲۹ء کو ساڑھے آٹھ بجے صبح دہلی سے مدراس جانے کے لیے فرنٹیر میل میں سوار ہوئے۔ ہم تینوں ہم سفر ایک ہی کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ دہلی ریلوے اسٹیشن پر مسٹر جان محمد نے ہماری بہت مدد کی تھی۔ میرا قلم دہلی ریلوے سٹیشن پر ایک کلرک کے ہاتھ میں رہ گیا تھا جس نے ہمارے ٹکٹوں پر کوئی اندراج کرنے کے لیے وہ قلم لیا تھا۔ گاڑی کے دہلی ریلوے سٹیشن سے نکلنے کے بعد جب مجھے قلم کا خیال آیا تو میں نے علامہ سے ذکر کیا۔ آپ نے از راہِ ظرافت فرمایا کہ ماسٹر! تمھاری تو گویا بیوی دہلی میں رہ گئی ہے اور پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ غرض اسی طرح یہ تمام سفر لطائف و ظرائف میں بخیر و خوبی کٹا جو آج بھی یاد ہیں۔

اگلے روز صبح کے وقت بمبئی کے ریلوے سٹیشن کولابا پر ہم گاڑی سے اترے تو وہاں علامہ کے استقبال کے لیے سیٹھ اسماعیل کے صاحبزادے سیٹھ محمد موجود تھے۔ انھوں نے علامہ سے خط و کتابت کرکے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ وہ اُن کو اپنے دولت خانے پر لے جائیں گے۔ اُن کی اہلیہ، جو پردہ بھی کرتی تھیں، جرمنی کی ایک

اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ انھوں نے علامہ کی خدمت میں گوئٹے کی مشہور تصنیف ''فاؤسٹ'' (جرمنی زبان میں) ارسال کی کہ آپ اس پر اپنا کوئی شعر بطورِ یادگار لکھ دیں۔ چنانچہ حضرتِ علامہ نے حسبِ ذیل شعر اس کتاب پر لکھا:

کلام و فلسفہ از لوحِ دل فرو شستم
ضمیرِ خویش کشادم بہ نشترِ تحقیق

یہ شعر گوئٹے ہی سے متعلق تھا۔ بمبئی میں اُس شام رات کے کھانے کا بڑے پیمانے پر انتظام کیا گیا تھا۔ اس دعوت میں بمبئی کے اکثر اکابر اور مشاہیر نے شرکت کی تھی جن کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

بمبئی سے مدراس جانے کے لیے ہم ۳ جنوری ۱۹۲۹ء کی رات کو قریباً دس بجے مدراس میل میں سوار ہوئے۔ اس کے بعد دو راتیں اور ایک دن گاڑی میں گزارے اور ۵ جنوری ۱۹۲۹ء کی صبح کو مدراس پہنچے۔ ویسے تو مدراس کے تمام ریلوے سٹیشنوں پر لوگ علامہ کے استقبال کے لیے موجود تھے مگر مدراس کے بڑے سٹیشن پر استقبال کرنے والوں کا ایک بہت بڑا ہجوم جمع تھا جس میں شہر کے رؤسا، علما، کالجوں کے پروفیسر اور طلبہ شامل تھے۔ یہ کیفیت تھی کہ علامہ کا گاڑی سے اترنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہاں کے مسلمان علامہ صاحب کو دیکھنے کے بے حد مشتاق تھے۔ سیٹھ عبدالحمید حسن سیکرٹری مسلم ایسوسی ایشن اور سیٹھ جمال محمد صاحب نے نہایت پُرخلوص انداز میں علامہ کا خیر مقدم کیا اور انھیں پھولوں کے بڑے بڑے ہار پہنائے۔ پھر لوگوں کے ہجوم سے مخاطب ہو کر سیٹھ حمید حسن نے بلند آواز سے کہا کہ سب حاضرین کو علامہ سے ملنے کا موقع ملے گا۔ اس استقبالیہ تقریب کے بعد ڈاکٹر صاحب

اپنے میزبان سیٹھ جمال محمد صاحب کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر بوسٹو ہوٹل تشریف لے گئے جس کے مالک خود سیٹھ جمال محمد ہی تھے۔ راقم الحروف اور چودھری محمد حسین مرحوم ایک الگ موٹر میں سامان کے ساتھ بوسٹو ہوٹل پہنچے جہاں پہلے ہی کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ یہ ہوٹل مدراس کا سب سے بڑا ہوٹل تھا اور شہر کے مرکز میں واقع تھا۔ ہم حیران تھے کہ مدراس میں جنوری میں بھی ہمیں گرمی محسوس ہو رہی تھی۔

سیٹھ جمال محمد صاحب، جن کی دعوت پر ہم یہاں پہنچے تھے، گوناگوں صفات کے مالک تھے۔ اپنے لباس سے وہ جھنگ اور چنیوٹ کے علاقے کے باشندہ معلوم ہوتے تھے کیونکہ انہوں نے پگڑی، لمبا کُرتا اور تہبند زیبِ تن کر رکھا تھا۔ ان کی ڈاڑھی بھی تھی۔ ان کی فیاضی سے مدراس میں مدرسۂ جمالیہ کے نام سے ایک سکول بھی قائم تھا جس میں بہت سے طلبہ تعلیم پاتے تھے۔ اس میں ندوۃ العلما لکھنؤ کی طرز پر تعلیم دی جاتی تھی۔ ہم نے ایک شام وہاں آپ کی دعوت پر روسائے شہر اور علما کے ساتھ چائے بھی پی تھی۔ سیٹھ صاحب بہت پڑھے لکھے اور انگریزی زبان خوب جانتے تھے اور مسلمانوں کی موجودہ مذہبی اور تعلیمی ضروریات سے بخوبی واقف تھے۔ آپ کے تجارتی تعلقات جاپان، آسٹریلیا، امریکہ اور یورپ کے تمام بڑے بڑے اداروں سے تھے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، مدراس کا بوسٹو ہوٹل بمبئی اور کلکتہ کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں شمار ہوتا تھا اور وہ آپ ہی کی ملکیت تھا۔ حضرت علامہ ایک شام سیٹھ صاحب کی دعوت پر مدرسۂ جمالیہ میں بھی تشریف لے گئے اور آپ نے وہاں "یتیم اور اسلام" کے موضوع پر ایک تقریر فرمائی۔ یہ تقریر موعودہ خطبات کے علاوہ تھی۔

خطبات کے انتظام کے فرائض سیٹھ حمید حسن کے سپرد تھے جو سیٹھ جمال محمد کے سیکرٹری تھے ۔ وہ مدراس ہائی کورٹ میں صدر مترجم کی حیثیت سے بھی کام کرتے تھے اور سیٹھ جمال محمد کی تمام علمی اور تعلیمی سرگرمیوں میں بھی ان کا ہاتھ بٹاتے تھے ۔ وہ مشہور سیاسی لیڈر سیٹھ یعقوب حسن کے بھائی تھے ۔

ابھی لیکچر شروع نہیں ہوئے تھے کہ ایک روز سیٹھ حمید حسن نے پہلے لیکچر کا خلاصہ طلب کیا جسے وہ وہاں کے اخبارات میں اشاعت کے لیے بھیجنا چاہتے تھے ، مگر ہمارے پاس یہ خلاصہ تیار نہیں تھا اور نہ ہمیں وہاں کے اس دستور کا علم تھا ۔ چنانچہ میں نے اصل ٹائپ شدہ لیکچر بعنوان ''دینیاتِ اسلامیہ اور افکارِ حاضرہ'' علامہ کی اجازت سے ان کے حوالے کردیا ۔ چنانچہ انھوں نے دوسری صبح اپنے طور پر اس لیکچر کا ایک خلاصہ تیار کر لیا اور پھر اصل مسودہ ہمیں لوٹا دیا ، کیونکہ اسی روز شام کو علامہ نے وہ لیکچر پڑھنا تھا ۔ اس کے بعد انھوں نے وہ خلاصہ وہاں کے تمام روزناموں کو ، جو آن دنوں مدراس میں شائع ہوتے تھے ، بذریعہ بک پوسٹ ارسال کردیا ۔ ان میں ''مدراس میل'' ، ''ہندو'' اور ''تامل نیڈو'' کے اخبارات قابلِ ذکر ہیں ۔

مدراس میں اُس وقت سب سے بڑا ہال گوکھلے ہال تھا اور اسی میں علامہ کے لیکچروں کا انتظام کیا گیا تھا ۔ شام کے وقت ہم لوگ علامہ کے ہمراہ جب وہاں پہنچے تو پورا ہال حاضرین سے بھرا ہوا تھا ۔ اس لیکچر کی صدارت حکومتِ مدراس کے وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر سوبرا مائین نے کی تھی اور جلسے کا آغاز تلاوتِ قرآن کریم سے ہوا تھا ۔ اگرچہ حاضرینِ جلسہ میں بیشتر مسلمان ہی تھے تاہم غیر مسلم بھی کم نہ تھے ۔ علامہ کے لیکچر سے پیشتر سیٹھ حمید حسن

نے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں انھوں نے ان لیکچروں کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی ۔ اسی سلسلے میں انھوں نے علامہ کا تعارف بھی کرایا اور کہا کہ ”اقبال کا نام بطورِ شاعرِ مشرق تو آپ کو معلوم ہوگا۔ ان کی شاعری نے ہندوستان اور بالخصوص اسلامی دنیا میں زندگی کی جو لہر دوڑا دی ہے اس سے آپ لوگ بھی ملک کے اس دور دراز گوشے میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ۔ مگر آج وہ شاعر کی حیثیت سے آپ کے شہر میں نہیں آئے بلکہ اسلامی ثقافت ، اسلامی فلسفے اور اسلامی تہذیب و تمدن کے پیغام بر کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں ۔

اس کے بعد صاحبِ صدر ڈاکٹر سوبرا مانین نے علامہ صاحب کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اتنا طویل سفر طے کرکے مدراس آنے کی تکلیف گوارا کی ۔ ساتھ ہی مدراس کی انجمن مسلم ایسوسی ایشن اور سیٹھ جمال محمد کا بھی شکریہ ادا کیا جنھوں نے آپ کو مدراس بلایا تھا ۔ پھر صاحبِ صدر نے پرائیویٹ سیکرٹری آف ہز ایکسیلنسی لارڈ گوشن گورنر مدراس کا خط پڑھ کر سنایا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ گورنر صاحب کو افسوس ہے کہ اپنی سابقہ مصروفیتوں کی وجہ سے وہ اس جلسے میں شریک ہو کر سر محمد اقبال کے لیکچروں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے ۔ وہ سر محمد اقبال کا ذکر کئی دفعہ سن چکے ہیں اور ان کو آپ کے لیکچر سن کر مزید خوشی ہوتی مگر مصروفیتوں کی وجہ سے معذرت خواہ ہیں ۔

متذکرہ بالا تمہیدی تقاریر کے بعد علامہ نے اپنا لیکچر شروع کیا اور ایک گھنٹے سے بھی زیادہ آپ اپنا یہ مقالہ پڑھتے رہے ۔ جب لیکچر ختم ہوا تو بعض غیر مسلم احباب نے کچھ سوالات بھی کیے جن کا مختصر جواب علامہ نے اسی وقت دے دیا ۔ آپ نے یہ بھی فرمایا

کہ یہ لیکچر عنقریب بصورتِ کتاب چھپ جائیں گے ۔ اس وقت ان کے تفصیلی مطالعے کے بعد استفسارات ہو سکتے ہیں ۔ اس کے بعد صدرِ جلسہ ڈاکٹر سوبرا مانین نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا :

''اس سرزمین میں ہندو اور مسلمان دونوں آباد ہیں ۔ اگر وہ خود اختیاری حکومت حاصل کرنا اور اسے قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ان میں اتحاد بہت ضروری ہے ۔ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ ہندوؤں کا یہ فرض ہے کہ وہ مسلم اقلیت کو اس بات کا اطمینان دلائیں کہ وہ بھی اس سرزمین میں بھائیوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں گے ۔ میرے لیے یہ بات باعثِ عزت ہے کہ اگرچہ میں ہندو ہوں لیکن اسلامی فلسفے پر لیکچر کی صدارت کے لیے مجھے منتخب کیا گیا ہے ۔ میں خوش ہوں کہ اس صوبے کے مسلمانوں کا زاویۂ نگاہ صحیح ہے ۔ اسلام نے نہ صرف مشرق کو بلکہ ساری دنیا کو اخوت کا سبق دیا ہے ۔ ہم ہندو ابھی تک ذات پات اور قومی امتیازات کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں ۔ ابھی ہمیں اسلامی تہذیب اور اسلامی کلچر سے اخوت کا سبق سیکھنا ہے ۔ میں یہاں غیر برہمن کی حیثیت سے تقریر نہیں کر رہا اور نہ ہی ذات پات کے خلاف بات کر رہا ہوں ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکجا کرنے اور تمام ہندوستانی اقوام میں اتحاد کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ہمیں اسلامی اخوت کو دلیلِ راہ بنانا چاہیے ۔''

جلسے کے اختتام پر اخباری نمایندوں نے علامہ صاحب کو گھیر لیا ۔ ایسے فلسفیانہ مسائل کو وہ کہاں تک سمجھ سکتے تھے اور کہاں تک لیکچر کو لکھ سکتے تھے ۔ اس سے پیشتر انھوں نے

اسلامی حقائق ومعارف کو فلسفیانہ انداز میں نہیں سنا تھا ۔ چنانچہ لیکچر کا جو خلاصہ سیٹھ حمید حسن صاحب نے تیار کیا تھا اسی کی نقول ان کے حوالے کر دی گئیں جس سے وہ اخبار والے مطمئن ہو گئے ۔

لیکچر کے بعد جب ہم ہوٹل میں آئے تو سیٹھ جمال محمد صاحب نے مجھ سے کہا کہ آج شام جو لیکچر ہوا ہے وہ آپ مجھے دے دیں کیونکہ میں گھر لے جا کر رات کو اس کا مطالعہ کروں گا ۔ چنانچہ میں نے وہ لیکچر ان کے حوالے کر دیا ۔ پھر ان کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ان کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ حاجی جمال محمد صاحب کی تجارت ایک کروڑ روپے سالانہ سے کم نہیں ہے ۔ حیرت ہے کہ ایک کروڑ روپے سالانہ کی تجارت کرنے والا یہ شخص تہبند اور کُرتا پہنتا ہے اور حقیقتِ مادہ و روح جیسے علمی مسائل پر انگریزی اور اردو میں گفتگو کرتا ہے ۔ اس کو یہ فکر دامن گیر ہے کہ مسلمانوں کو جو تعلیم دی جائے اس میں قدیم اور جدید تعلیم کا حقیقی امتزاج ہو اور اسلام اپنی اصل شان میں دنیا پر ظاہر ہو ۔ مسلمانوں میں ایسے ہی افراد کی ضرورت ہے اور جب تک یہ طبقہ پیدا نہ ہوگا ، ہم اپنے نصب العین تک رسائی حاصل نہیں کر سکیں گے ۔

اگلے روز ناشتے کے وقت جب سیٹھ صاحب گھر سے ہوٹل آئے تو وہ لیکچر انھوں نے مجھے واپس کر دیا ۔ جب ڈاکٹر صاحب ناشتے سے فارغ ہوگئے تو انھوں نے اس لیکچر کے حوالے سے آپ سے چند استفسار کیے جن کا جواب علامہ نے اسی وقت دے دیا جس سے ان کی تشفی ہوگئی ۔ اس کے بعد جب وہ چلے گئے تو علامہ نے ہم سے فرمایا کہ اس شخص نے لیکچر کو پڑھ کر بعض ایسے استفسارات کیے ہیں جن کا مجھے وہم و گمان بھی نہیں تھا ۔ علامہ دیر تک ان

کے بلند پایہ فہم اور عقل کی تعریف کرتے رہے کہ کس طرح اتنے گہرے فلسفیانہ مسائل کو انھوں نے سمجھ لیا ہے۔

دوسرے روز اسی گوکھلے ہال میں علامہ کا دوسرا لیکچر ہوا۔ آج بھی لوگ کثیر تعداد میں موجود تھے اور انھوں نے نہایت انہماک سے لیکچر سنا ۔ اس لیکچر کا خلاصہ بھی اخبارات کو بھیج دیا گیا تھا جو اگلے روز شائع ہو گیا تھا ۔ بلکہ تامل نیڈو زبان کے روزناموں میں بھی علامہ کے ان لیکچروں کے خلاصے طبع ہوئے تھے جو نہایت عمدگی سے ترجمہ کیے گئے تھے ۔

تیسرے روز علامہ نے اپنا تیسرا خطبہ بھی اسی ہال میں پڑھا ، تاہم سامعین نسبتاً کم تھے کیونکہ لوگوں کو وہاں کے اخبارات میں لیکچروں کے خلاصے میسر آ جاتے تھے ۔ اخبارات میں علامہ کے بعض نہایت عمدہ فوٹو بھی طبع ہوئے تھے ۔ بمبئی کے اخبار ویکلی ''ٹائمز'' کا فوٹو گرافر خاص طور پر بمبئی سے مدراس آیا تھا ۔ مدراس کے انگریزی روزنامہ ''ہندو'' میں علامہ کے تینوں لیکچروں پر تبصرہ بھی کیا گیا تھا ۔ ۱۲ جنوری ۱۹۲۹ع کو بمبئی کے اخبار ''ٹائمز'' ویکلی میں علامہ کا ایک گروپ فوٹو طبع ہوا جو مدراس کے بوسٹو ہوٹل میں لیا گیا تھا ۔

یہ تو مختصر حال علامہ کے لیکچروں کا تھا جو اوپر درج کیا گیا ۔ علاوہ ازیں علامہ کے مدراس پہنچنے پر متعدد اداروں نے اور خود علامہ کے میزبان سیٹھ جمال محمد کے حلقۂ احباب نے علامہ کی ضیافتوں کے کئی پروگرام بنائے تھے جن میں شرکت کے بعد مشکل سے چند منٹ کی فرصت ملتی تھی ۔ ان معاملات کے انچارج سیٹھ حمید حسن صاحب تھے جنھوں نے نہایت فراخ دلی سے ان تمام دعوتوں کو، جو مختلف افراد اور انجمنوں نے دی تھیں ، قبول کر لیا تھا اور طے

پایا تھا کہ تمام پروگرام کی پابندی سختی سے کی جائے ۔ علامہ کو بھی اخلاق طور پر جانا پڑتا تھا کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ اسے ہماری بداخلاق نہ سمجھیں اور انھیں کوئی شکایت پیدا نہ ہو جائے ۔ چنانچہ تمام دعوتوں کو قبول کرنا پڑا ۔

مدراس ہی میں وہاں کے روزنامہ ''سوراجیہ'' کے نمایندے نے علامہ سے ایک ملاقات کی جس میں ترکی کے حال اور مستقبل کے متعلق بات چیت ہوئی ۔ علامہ کا یہ بیان مدراس کے اس اخبار میں ۷ جنوری ۱۹۲۹ع کو شائع ہوا تھا ۔ علامہ کا یہ بیان بہت دلچسپ ہے جس کا خلاصہ مختصراً درجِ ذیل ہے :

''ہماری درس گاہوں میں مذہبی تعلیم بھی ضروری ہے ۔ ایسے سوراج کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا جو مذہب سے بے نیاز ہو ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ روحانی اور مادی امور کو ایک جگہ جمع کیا جائے ۔ سب سے اوّل ایشیا میں ترکوں کو اس مسئلے سے واسطہ پڑا تھا ۔ اگرچہ وہ روحانیت اور مادیت کے مطلوبہ اجتماع کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوئے مگر انھوں نے اس ضمن میں پوری کوشش کی ۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ باشندگانِ ہند اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے یقیناً اہل ثابت ہوں گے کیونکہ ان کے ہاں مذہبی روایات موجود ہیں ۔ روحانیت اور مادیت کو یک جا کرنے میں ترکوں کی ناکامی کی زبردست وجہ یہ ہے کہ انھوں نے یورپ کی نقالی شروع کر دی تھی اور اسلامی روایات کو ترک کر دیا تھا ، حالانکہ وہ لوگ بھی عام طور پر مذہب کے دل دادہ ہیں ۔ اس لحاظ سے ترکی کے مسلمانوں اور ہندوستان کے مسلمانوں

میں کوئی فرق نہیں ہے - اس زمانے میں وہی لوگ محفوظ
رہیں گے جو زمانۂ حاضرہ میں انسان کے معاملات کو بنانے
اور بگاڑنے والی قوتوں سے باخبر ہوں گے -"

علامہ کی خدمت میں مدراس کی "انجمن ترقی اردو" اور "ہندی پرچار سبھا" کی طرف سے بھی ایڈریس پیش کیے گئے تھے جن کی نقول مدراس اور بنگلور کے اخبارات میں طبع ہو گئی تھیں - ان کے جو جوابات علامہ نے دیے تھے وہ بھی طبع ہوئے تھے - مدراس کے اخبار "جسٹس" میں آپ کے جوابات اور ایڈریسوں کے تراجم دونوں چھپے تھے -

سیٹھ حمید حسن نے مسلم خواتین مدراس کی طرف سے بھی ایک دعوت قبول کی تھی - پروگرام یہ تھا کہ وہ آپ کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کریں گی - اس جلسے کی روح رواں مسز عبد السلام تھیں جو وہاں کے پوسٹ ماسٹر جنرل کی اہلیہ تھیں - یہ صاحب جالندھر کے باشندہ تھے اور سارا انتظام انھی کی طرف سے ان کے مکان پر ہوا تھا - چنانچہ علامہ کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا گیا جس میں آپ کی علمی و ادبی اور دینی و سماجی خدمات کو سراہا گیا تھا - ہم دونوں رفیق سفر آپ کے ہمراہ تھے - تمام مستورات پردے میں تھیں اور ہم مع علامہ کے پردے کے باہر بیٹھے تھے - آپ نے ایڈریس کے جواب میں جو تقریر فرمائی تھی اسے ہم نے احتیاط سے لکھ لیا تھا اور پھر وہ روزنامہ "انقلاب" کو برائے اشاعت ارسال کر دی گئی تھی - یہی تقریر ۱۹ جنوری ۱۹۲۹ء کے اخبار "انقلاب" سے لے کر "گفتار اقبال" کے صفحہ ۷۵ تا ۸۸ پر بھی طبع ہو چکی ہے - اس سپاس نامے کا متن بھی، جو مستورات نے پیش کیا تھا،

''انوارِ اقبال'' مرتبہ' بشیر احمد ڈار میں طبع ہو چکا ہے (صفحات ۲۳۳ - ۲۳۶)۔

مدراس میں مستورات کی طرف سے ایڈریس پیش ہونا اس زمانے کے اعتبار سے واقعی ایک کارنامہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایڈریس کے بعد مجمعِ مستورات میں سے کسی عورت نے علامہ سے پردے کے متعلق بھی سوال کیا تھا۔ آپ نے جواب دیا تھا کہ ''غضِ البصر'' یعنی چشم پوشی سے کام لینا چاہیے اور یہ امر مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے۔ پھر عورتوں نے تقاضا کیا کہ آپ اپنی کوئی نظم سنائیے۔ آپ نے جواب دیا کہ مجھے تو اپنا کلام اچھی طرح یاد بھی نہیں ہے اور نہ ہی میرے ہمراہ کوئی کتاب ہے۔ مگر جب اندر سے ''بانگِ درا'' کے کئی نسخے باہر پہنچائے گئے تو علامہ بھی سنانے پر مجبور ہوگئے۔ چنانچہ آپ نے ''بانگِ درا'' میں سے نظم ''فاطمہ بنتِ عبداللہ'' تحت اللفظ پڑھ کر سنائی۔ غرضکہ یہ مجلس بہت کامیاب رہی اور آج تک یاد ہے۔

اسی شام ساحلِ مدراس دیکھنے کا پروگرام تھا۔ یہ واقعی ایک دل فریب نظارہ تھا کیونکہ مدراس کا ساحلِ سمندر دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ہم نے یہاں علامہ کے ساتھ ماہی گیروں کو مچھلی پکڑتے بھی دیکھا۔ اس کے بعد ہم سمندر کے ساحل پر ہی سمندری مچھلیوں کا ایک عجائب گھر دیکھنے گئے جس میں طرح طرح کی اور عجیب و غریب شکل و صورت کی مچھلیاں شیشے کے بکسوں میں رکھی گئی تھیں۔ علامہ نے فرمایا کہ یہ سب مخلوق اپنے خالقِ حقیقی کے وجود کی تصدیق کرتی ہے۔ ان میں سے ایک بکس میں بحری سانپ بھی تھے۔ ماہرین نے ان کے باہر لکھ کر لگایا ہوا تھا کہ یہ عام سانپوں سے کئی ہزار گنا زیادہ زہریلے ہیں۔

قیامِ مدراس کے دوران میں ہم علامہ کے ہمراہ مدراس کے علاقے ''اڈیار'' میں بھی گئے جہاں فرقۂ ''تھیسوفسٹ'' کے لوگ رہتے تھے - ان کی صدر رانی بیسنٹ تھی - یہ علاقہ خاصا وسیع ہے اور یہاں کا قدیم عظیم الشان بڑ کا درخت دیکھنے کے قابل ہے جو ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے - وہاں کسی نے یہ بھی بیان کیا کہ کلکتے کے علاقۂ ہورا میں بڑ کا جو درخت ہے وہ اس سے بھی بڑا ہے- واقعی وہ اڈیار کے بڑ سے بھی بڑا ہے اور میں نے ۱۹۳۵ع میں اسے خود دیکھا ہے -

ہم مدراس میں ۴ جنوری ۱۹۲۹ع کی صبح کو آئے تھے اور ۸ جنوری ۱۹۲۹ع تک ٹھہرے - ان پانچ دنوں میں سے ہر روز رات کا کھانا باہر ہوتا تھا - ۷ جنوری کی رات کو مدراس کی مسلم ایسوسی ایشن کی طرف سے الوداعی دعوت تھی جس میں مدراس کے اکثر مسلمان رؤسا شامل ہوئے تھے - اس دعوت میں علامہ کے سفرِ مدراس پر لوگوں نے تبصرہ کیا اور بعض حضرات نے بہت مفید باتیں بطور الوداعی پیغام کے کہیں - چنانچہ یہ بھی کہا گیا کہ علامہ کے مدراس میں تشریف لانے سے مسلمانوں میں اسلامی تعلیم کے لیے ایک تازہ ولولہ پیدا ہوگیا ہے - خاص طور پر سیٹھ عبدالحمید حسن اور خود سیٹھ جمال محمد کی مختصر تقاریر بہت ہی پُرمعنی تھیں - جیسا کہ اکثر ہوتا تھا ، اس دعوت میں بھی اپنی ظرافت آمیز گفتگو سے علامہ نے محفل کو زعفران زار بنا دیا - مسلمانانِ مدراس کے مخصوص کھانے بھی اس دعوت میں موجود تھے -

الوداعی تقریب سے پیشتر چائے کی دو دعوتیں بھی قابلِ ذکر ہیں : ایک تو مدرسۂ جمالیہ کی طرف سے ہوئی اور دوسری گورنمنٹ کالج مدراس کے طلبہ کی طرف سے ان کے ہوسٹل میں - ان کے انتظام

میں افضل العلما ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب نے بطور خاص حصہ لیا تھا - کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر کلارک نے بھی اس میں شرکت کی تھی -

قیامِ مدراس کے زمانے میں جہاں بھی ڈاکٹر صاحب کو مدعو کیا گیا ، میزبانوں نے کماحقہ ان کی توقیر اور عزت افزائی کی کیونکہ آپ وہاں مفکرِ اسلام کی حیثیت سے تشریف لے گئے تھے - آپ نے ہر مجلس میں اور ہر محفل کے اختتام پر بلند پایہ تقاریر کی تھیں ، خاص طور پر آخری دعوت میں جو تقریر آپ نے کی وہ نہایت ایمان افروز تھی - اس میں مسلمانوں کے علوم و فنون کے انحطاط اور مسلمانوں کی بے عملی کو نہایت درد انگیز پیرایے میں بیان کیا گیا تھا - آخر میں آپ نے مختصر مگر شاندار الفاظ میں سیٹھ جمال کے ایثار کا ذکر کیا اور فرمایا کہ اس شخص کی ذات یہاں کے مسلمانوں کے لیے مغتنماتِ روزگار میں سے ہے - غرض کہ قیامِ مدراس کا یہ مختصر زمانہ ہمیشہ یاد رہے گا -

۸ جنوری ۱۹۲۹ء کی شام کو ہم لوگ بنگلور جانے کی تیاری میں مصروف تھے کہ شام سے قبل سیٹھ جمال محمد صاحب بوسٹو ہوٹل میں تشریف لائے - آپ نے علامہ کو ایک شاندار اونی دھسا نذر کیا اور ساتھ ہی اخراجات کے لیے ایک چیک بھی پیش کیا - مجھے اور چودھری محمد حسین صاحب کو بھی پشمینے کی اعلیٰ قسم کی چادریں عنایت فرمائیں - آپ کے اس عمل نے پرانے زمانے کی روایاتِ اسلامی کو زندہ کر دیا تھا - سیٹھ صاحب اس وقت اپنی صاحب زادی کو بھی علامہ صاحب سے تعارف کے لیے ساتھ لائے تھے - آخر میں انھوں نے لیکچروں کے لیے مدراس آنے پر حضرتِ علامہ کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا -

۸ جنوری ۱۹۲۹ء کی شب کو ہم بوسٹو ہوٹل سے مدراس چھاؤنی ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو یہاں الوداع کہنے والوں کا ایک بہت بڑا ہجوم موجود تھا ۔ ان لوگوں نے نہایت خلوص اور محبت سے ہمیں گاڑی میں سوار کرایا ۔

اگلے روز صبح کے وقت ہم بنگلور کنٹونمنٹ ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو یہاں بھی علامہ کے استقبال کے لیے ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے جنھوں نے پھولوں کے بڑے بڑے ہار اٹھا رکھے تھے ۔ یہ ہار وہاں خاص طور پر تیار کیے جاتے ہیں اور خاصے قیمتی ہوتے ہیں ۔ ہر ہار کے ساتھ ایک گلدستہ بھی ہوتا ہے ۔ گاڑی رکی تو سب سے پہلے فخرالتجار حاجی سیٹھ سر اسمعیل اور حاجی سیٹھ عبدالغفور آگے بڑھے اور انھوں نے علامہ صاحب کو ہار پہنائے ۔ جب علامہ مدراس ریلوے سٹیشن پر پہنچے تھے تو وہاں بھی حاجی سر اسمعیل موجود تھے کیونکہ سیٹھ جمال محمد نے اس علاقے کے تمام سربرآوردہ مسلمانوں کو خاص طور پر علامہ کے استقبال کے لیے مدراس بلایا تھا ۔ سر اسماعیل نے مدراس ہی میں علامہ کو بنگلور آنے کی دعوت دی تھی ۔ اس مجمع میں بنگلور کے اردو اخبار ''الکلام'' کے عملے کے لوگ بھی موجود تھے ۔ ڈاکٹر صاحب سیٹھ سر اسمعیل اور سیٹھ عبدالغفور کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر ان کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوئے تو موٹر خاص طور پر آہستہ آہستہ چل رہی تھی تا کہ دیگر حضرات بھی ساتھ ساتھ پیدل چل سکیں اور آپ کو دیکھ سکیں ۔ بنگلور ریلوے سٹیشن کو اس موقع پر بطور خاص سجایا گیا تھا ۔ غرض کہ اسی طرح مجمع کے ہمراہ ہم لوگ حاجی سر اسمعیل کی کوٹھی پر پہنچ گئے جہاں ہماری رہائش کا انتظام تھا ۔

حاجی اسماعیل علاقۂ بنگلور کے بہت بڑے رئیس تھے ۔ بنگلور کا

زنانہ ہسپتال ، جسے مقامی لوگ گوشہ ہسپتال کے نام سے پکارتے ہیں ، انھی کا قائم کیا ہوا تھا اور بہت مشہور تھا ۔ ان کی عمر اُس وقت اسّی سال کے قریب تھی اور کانوں سے ذرا بہرے تھے ۔ ان کو گُھڑ دوڑ کا بہت شوق تھا ۔ چنانچہ ان کی کوٹھی میں ایک ایسا کمرہ ہم نے دیکھا جس میں بے شمار انعامات رکھے تھے جو ان کے گھوڑوں نے جیتے تھے ۔ ان کا ایک لڑکا اُسی زمانے میں بیمار ہو کر لندن سے آیا تھا اور وہ بھی وہاں موجود تھا ۔ صبح کے ناشتے سے فارغ ہو کر دس بجے کے قریب حضرتِ علامہ بنگلور کی ''مسلم لائبریری'' تشریف لے گئے جہاں ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا ۔ اس جلسے کے روحِ رواں مرزا اسماعیل چیف کمشنر میسور تھے اور انھی کی صدارت میں یہ جلسہ ہوا تھا ۔ اسی روز شام کو انٹرمیڈیٹ کالج بنگلور کی طرف سے علامہ کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کا انتظام محکمۂ تعلیم میسور کی طرف سے کیا گیا تھا ۔ اس جلسے میں بنگلور کے بیشتر تعلیم یافتہ لوگ موجود تھے ۔ مذکورہ دونوں تقاریب کے اختتام پر حضرتِ علامہ نے نہایت برجستہ تقاریر بھی کی تھیں جو بہت پسند کی گئی تھیں ۔ اسی رات بنگلور کے ایک مسلمان رئیسججان محمد علی کے ہاں کھانے کی دعوت تھی جس میں ہزارہا لوگ مدعو تھے ۔ کھانا وہاں کے دستور کے مطابق فرش پر بیٹھ کر کھایا گیا جو نہایت پُرتکلف تھا ۔ ججان محمد علی صاحب وہاں کے سرکردہ مسلمان اور ایک ظریف الطبع انسان تھے ۔

علامہ اقبال نے سر اسماعیل کے صاحب زادے سیٹھ محمد سے بھی ان کے کمرے میں ملاقات کی تھی کیونکہ وہ بیمار تھے ۔ ان کی یورپین بیوی ان کے ہمراہ تھی ۔ یہ نوجوان نہایت پاکیزہ خیالات کا انسان تھا ۔

اسی روز ہمیں مطلع کیا گیا کہ کل دوپہر کے وقت مہاراجہ میسور کی خاص موٹر ہمیں لینے کے لیے آئے گی ۔ چنانچہ ۱۰ جنوری کو ۱۱ بجے کے قریب ایک بڑی موٹر آ گئی ۔ مہاراجہ میسور کی طرف سے سٹیٹ کا ایک آفیسر بھی ہماری رہنمائی کے لیے ساتھ آیا تھا ۔ چنانچہ حاجی سر اسماعیل کے بنگلے پر بنگلور کے بے شمار لوگوں نے ہمیں الوداع کہا اور ہم حسبِ پروگرام میسور روانہ ہو گئے ۔

میسور کا راستہ بہت پُر فضا تھا ۔ دریائے کاویری کے پل سے گزر کر جب ہم سڑک کا ایک موڑ مڑنے لگے تو چند اشخاص نے ہماری موٹر کو روک لیا ۔ ان کے ہمراہ ایک بوڑھا سا شخص بھی تھا جس کی بینائی بہت کمزور تھی ۔ ان کے پاس ایک میلی سی چائے دانی اور چند معمولی سے پیالے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے نہایت عقیدت سے حضرتِ علامہ سے ملاقات کی اور آپ کی خدمت میں چائے پیش کی ۔ بوڑھے شخص نے علامہ سے کہا کہ ''میں نے انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے جلسے میں آپ کی نظم ''نالۂ یتیم'' سنی تھی ۔ آج اتنے برسوں کے بعد بھی وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے ۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج میں آپ سے ملاقات کر رہا ہوں ۔ ہم لوگ ایک دور افتادہ گاؤں میں رہتے ہیں اور آپ سے ملاقات کے لیے صبح سے یہاں آئے ہوئے ہیں ۔''

جب ہم لوگ قلعۂ سرنگاپٹم کے قریب سے گزرے تو سلطان ٹیپو اور سلطان حیدر علی کا مقبرہ دور سے نظر آیا ۔ باغ کے باہر مقبرے کے دروازے پر ہر وقت نوبت بجتی رہتی ہے ۔ یہیں سلطان حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے مرشد کا مزار بھی ہے جو نہایت پُر عظمت مقام ہے ۔ ہمارا پروگرام چونکہ تفصیل سے ان مزارت کو دیکھنے کا تھا اس لیے

یہاں رکے بغیر چار بجے میسور پہنچ گئے ۔ چونکہ میسور کے مہاراجہ سے ملنے کا یہی وقت طے تھا اس لیے موٹر سیدھی ہمیں گورنمنٹ ہاؤس لے گئی ۔ یہ عجیب پُر فضا مقام تھا اور صفائی اور بجلی کا انتظام قابلِ دید تھا ۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہندوستان بھر میں ایسے پُرفضا اور صاف ستھرے مقام بہت کم ہوں گے ۔ نہ صرف قدرت ہی اس مقام پر مہربان تھی بلکہ انسانی حسنِ انتظام بھی قابلِ داد تھا ۔ علامہ کی ملاقات مہاراجہ میسور سے ہوئی تو نہ کوئی زیادہ تکلف برتا گیا اور نہ زیادہ دیر لگی ۔ وہ فوراً ہی گیسٹ ہاؤس سے تیار ہو کر گئے اور تھوڑی سی دیر کے بعد واپس آگئے ۔

اسی شام میسور یونیورسٹی نے علامہ کے ایک لیکچر کا انتظام کیا ہوا تھا ۔ چنانچہ چھ بجے کے قریب میسور یونیورسٹی کے ہال میں وائس چانسلر مسٹر چاندی کے زیرِ صدارت یہ جلسہ ہوا جس میں یونیورسٹی کے عام پروفیسروں کے علاوہ حکومتِ میسور کے اکثر برہمن شرفا و فضلا بھی شریک ہوئے ۔ تمام ہال حاضرین سے بھرا ہوا تھا ۔ علامہ کا تعارف مسٹر چاندی نے کرایا جو پنجاب یونیورسٹی کے مسٹر سٹھانی کے خسر تھے اور پہلے سے علامہ کو جانتے تھے ۔ غرض کہ علامہ نے مدراس کا خطبۂ اوّل یہاں بھی پڑھا اور یہ جلسہ نہایت عمدگی سے اختتام پذیر ہوا ۔

اگلے روز صبح ۹ بجے کے قریب ریاست میسور کی طرف سے سلطان ٹیپو کا قلعہ سرنگاپٹم اور سلطان کا مزار دیکھنے کا پروگرام تھا ۔ پھر اسی روز شام کو مسلمانانِ میسور نے ایک ایڈریس بھی پیش کرنا تھا ۔ چنانچہ ۱۱ جنوری ۱۹۲۹ء کو بروز جمعہ قریباً ۹ بجے ہم لوگ موٹر میں سوار ہو گئے ۔ ہمارے ساتھ ایک اور موٹر بھی تھی جس میں دوسرے لوگوں کے علاوہ ریاستِ میسور کے ایک بہت بڑے

ماہرِ موسیقی ''علی جان'' بھی سوار تھے جو مہاراجہ میسور کی طرف سے خاص طور پر علامہ کی مصاحبت کے لیے بھیجے گئے تھے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، ٹیپو سلطان کے مقبرے کے باغ کے دروازے پر ریاست کی طرف سے ہر وقت نوبت بجتی رہتی ہے۔ یہ روضہ سیاہ سنگِ مرمر سے تعمیر شدہ ہے جسے عرفِ عام میں سنگِ موسلٰی کہتے ہیں۔

یہاں یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کا مدراس کے لیکچروں کی دعوت قبول کرنے کا سب سے بڑا مقصد دراصل سلطان ٹیپو کے مقبرے کی زیارت کرنا تھا۔

علامہ نے مقبرے کے اندر داخل ہو کر اولاً قرآن مجید کی وہ آیت پڑھی جو شہدا کے ضمن میں آئی ہے؟ یعنی ''وہ جو اللہ کے راستے میں کام آگئے ہیں اُن کو مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں مگر لوگوں کو شعور نہیں ہے۔'' اس مزار میں انسان پر ایک عجیب دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ گنبد کے نیچے تین قبریں ہیں۔ درمیان میں سلطان حیدر علی کی قبر ہے، دائیں طرف ٹیپو سلطان شہید کی اور بائیں جانب ان کی والدہ کی۔ ٹیپو سلطان کی قبر پر سرخ رنگ کا کپڑا پڑا رہتا ہے جو دراصل شہادت کی علامت ہے۔ علامہ نے جس عقیدت، خلوص اور رقّت سے قبر پر فاتحہ خوانی کی اس کی کیفیت الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتی۔ مقبرے کے اندر چاروں طرف دیواروں پر اور قبروں کے تعویذوں پر بہت سے فارسی اشعار صاحبانِ مقبرہ کی شان میں اور شہدا کے ضمن میں لکھے ہوئے ہیں۔ روضے میں والدۂ سلطان ٹیپو کی قبر سنہری ہے۔ سلطان نے خود اپنے والدین کو یہاں دفن کیا تھا اور یہ مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ (سلطان شہید کے مزار پر حاضری کی مزید تفصیلات اگلے مضمون ''شمشیر گم شد'' میں ملاحظہ فرمائیے)۔

مقبرے کے قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد ہے ۔ فاتحہ خوانی کے بعد ہم لوگ مسجد کے صحن میں جا کر بیٹھ گئے اور علی جان صاحب نے ایسے سوز کے ساتھ نظمیں سنائیں کہ علامہ کے آنسو جاری ہو گئے ۔

یہاں یہ بیان کرنا بھی خالی از دلچسپی نہیں ہوگا کہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی مرحوم نے لندن میں اپنے قیام کے دوران میں ایک عجائب گھر میں ایک تلوار دیکھی تھی جس پر خون جما ہوا تھا ۔ انھوں نے اسے سلطان ٹیپو کی تلوار سمجھ کر ایک طویل نظم بعنوان ''تلوار سلطان شہید ٹیپو'' لکھی تھی جو رسالہ ''مخزن'' لاہور میں (۱۹۰۴ع ؟) طبع ہوئی تھی ۔ بعد میں وہ نظم حکومتِ برطانیہ نے ضبط کرلی تھی ۔

اس کے بعد ایک بجے کے قریب ہم لوگ دولت باغ میں آ گئے جہاں ریاست میسور کی طرف سے کھانے کا انتظام تھا ۔ دولت باغ میں ابھی تک بہت سے درخت سلطان ٹیپو کے زمانے کے موجود ہیں ۔ لوگ ان کی طرف اشارہ کر کے عہدِ سلطان کے واقعات سناتے تھے ۔ کہتے ہیں کہ سلطان کو اس عمارت اور اس باغ سے خاص لگاؤ تھا ۔ اس باغ کے ایک طرف دریائے کاویری بہتا ہے اور بہت پُرفضا منظر ہے ۔

کھانے کے بعد باغ سے نکل کر ہم لوگ قلعۂ سرنگاپٹم میں آگئے ۔ یہاں وہ مندر ابھی تک موجود تھا جسے سلطان حیدر علی نے مرمت کر کے غیر مسلموں کے حوالے کردیا تھا ۔ قلعے میں ''مسجدِ اعلیٰ'' نام کی ایک مسجد سلطان کے زمانے کی ابھی تک موجود ہے ۔ اس مسجد کے امام نے ، جو ایک بوڑھا سا آدمی تھا اور اس کا دادا بھی ٹیپو سلطان کے زمانے میں اس مسجد کا امام تھا ، اپنے والد کی روایت سے بیان

کیا کہ سلطان شہید عام طور پر مسجد کی عقبی دیوار کی کھڑکی سے مسجد میں نماز کے لیے آتے تھے ۔ قلعۂ سرنگاپٹم کے اندر وہ مقام بھی ہمیں دکھایا گیا جہاں غدار ''میر جعفر'' اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا تھا ۔

پھر ہم دریائے کاویری پر وہ بند دیکھنے گئے جو سلطان ٹیپو نے ریاست میسور کی زرعی ضروریات کے لیے پانی ذخیرہ کرنے کی غرض سے تعمیر کرایا تھا ۔ مہاراجۂ میسور نے وہاں سلطان کے زمانے کا فارسی زبان کا وہ کتبہ بھی نصب کر دیا ہے جو وہاں سے کھدائی کے دوران میں برآمد ہوا تھا ۔ بند (ڈیم) کے ساتھ ایک باغ بھی بطور سیرگاہ کے بنا دیا گیا ہے جس میں برقی فوارے عجیب منظر پیش کرتے ہیں ۔

ہم لوگ مقررہ وقت سے پہلے ہی مہمان خانے میں واپس آ گئے کیونکہ اُسی روز مسلمانانِ میسور کی طرف سے ٹاؤن ہال میں علامہ کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا جانا تھا ۔ چنانچہ یہ جلسہ نواب غلام احمد کلامی صاحب کی صدارت میں تلاوتِ قرآن مجید سے شروع ہوا ۔ اس کے بعد غلام محمد عرف علی جان نے اپنے تمام سازندوں کے ساتھ علامہ کی دو تین نظمیں نہایت رقّت آمیز سُروں میں سنائیں ۔ میں نے اس سے پیشتر علامہ کے اعزاز میں ایسا شاندار جلسہ کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ وہ سماں آج تک آنکھوں کے سامنے ہے ۔ آخر میں سیٹھ محمد ابا (عباس) نے سپاس نامہ پیش کیا اور علامہ نے اس کا جواب دیا ۔ اس جلسے کی پوری کارروائی (سپاس نامے اور علامہ کے جواب سمیت) بنگلور کے اردو روزنامے ''الکلام'' میں بھی طبع ہو گئی تھی ۔ علامہ کی یہ تقریر بہت اہم تھی ۔ میسور یونیورسٹی کے فلسفے کے ایک ہندو پروفیسر نے علامہ کی تقریر کے بعد انگریزی میں آپ کے لیکچروں کی

داد دیتے ہوئے کہا کہ ”اس موضوع پر آج تک کسی نے اس قدر محققانہ نظر نہ ڈالی ہوگی ۔ ڈاکٹر صاحب کو مسلمان ہزار اپنا کہیں مگر وہ سب کے ہیں ۔ کسی ایک مذہب یا جماعت کی ملکیت نہیں ہیں ۔ اگر مسلمانوں کو یہ ناز ہے کہ اقبال ان کا ہم مذہب ہے تو ہم ہندوستانیوں کے لیے بھی یہ فخر کچھ کم نہیں ہے کہ اقبال ایک ہندوستانی ہے ۔“

متذکرہ جلسے کے منتظم اور روح رواں میسور کے مشہور تاجر سیٹھ محمد ابا (عباس) تھے جنھوں نے یہ جلسہ منعقد کرایا تھا اور خود ہی سپاس نامہ بھی پڑھا تھا ۔

اگلے روز میسور کے بعض پرانے محلات علامہ کو دکھائے گئے ۔ ایک جگہ سلطان ٹیپو کی یاد میں ایک مصنوعی شیر بھی ہم نے دیکھا ۔ میسور کا بجلی گھر بھی علامہ کو دکھایا گیا جس کا منتظم ایک باشندہ گرگ تھا ۔ علامہ نے اس سے گفتگو بھی کی تھی ۔ ایک مقام پر ایک پرانا مزار بھی ہم نے بجلی کی ٹرالی پر سفر کر کے دیکھا تھا جہاں آن لوگوں کے مطابق ٹیپو سلطان اکثر آتے تھے ۔ پھر ہم نے میسور کا چڑیا گھر بھی دیکھا جس میں شیر بالکل آزاد پھرتے تھے ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ درمیان میں ایک خندق حائل ہے جو بظاہر نظر نہیں آتی تھی ۔

علامہ نے میسور کے اہلِ علم حضرات میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا تھا ۔ ان کے پرستاروں نے ان کے متعدد فوٹو بھی اتارے تھے ۔ علامہ نے میسور یونیورسٹی میں ”نفسیاتِ علمی“ کا شعبہ بھی اس شعبے کے مہتمم کے ہمراہ دیکھا تھا جس نے چند دلچسپ تجربات بھی دکھائے تھے ۔ ان تقریبات اور تفریحات کے بعد ہمارا میسور کا سفر ختم ہوگیا ۔

۱۲ جنوری ۱۹۲۹ء کو دوپہر کے وقت کھانا کھا کر ہم لوگ موٹر میں بیٹھ کر بنگلور روانہ ہو گئے ۔ راستے میں دو تین مقامات پر گاؤں کے باشندے پھولوں کے ہار لے کر کھڑے تھے جنھیں دیکھ کر علامہ نے بار بار موٹر رکوائی ۔ پھر جب ہم سلطان ٹیپو کے مقبرے کے قریب پہنچے تو علامہ نے ایک مرتبہ پھر موٹر سے اتر کر سلطان کے مزار پر فاتحہ پڑھی ۔ بالآخر ۵ بجے کے قریب ہم بنگلور میں حاجی سر اسماعیل کے مکان پر پہنچ گئے ۔ واپسی پر چائے کی دعوت امین الملک سر اسماعیل کے ہاں تھی اور یہ پروگرام پہلے سے طے پا چکا تھا ۔ چنانچہ ہم سیدھے دعوت میں پہنچے ۔ اس دعوت میں پروفیسر شوستری اور ان کے گھر کے لوگ بھی موجود تھے اور یہاں کا تمام ماحول ایرانی تھا ۔ دعوت سے فارغ ہو کر بنگلور کے بازار سے ہوتے ہوئے ہم لوگ حاجی سر اسماعیل کے مکان پر پہنچے اور وہاں آرام کیا اور پھر واپسی کی تیاری میں مصروف ہو گئے ۔

اگلے روز ۱۳ جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے کی ریل میں سوار ہو کر ہم عازمِ حیدرآباد دکن ہوئے اور دوسرے روز ۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح کے وقت حیدرآباد دکن کی حدود میں پہنچ گئے ۔ حضرتِ علامہ کو عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے لیکچروں کی دعوت آ چکی تھی جسے آپ نے قبول فرما لیا تھا ۔ سکندر آباد کے ریلوے سٹیشن پر ہم گاڑی سے اترے تو دیکھا کہ پلیٹ فارم پر مسلمان بچے قطاروں میں کھڑے علامہ کا کلام ''چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا ترنم'' سے پڑھ رہے ہیں ۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے رجسٹرار انصاری صاحب ، سر اکبر حیدری ، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ، مولانا عبداللہ عمادی ، سید ابراہیم ٹونکی ، ڈاکٹر مظفر الدین قریشی اور

عثمانیہ یونیورسٹی کے متعدد اساتذہ وہاں موجود تھے ۔ چنانچہ سب سے پہلے سر اکبر حیدری نے آگے بڑھ کر علامہ کو پھولوں کے ہار پہنائے ۔ اس کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی مصافحہ کیا اور ہم ریلوے سٹیشن سے باہر آ کر موٹر میں بیٹھ گئے اور سرکاری مہمان خانے ولادا وسٹا (Vi.ada Vista) پہنچ گئے جہاں حضرتِ علامہ کے ٹھہرنے کا انتظام تھا ۔

یہاں آ کر معلوم ہوا کہ یہاں بھی مدراس اور میسور کی طرح پورا پروگرام مرتب ہو چکا ہے ۔ اس پروگرام میں علاوہ خطبات کے صدرالمہام حیدر آباد دکن سر کشن پرشاد شاد سے ملاقات بھی شامل تھی ۔ سب سے پہلے باغِ عامہ کے ہال میں علامہ کا ایک لیکچر ہوا جس کی صدارت مہاراجہ سر کشن پرشاد نے خود کی تھی ۔ علامہ نے یہاں مدراس کے لیکچروں کا اعادہ کیا تھا ۔ دوسرے روز مہاراجہ کشن پرشاد کے ہاں ایک رسمی دعوت تھی جس میں تمام مدعوین نے ریاست کے سرکاری لباس میں شرکت کی تھی ۔ اسی لیے ہم دونوں اس دعوت میں علامہ کے ہمراہ نہیں گئے تھے ۔ اگرچہ علامہ نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ کوئی شعر یا نظم اس دعوت میں نہیں پڑھیں گے مگر وہاں کے ماحول کو دیکھ کر آپ نے بھی محفلِ شعر و سخن میں حصہ لیا اور کچھ اشعار پڑھے ۔

علامہ ابھی تک سر کشن پرشاد کی دعوت میں تھے کہ مہمان خانے میں نو بجے رات کو سر امین جنگ کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ اعلیٰ حضرت نظامِ دکن نے ۱۸ جنوری کو ۱۱ بجے صبح علامہ سے ملاقات کا وقت مقرر فرمایا ہے ۔ جب حضرت علامہ دعوت سے واپس تشریف لائے تو ہم نے انہیں حضور نظام کے فیصلے سے آگاہ

کیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ مشکل سے ۱۹ جنوری کو لاہور روانہ ہو سکیں گے ۔

قیامِ حیدر آباد کے دوران میں ایک دوپہر کو سر اکبر حیدری کے ہاں دعوت تھی جس میں ہم دونوں نیازمندوں نے بھی شرکت کی تھی ۔ اس دعوت میں زیادہ تر محکمہٗ تعلیم کے لوگ یا پروفیسر حضرات مدعو تھے ۔ ہم نے ایک دن گولکنڈہ کی سیر بھی کی تھی مگر علامہ نے اس میں شرکت نہیں فرمائی تھی کیونکہ مہمان خانہ ''ولاڈا وسٹا'' میں ہر وقت ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا ۔ جیسا کہ ذکر ہوا ، علامہ نے میر عثمان علی خان والیٔ دکن سے مقررہ تاریخ کو تفصیلی ملاقات کی تھی جس میں آپ نے بہت سے امور پر گفتگو فرمائی تھی ۔

بالآخر ۱۹ جنوری ۱۹۲۹ع کو علامہ لاہور تشریف لے گئے مگر میں اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے واپس آپ کے ہمراہ نہ جا سکا ۔

جب علامہ کے خطباتِ مدراس کا بہت چرچا ہوا تو کارپردازانِ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ، اور خاص طور پر شعبہٗ فلسفہ کے سربراہ ڈاکٹر سید ظفر حسن نے خواہش کی کہ وہی لیکچر آپ مسلم یونیورسٹی میں بھی پڑھ دیں ۔ اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر راس مسعود تھے ۔ چنانچہ آپ نومبر ۱۹۲۹ع کو علی گڑھ تشریف لے گئے تو راقم بھی آپ کے ہمراہ تھا ۔ ہم لاہور سے بذریعہ فرنٹیر میل پہلے دہلی گئے اور وہاں سے دوسری گاڑی میں سوار ہو کر علی گڑھ پہنچے ۔ جس روز ہم علی گڑھ پہنچے ، ڈاکٹر سر راس مسعود کسی ضروری کام سے بھوپال گئے ہوئے تھے ۔ تاہم ریلوے اسٹیشن پر تمام یونیورسٹی نے آپ کا استقبال کیا اور ہم سید ظفر حسن کے ہاں مقیم ہوئے ۔ دوسرے روز ڈاکٹر سر راس مسعود بھی تشریف لے آئے اور

پروگرام مرتب ہوا ۔ چنانچہ علامہ نے یونیورسٹی کے سٹریچی ہال، میں اپنے خطبات پڑھے ۔ پھر آپ نے کالج کی سوسائٹیوں کے جلسوں میں بھی شرکت فرمائی ۔ یونیورسٹی کی سٹوڈنٹس یونین نے بطور خاص ایک مجلس قائم کی اور علامہ کو اس کا لائف ممبر بنایا گیا ۔ ان دنوں پرو وائس چانسلر ایک انگریز ہکسن بوتھم تھے ۔ انھوں نے بھی اس پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا ۔ اس موقع پر علامہ نے ایک تقریر بھی کی تھی جو ''انقلاب'' کے ۱۰ دسمبر ۱۹۲۹ع کے شمارے میں طبع ہو چکی ہے ۔ ہم لوگ وہاں تین دن رہے تھے ۔ اس دوران میں علامہ نے صاحبزادہ خان آفتاب احمد خان کی عیادت بھی کی تھی جو اس زمانے میں بیمار تھے ۔ ایک تقریب علی گڑھ ہائی سکول میں ہوئی تھی جس کے ہیڈ ماسٹر سید شبیر حسین زیدی تھے ۔ اس موقع پر کئی عمدہ نظمیں بھی پڑھی گئی تھیں ۔ بشیر ہاشمی اور ڈاکٹر غلام محمد بٹ نے اس تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا ۔ یہ صاحب سیالکوٹ کے باشندہ تھے ۔

ان تمام مصروفیات کے دوران میں علامہ ان لیکچروں پر برابر مزید تحقیق کرتے رہے اور بالآخر سیٹھ جمال محمد کی درخواست پر ان کو بصورتِ کتاب چھاپنے کا مصمم ارادہ کر لیا ۔ چنانچہ آپ نے لاہور آ کر ان کی طباعت کا انتظام کیا اور اس طرح یہ کتاب اسی سال (۱۹۲۹ع) کے آخر میں چھ لیکچروں پر مشتمل چھپ گئی اور اس کا نام The Reconstruction of Religious Thought in Islam رکھا گیا ۔ یہ ایڈیشن لاہور میں عطر چند کے ادارے کی طرف سے ۱۹۲۹ع میں طبع ہوا تھا ۔ اس کے بعد یہ خطبات لندن سے بھی شائع ہوئے ۔

۱۹۳۲ع میں جب علامہ تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت

کی غرض سے لندن تشریف لے گئے تھے تو وہاں کی "مجلسِ ارسطو" کی درخواست پر آپ نے ایک لیکچر بعنوان "کیا مذہب ممکن ہے؟" پڑھا تھا ۔ چنانچہ اس لیکچر کو بھی آپ نے بعد میں اس مجموعے میں شامل کر لیا تھا اور آج آپ کے لیکچروں کی یہ کتاب سات خطبات پر مشتمل ہے ۔ اس علمی کارنامے کا آغاز دراصل ۱۹۲۴ع سے ہوا اور ۱۹۳۲ع میں یہ اختتام کو پہنچا ۔

☆ ☆ ☆

٦٢

شمشیر گم شد

(مزار ٹیپو سلطان شہید کی زیارت علامہ اقبال کی معیت میں)

اسلام نے اپنے مجاہدین اور شہدا کا جو انجام پیش کیا ہے وہ قرآن کریم کی اس آیت سے عیاں ہے :

''ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء ولا کن لا یشعرون ۔''

تاریخِ اسلام ایسے خون چکاں واقعات و حوادث سے معمور ہے جو اہلِ عالم کے لیے سبق اور عبرت کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ دنیا کی کوئی قوم اپنی تاریخ میں ایسے مہتم بالشان واقعات کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے ۔ تاریخِ اسلام کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں سرفروشانِ اسلام نے ناموسِ ملّت پر اپنے آپ کو قربان نہ کردیا ہو ۔

''شمشیر گم شد'' کا یہ عنوان اسلام کے اسی قسم کے ایک سرفروش کے لیے بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے جس نے کہا تھا کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار برس کی زندگی سے کہیں بہتر ہے'' اور یہ کہتے ہوئے اسلام کی خاطر قربان ہوگیا تھا ۔ اسلام کے اس مجاہد کا نام ٹیپو سلطان ہے جس نے سرنگاپٹم کے قلعے میں انگریزوں کی جابرانہ قوت سے ٹکر لی اور جہاد فی سبیل اللہ کرتا

ہوا اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا ۔ اور یوں اسلام کی یہ تلوار جو دشمنانِ اسلام کی سرکوبی کے لیے بے نیام ہوئی تھی ، ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں کھو گئی ۔ راقم نے اسلام کے اس مجاہد فرزند کی آخری آرام گاہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے اور خوش بختی یہ ہے کہ اس موقع پر مفکرِ اسلام شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبال کی رفاقت کی سعادت بھی حاصل تھی ۔ کسی مردِ حق نے اس شہیدِ حق و صداقت کی تاریخِ شہادت (۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۹ع) مندرجہ ذیل اشعار سے نکالی ہے جو شہید کے مزار کے باہر ایک کتبے پر کندہ ہیں :

آسماں رو خوں کے آنسو اس جہاں آباد پر[1]

عجائبات میں یاں کے نہ دل کو اُلجھانا
دکن میں آ کے سرنگاپٹم چلے جانا
کہ جس کی خاک میں سوتا ہے شیرِ ہندستاں
زمانہ بھول گیا ہائے جس کے سب احساں

۹ رجب المرجب ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۱ جنوری ۱۹۲۹ع بروز جمعۃ المبارک دوپہر کے وقت ہم سب شریکِ سفر جزیرۂ سرنگاپٹم کے جنوب مشرق قریے گنجام میں لال باغ کی مشرق روش سے اس شہید کے مزار کی طرف روانہ ہوئے ۔ ابھی ہم باغ میں تھے کہ شمالی دروازے سے نوبت کی آواز آئی جس کی روایت شہید کے زمانے سے چلی آ رہی تھی اور غالباً ان کے والد سلطان حیدر علی کے زمانے میں بھی موجود

۱۔ اس مضمون کے تمام اشعار فاضل مصنف نے جس طرح نقل کیے ہیں ، انھیں اسی طرح شامل کیا جا رہا ہے ۔ (ادارہ)

تھی - یہ مقبرہ ٹیپو سلطان شہید نے اپنے والد کی یاد میں تعمیر کرایا تھا جس میں ان کی والدہ بھی دفن ہیں مگر قدرت کو یہ منظور تھا کہ اس کے بانی کی آخری آرام گاہ بھی یہی مقبرہ بنے -

باغ کی روشوں پر ناریل کے درخت دو رویہ صفت باندھے کھڑے تھے جو خود شہید کے اپنے حسنِ مذاق کی یادگار تھے - یاد رہے کہ سلطان کو باغات لگانے کا اس قدر شوق تھا اور وہ اس سلسلے میں اتنا اچھا ذوق رکھتے تھے کہ جس کی نظیر ملنا محال ہے - تمام میسور ، سرنگاپٹم اور بنگلور میں درس گاہیں قائم تھیں - یہاں ماہرین سے جو باغات لگوائے گئے تھے ان میں سے بعض ابھی تک موجود ہیں - ہمارے رفقائے سفر میں سے ایک صاحب محمد ایاز خاں رئیسِ میسور نے بیان کیا تھا کہ ان باغات میں تقریباً ہر قسم کے میوہ دار درخت تھے - خود سلطان شہید کا اپنا ذاتی باغ اسی جزیرۂ سرنگاپٹم میں اب تک موجود ہے -

سلطان شہید کا مقبرہ ، جسے حسرت کدہ کہنا چاہیے ، ایک بلند چبوترے پر واقع ہے اور اندر سیڑھیوں کے ذریعے راستہ ہے :

ادب ہے شرط تجھے اس مقامِ عبرت پر
بہا نہ اشک تو اس تاجور کی تربت پر

ہم قریب پہنچے تو دل کی عجیب کیفیت تھی - ایسا لگتا تھا کہ اسلام کا یہ شیر ابھی تک جہاد میں مصروف ہے اور یہ جگہ اس نے اپنے وقتی آرام کے لیے منتخب کر رکھی ہے - اسی قسم کے جذبات لیے پہلے ہم شمالی دروازے کی طرف بڑھے اور ''السلام علیکم یا اهل القبور'' کہہ کر دروازے کی پیشانی پر ایک نگاہ ڈالی تو وہاں یہ رباعی نظر پڑی :

از آں فاطمہ زوجۂ شیرِ خدا
شد سبطِ نبی سیّدِ شہدا پیدا
ایں فاطمہ زاد از علی حیدر
ٹیپو سلطاں کہ گشت شاہِ شہید

اس رباعی نے طبیعت پر گہرا اثر کیا۔ یہ شہید بھی اسی جگر گوشۂ رسول جناب فاطمۃ الزہرا کا ایک لعل تھا جو اپنے جد امجد شہیدِ کربلا کی طرح ناموسِ اسلام پر فدا ہو گیا تھا۔ جب سے اسلام میں شہادت کی رسم قائم ہوئی ہے، ہمیشہ اولادِ رسولِ مقبولؐ کو ہی یہ رسم نبھانے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ رباعی پڑھ کر ہم سب خاموش تھے، کسی کو اس دروازے سے اندر داخل ہونے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے بعد علامہ جنوبی دروازے کی طرف بڑھے تو ہم نے بھی ان کی پیروی کی۔ یہاں پہنچے تو چوکھٹ پر یہ رباعی کندہ تھی:

در ملکِ حجاز از علیِ حیدر
مفتوح شدہ ہفت قلاعِ خیبر
ایں حیدر دکنی دول کرناٹک
گشتند مطیع یک خدیو کشور

یہ کتبہ سلطان حیدرعلی کے متعلق لکھا گیا تھا جس میں ان کی جرأت اور بہادری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت علامہ نے کچھ دیر گرد و نواح پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور پھر ہم ان کے پیچھے پیچھے اسی دروازے سے مزار میں داخل ہو گئے۔

جیسا کہ ذکر ہوا، اس مقبرے میں تین قبریں ہیں۔ سلطان ٹیپو شہید کی قبر پر سرخ غلاف تھا جو غالباً ان کے حسرت ناک انجام کی نشان دہی کے لیے ڈالا گیا تھا۔ زائر کی طبیعت پر اس کو دیکھ کر

ایک ناقابلِ فراموش الم ناک ردِعمل ہوتا ہے ۔ ہم نے خاموش ، مودب اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے ۔ میں اس کیفیت کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں جو اس شہید کی آخری آرام گاہ کی قربت سے دل میں پیدا ہوگئی تھی ۔ ہم سب انھی کیفیات کے زیرِاثر صحنِ مزار کے برآمدے میں چپ چاپ بیٹھ گئے ۔ میسور کے ایک شاعر اور موسیقار علی جان صاحب ہمارے ہمراہ تھے ۔ انھوں نے نہایت خوبصورت ترنم کے ساتھ کچھ اشعار پڑھنے شروع کیے جو اس موقع کی مناسبت سے بہت موزوں تھے ۔ ہم سب پر ایسا اثر تھا کہ گویا سرنگاپٹم کے اس شیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ۔ حضرتِ علامہ کی آنکھیں پُرنم تھیں بلکہ اس سے بھی تجاوز کر چکی تھیں اور جسم پر لرزے کی کیفیت طاری تھی ۔ ہم سب مبہوت اور بے جان تھے ۔

یہاں سے ہمت کر کے اٹھے کہ پھر روضۂ مبارک کی زیارت کی جائے ۔ اب ہم مغربی دروازے پر پہنچے تو پیشانی پر یہ رباعی جگمگا رہی تھی :

آں شہیدِ عرب ، سبطِ نبی ؐ
لختِ جگرِ فاطمہ رض و جانِ علی رض
از فاطمہ و حیدر دکنی ٹیپو
سلطانِ شہیداں شدہ از شوقِ دلی

اس دروازے کی چوکھٹ کے دائیں اور بائیں جانب پتھر پر کچھ اشعار کندہ تھے ۔ مندرجہ ذیل اشعار ، جو دائیں جانب تھے ، سلطان حیدر علی مرحوم کے متعلق ہیں :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
اللہ محمد ابوبکر عمر عثمان علی

زہے گنبد و . . . شکوہِ بنا
فلک زیر دستش بود در علو
تو خواہی مہ و خواہ خورشید خواں
فلک داغ گردید از رشکِ او
بود شمع اش نور چشم فلک
قمر یافتہ طلوع تعلیم او (کذا)
تراوش کناں طیر رحمت (؟)
ز خاک کروبیاں گرد او (؟)
کہ گہ کسب فیض و شرف (؟)
گذشتم ازیں خواب گاہ نکو
چوں آں مضجع تازہ آمد بچشم
نمودم چو او بیاں جستجو (؟)
کہ آں شاہ آسودہ را چیست نام
چہ تاریخ رحلت نمود است او
یکی از میاں گفت تاریخ و نام
کہ حیدر علی خاں بہادر بگو[1]

بائیں طرف کے یہ اشعار سلطان ٹیپو شہید کے متعلق ہیں :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
رب ارحم السلطان الکریم
ٹیپو سلطان شہید شد ناگاہ
خونِ خود ریخت فی سبیل اللہ

۱۔ سلطان حیدر علی کا انتقال چتوڑ کے قریب ۸ دسمبر ۱۷۸۲ع کو ہوا اور سرنگاپٹم میں ان کو دفن کیا گیا ۔

ماہِ ذی قعد بست و ہشتم آں

شدہ در روز شنبہ حشر عیاں

سیندے اش بینم آہ بگفت (؟)

نور اسلام و دین ز دنیا رفت

تاریخِ کشتہ گشتنِ سلطان حیدری

ٹیپو بوجہِ دینِ محمد شہید شد

اس کے بعد عربی زبان کے دو شعر ہیں اور پھر یہ شعر ہے:

سالِ تاریخ او شہید بگفت

حامیِ دین شہِ زمانہ برفت

اور آخر میں عربی کی یہ عبارت درج ہے:

"من کلام السید الحضری قد صنّفہ الحقیر میر حسن علی و حررہ سید عبدالقادر بالخط الجلی فی السنۃ ۱۲۱۳ الھجریۃ النبویۃ۔"

جب سلطان ٹیپو راہِ خدا میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہوگئے تو مغرب کے وقت آپ کی نعش کو دیگر مقتولین میں سے تلاش کر لیا گیا تھا مگر ابھی تک جسدِ خاکی گرم تھا اور کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ پاس جائے۔ بہرحال اسلام کا یہ شیدائی ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ تاریخِ شہادت ۲۸ ذی قعد روز شنبہ ۱۲۱۳ھ ہے۔

یہ اشعار پڑھنے کے بعد الوداعی فاتحہ کے لیے ایک مرتبہ پھر ہم اندر کی طرف بڑھے۔ سرخ رنگ کے غلاف پر ایک مرتبہ پھر نظر پڑی تو خونچکاں تاریخ کے تمام واقعات آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے۔ وہ شہیدِ حق اپنے تمام محاسن سمیت اس غلاف کے نیچے

محوِ استراحت تھا ۔ اندرونی گنبد کا مشاہدہ کرتے ہوئے ہم شمالی دروازے کی طرف بڑھے تو یہاں بھی ایک کتبہ نظر نواز ہوا ۔

مسجد کے صحن کے شمال اور جنوب کی طرف دیگر شہدا کی قبریں ہیں ۔ یہ سلطان کے وہ جاں نثار تھے جو آخری سانس تک اپنے آقا پر قربان ہوتے رہے ۔ ان پر چھوٹے چھوٹے کتبات بھی ہیں ۔ انھی میں ایک قبر نواب بنکی کی تھی جو سلطان کے اعزّہ میں سے تھے اور ان کا تعلق گورگ سے بھی تھا ۔ ان کی قبر کے پیتل کے کتبے پر اردو میں ان کے حالاتِ زندگی کندہ تھے ۔

اس کے بعد ہم مقبرے کی شمالی روش پر آ گئے اور وہاں سے دولت باغ کی طرف روانہ ہوگئے ۔ پھر لال باغ کے دروازے سے باہر آئے جو اپنے بانی کے زمانے میں ہزاروں رنگینیاں اپنے دامن میں رکھتا تھا ۔ آج بھی اس دور کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے لال باغ کے دروازے پر نوبت بجتی ہے ۔

مقبرے کی عمارت :

فنِ تعمیر کے نقطۂ نگاہ سے اس مقبرے کی عمارت اپنی نظیر آپ ہے ۔ یہ ایک مربع چبوترے پر قاعدہ دار بنائی گئی ہے ۔ چھتری نما برآمدہ ، نہایت خوبصورت چھتیں ، سیاہ مرمر کے آٹھ آٹھ فٹ مثمن ستونوں پر قائم یہ مقبرہ ہندوستان کی عمارتوں میں بالکل منفرد مقام رکھتا ہے اور یہی اس عمارت کی سب سے بڑی خوبی ہے ۔ اس کی بناوٹ اور چمک دمک دور سے دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے ۔ برآمدے کے اندر چار دیواری ہے جس میں متذکرہ چار دروازے ہیں ۔ دروازے سیاہ رنگ کی لکڑی کے ہیں جن میں ہاتھی دانت سے منبت کاری کی گئی ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ

ٹیپو سلطان شہید کی عظمت و وقار کے پیش نظر یہ عطیہ لارڈ ڈلہوزی نے دیا تھا - چار دیواری پر اکہرا گنبد ہے جیسے کہ دکن کی عام تاریخی عمارتوں میں ملتا ہے - اس کے اندر آواز بہت گونجتی ہے کیونکہ مغلئی عمارتوں کی طرح یہ دوہرا نہیں ہے - عمارت بہت بلند نہیں ہے تاہم فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے -

یہ مقبرہ مسجد کے صحن میں واقع ہے - سلطان ٹیپو نے جب یہ مقبرہ اپنے والد کے لیے بنوایا تھا تو غالباً اسی زمانے میں اسے مسجد سے محصور کرا دیا گیا تھا تاکہ خانۂ خدا میں جو ذکر اذکار ہو ، صاحبِ مزار کی روح اس سے ہمیشہ مستفیض ہوتی رہے - مسجد اور مقبرے کے خادم اور متولی ایک ہی خاندان سے نسلاً بعد نسل چلے آ رہے ہیں اور شروع سے انھیں جن احکام اور روایات کا پابند بنایا گیا ہے ، اب تک ان کی تعمیل کر رہے ہیں - سلطان ٹیپو نے اپنے زمانے میں جو مساجد تعمیر کروائیں ، ان میں ایک امتیازی شان اور انفرادیت نظر آتی ہے ؛ سرنگاپٹم کی ایک بہت اونچی مسجد ، جو مسجدِ اعلیٰ کے نام سے یاد کی جاتی ہے ، اس کی تعمیر مصری مساجد سے مشابہ ہے - اس کے مینار منفرد شکل کے ہیں جو غالباً سلطان کی اپنی اختراع تھے - اسی طرح میسور میں اس دور کی جتنی مساجد نظر سے گزریں ان سب میں یہی عنصر موجود ہے - پھر سلطان کی اولاد نے جتنی مساجد کلکتے میں جا کر بنوائیں ان میں بھی یہی بات ہے اور یہ اس دور کا ایک خاص طرزِ تعمیر ہے -

عُرس مبارک :

۲۸ ذی قعد بروز شنبہ ۱۲۱۳ھ کو ٹیپو سلطان نے جامِ شہادت پیا تھا - ان کی یاد کو دلوں میں تازہ رکھنے کے لیے شروع

سے ہی مزار پر سالانہ عرس ہوتا ہے ۔ دور دور سے صوفیاے کرام اور اہل اللہ اس عرس میں شرکت کی غرض سے آتے ہیں ۔ سلطان خود بھی میسور کے ایک بزرگ عاقل شاہ سے عقیدت رکھتے تھے جن کا مزار میسور کے راستے میں ایک قریے میں ہے ، اس لیے عرس میں عاقل شاہی حلقے کے تمام بزرگ شرکت کرتے ہیں ۔ اس روز میسور کے نیک نہاد راجا کی طرف سے ایک ہاتھی پر صندل ، لوبان اور پھول وغیرہ آتے ہیں اور یہ روایت ابتدا سے چلی آ رہی ہے ۔ روضے کو صندل اور لوبان وغیرہ سے غسل دیا جاتا ہے اور کئی روز اس عبرت کدہ میں قیام کیا جاتا ہے :

رہا زمانے میں کچھ روز میہماں کی طرح
بہار اس پہ جو آئی بھی تو خزاں کی طرح
چھپا نگاہوں سے وہ گنجِ شائگاں کی طرح
دلوں سے محو ہوا یادِ رفتگاں کی طرح
کسی بشر نے نہ کی اس پہ اشک افشانی
فرشتے گور پہ کرتے ہیں فاتحہ خوانی

ہمارے اس مضمون کے عنوان "شمشیر گم شد" کے الفاظ سے دراصل سلطان شہید کی تاریخِ وفات نکلتی ہے ۔ اس کے علاوہ بعض اہلِ قلم نے سلطان کی وفات کی حسبِ ذیل تاریخیں بھی کہی ہیں :

ٹیپو بوجہِ دینِ محمد شہید شد

گفت ہاتف ز نیم آہ بہ تفت
نور اسلام و دیں ز دنیا رفت

نسل حیدر شہید اکبر شد

راقم کو اس سفر کے دوران میں بنگلور کے ایک کتب فروش کے ہاں "عروس المجالس" نام کی ایک منظوم کتاب ملی تھی جو اردو زبان میں ہے۔ مصنّف کا نام "افصح الفصحا بلغاء العالم جناب مرحوم غلام قاسم صاحب بہ تخلص مہری نور اللہ مرقدہ ۱۲۲۹ھ" لکھا ہے۔ یہ زیادہ ضخیم کتاب نہیں ہے۔ تقریباً تین سو صفحات میں آنحضرتؐ کی حیاتِ طیّبہ کو نظم میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب شاعر نے دراصل ۱۲۰۹ھ میں لکھی تھی اور سلطان شہید کی خدمت میں پیش کی تھی۔ پھر محمد صالح نامی ایک صاحب نے ۱۲۶۹ھ میں خطِ نسخ میں لکھوا کر مطبعِ صالح میں طبع کرائی تھی۔ اس میں بادشاہ ظفر شاہ کا زمانہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ٹیپو سلطان کے بڑے بیٹے فتح حیدر کے محاسن کو خصوصیت سے نظم میں پیش کیا گیا ہے۔ حضرتِ علامہ اقبال نے بھی اس کا مطالعہ فرمایا تھا۔

☆ ☆ ☆

۶۳

مرقعِ چغتائی اور عملِ چغتائی

۱۹۲۶ء میں پروفیسر محمد دین تاثیر نے مصورِ مشرق عبدالرحمٰن[1] چغتائی مرحوم کو مشورہ دیا کہ وہ "دیوانِ غالب" کا ایک مصوّر ایڈیشن اپنی تصاویر سے مزیّن کر کے شائع کریں۔ چنانچہ طے پایا کہ وہ یہ کام ضرور کریں گے۔ اس سلسلے میں دیوانِ غالب کا مستند متن مہیا ہونا نہایت ضروری تھا۔ انھی دنوں جامعہ ملیّہ دہلی نے دیوانِ غالب جرمنی سے چھپوایا تھا مگر اس کا رسم الخط لوگوں کو پسند نہیں تھا، کیونکہ اس میں یائے مجہول نہیں تھی جس سے پڑھنے والوں کو دقّت ہوتی تھی۔ مستند متن کے لیے کئی مطبوعہ اور قلمی نسخے تجویز ہوئے مگر کسی نسخے پر اتفاق نہ ہو سکا۔ بالآخر چغتائی مرحوم کے چھوٹے بھائی نے یہ کام اپنے ذمے لے کر مولانا غلام رسول مہر اور پروفیسر محمود شیرانی وغیرہ اہلِ علم کی مدد حاصل کی۔ جب علامہ اقبال کے سامنے یہ تجویز پیش ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ غالب کے فارسی دیوان کو بھی مصوّر کیا جائے جس کی آج زیادہ ضرورت ہے۔ تاہم چغتائی مرحوم نے لوگوں کے عام مذاق کے پیشِ نظر اور آردو کو ملک کی عام فہم زبان خیال کرتے ہوئے غالب کے آردو دیوان کو ہی مصوّر کرنا ضروری سمجھا۔

جب یہ فیصلہ ہو چکا تو میں نے اور تاثیر مرحوم نے یہ طے کیا کہ علامہ سے اس مصوّر ایڈیشن پر مقدمہ لکھنے کی درخواست کی جائے۔ چنانچہ ایک روز ہم نے چغتائی مرحوم کی موجودگی میں علامہ سے یہ درخواست کی تو ایک طویل بحث کے بعد انھوں نے وعدہ کر لیا کہ وہ مقدمہ لکھیں گے۔ جب آپ یہ وعدہ کر چکے تو اب مقدمہ لکھنے کی تیاری شروع ہوگئی۔ چنانچہ آپ نے اس سلسلے میں مجھے مندرجہ ذیل خط لکھا:

"۷ ستمبر ۱۹۲۶ع

ڈیئر ماسٹر صاحب! السلام علیکم

اگر آپ کے پاس ہندوستانی مصوّروں کی بنائی ہوئی تصویروں کا کوئی مجموعہ ہو تو ایک دو روز کے لیے مرحمت کیجیے۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کے پاس ایسا کوئی مجموعہ نہ ہو تو چند مشہور تصاویر کے نام ہی سہی۔ ان کے ساتھ ان کا مضمون بھی ہونا ضروری ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی مصوّر بالعموم کیسے مضامین اپنے فن کے لیے انتخاب کرتے ہیں۔ بنگال سکول کی تصاویر کے نام خاص کر چاہییں۔ اس کے علاوہ نقادوں کی آرٹ پر کوئی کتاب ہو تو وہ بھی ساتھ لائیے۔

محمد اقبال"

چنانچہ میں چند تصاویر اور چیٹرجی البم کے تمام حصے، جس میں بنگال سکول کے مصوّروں کی تصاویر کے علاوہ عبدالرحمٰن چغتائی کی وہ تصاویر بھی تھیں جو "ماڈرن ریویو" میں طبع ہوئی تھیں، لے کر حاضرِ خدمت ہو گیا۔ آپ نے اس سلسلے میں بعض تصریحات بھی طلب کی تھیں جن کی میں نے وضاحت کر دی تھی۔ آپ نے

مجھے ایک اور خط بھی اس ضمن میں لکھا تھا جو ذیل میں درج ہے :

"۲۴ فروری ۱۹۲۷ء

جناب ماسٹر صاحب !

آپ کے چلے جانے کے بعد اس تصویر پر غور کرتا رہا جس کے متعلق ہم دیر تک بحث کرتے رہے تھے ۔ میری رائے میں شاید اس مقدمے میں یورپ کی تصاویر انٹروڈیوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ عبدالرحمٰن پھر آئیں گے تو ان سے مفصّل گفتگو ہوگی ۔ محمد اقبال"

غرض کہ علامہ نے اس ضمن میں بہت تحقیق کی اور ہم نے مزید تصاویر بھی مہیا کی تھیں ۔ جب آپ پوری طرح مطمئن ہو گئے تو آپ نے "مرقعِ چغتائی" پر وہ "پیش لفظ" لکھا جو آج بھی کتاب میں موجود ہے ۔ آپ نے اس میں تحریر فرمایا :

"۔ ۔ ۔ جہاں تک اسلام کی ثقافتی تاریخ کا تعلق ہے ، میرا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ ، باستثنا فنِ تعمیر کے ، اسلام کے فنون ، یعنی موسیقی و مصوری بلکہ شاعری ، نے بھی ابھی نمودار ہونا ہے ۔"

۱۹۲۸ء میں لاہور میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا جلسہ ہوا جس کے علامہ صدر تھے ۔ اس موقع پر آپ نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا تھا اس میں متذکرہ بالا بیان کا اعادہ بھی کیا تھا ۔ آپ کا یہ خطبہ علاوہ پیش لفظ "مرقع چغتائی" کے "اسلامک کلچر" حیدرآباد دکن میں بھی اپریل ۱۹۲۹ء میں طبع ہو چکا ہے ۔

"مرقع چغتائی" کے آخر میں "انتخابِ اشعار" کے عنوان سے جو اشعار شامل ہیں ان کا انتخاب اس طرح ہوا کہ تاثیر مرحوم نے غالب کی عظمتِ فن کے پیشِ نظر جب اس انتخاب کا مشورہ دیا تو

علامہ نے بھی اسے پسند فرمایا ۔ تاثیر نے کہا کہ آپ ہی انتخاب کر دیں مگر آپ نے کہا کہ پہلے تم کرو ، پھر میں بھی دیکھ لوں گا ۔ چنانچہ تاثیر نے تین روز کے اندر تمام دیوانِ غالب کا انتخاب غزل وار کر ڈالا اور منتخب اشعار الگ کاپی میں لکھ لیے ۔ پھر جب میں علامہ کے پاس یہ انتخاب لے کر گیا تو علامہ نے اس میں سے موزوں ترین اشعار پر اپنے ہاتھ سے نشان لگا دیے جن کو چغتائی نے ''انتخاب از شاعرِ مشرق'' کے تحت چھاپ دیا ۔ مگر جب آپ نے اسے ناپسند کیا تو بعد میں چغتائی نے اس ''انتخاب'' کو بغیر کسی کے نام کے چھاپا ۔

ایک مرتبہ ہم نے طے کیا کہ لاہور سے ایک رسالہ ''سالنامہ'' کے طور پر بہت بلند معیار کا شائع کیا جائے ۔ تاثیر اس کے مدیر چنے گئے اور ہم نے خواہش کی کہ اس کی ابتدا میں علامہ کے اشعار آنے چاہییں ۔ اس کا نام ''سالنامہ کارواں'' طے ہوا ۔ جس طرح علامہ سے کلام عنایت فرمانے کی درخواست کی گئی اس کی کیفیت تاثیر ''کارواں'' کے مقدمے میں اس طرح بیان کرتے ہیں (خلاصہ) :

> ''۔۔۔ ایک شام ہم چار — تاثیر ، چغتائی اور ان کے دو بھائی — حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جاتے ہی غیر مطبوعہ اردو کلام کا مطالبہ شروع کر دیا ۔۔۔ ''اردو زبان مستحقِ امداد ہے — آپ کا غیر مطبوعہ اردو کلام شامل نہ ہوا تو ہماری نیازمندی لوگوں کی نظر میں مشکوک ہو جائے گی ۔'' حضرتِ علامہ بستر پر لیٹے ہوئے یہ سب کچھ سن رہے تھے ۔ کہنے لگے ''اردو میں شعر نازل نہیں ہوتے ۔ مگر تمہارے اور دیگر عزیزوں کے اصرار سے اردو کی طرف میلان ہو رہا ہے ۔'' ہم نے

"اُردو غزل لے کر ٹلیں گے" کی رٹ لگانی شروع کی - علامہ اُردو غزل سن کر ذرا چونکے - کہنے لگے "یہ تم نے ایک نئی شرط لگا دی -" ہماری اس فقرے سے ہمت بندھی - ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے - "تم اپنے اشعار سناؤ - بھئی کچھ سناؤ گے تو شاید تمھاری قسمت کی کوئی چیز ہو جائے — ہاں ہاں 'سمجھا تھا میں' والی غزل - علامہ مسکرا رہے تھے - میں نے ایک مطلع پڑھا ، پھر دوسرا - علامہ اس کا ایک مصرع "تم کو اپنی زندگی کا آسرا سمجھا تھا میں" دہرانے لگے :

زلف آوارہ ، گریباں چاک ، اے مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

غزل ہی سہی :

عرصۂ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی
داورِ محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں

دورانِ غزل وہ بھی رو رہے تھے اور ہم بھی :

تھی وہ اک درماندہ رہ رو کی صدائے دردناک
جس صدا کو اک رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں
اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
کس رباطِ کہنہ کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں"

ان فیضانی لمحات کی یاد اب تک تازہ ہے - آخر یہ پوری غزل "کارواں" کے ۱۹۳۳ع کے شمارے میں چھپی اور چغتائی نے اسے اپنے نقش و نگار سے مرصّع کیا -

علامہ کا شاہکار "جاوید نامہ" ۱۹۳۲ع کے آخر میں چھپ کر بازار میں آ گیا تھا - ان کی خواہش تھی کہ یہ مصوّر ہو جائے - اس

سلسلے میں چغتائی اور علامہ کی چند ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں ۔ مگر یہ معاملہ ان کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا اور ان کا انتقال ہوگیا ۔ تاہم چغتائی نے کوشش جاری رکھی اور ۱۹۶۹ع میں کلامِ اقبال کو اپنی تصاویر سے مزیّن کر کے ایک گراں قدر ایڈیشن ''عملِ چغتائی'' کے نام سے شائع کیا ۔ یہ اپنی نوعیت کا لاجواب کارنامہ ہے اور شاید عرصۂ دراز تک ایسی کتاب پھر شائع نہیں ہو سکے گی ۔ اس میں تقریباً سو تصاویر اور دیگر ڈیزائن ہیں اور بہترین رنگین طباعت ہے ۔ کتابت اور جلد دیکھنے کے قابل ہے ۔

اگرچہ اس کا مطالعہ کرنے والے بعض حضرات ، جو معاصرانہ حیثیت سے تمام واقعات سے واقف ہیں ، اس پر تنقید بھی کریں گے ، کیونکہ بعض تصاویر کے متعلق مصوّر نے جو کچھ لکھا ہے ، ممکن ہے کچھ حضرات اس سے اتفاق نہ کریں ، تاہم ایک بات وہ بھی ضرور مانیں گے کہ شاعرِ مشرق کے کلام کو جس عقیدت و محبت اور حسن و خوبی کے ساتھ مصوّرِ مشرق نے اپنے فن سے مزیّن کیا ہے اور جس غیر معمولی فنی چابک دستی سے اسے طبع کرایا ہے ، ہمارے ملک کے فنونِ لطیفہ کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی ۔

☆ ☆ ☆

۶۴

مذہب اور سائنس

(اسلامیہ کالج کی ایجوکیشنل یونین میں خطبہ)

علامہ اقبال کو انجمنِ حمایتِ اسلام کے ساتھ ایک ایسا تعلقِ خاطر تھا کہ آپ نے ہمیشہ دل و جان سے اس ادارے کے معاملات میں حصہ لیا ۔ اسلامیہ کالج سے راقم الحروف کا تعلق بحیثیتِ معلم شعبۂ جے ۔ اے ۔ وی (جونیر اینگلو ورنیکلر) ۱۹۲۵ء سے قائم ہوا ۔ ہم نے متذکرہ بالا نام سے اس شعبے کی ایک یونین بھی قائم کی ہوئی تھی جس کے جلسوں میں عموماً باہر کے لوگ آ کر لیکچر دیتے تھے ۔ ایک دفعہ سیکرٹری ایجوکیشنل یونین مسٹر محمد اعظم نے کوشش کر کے مرزا بشیرالدین محمود قادیانی کو آمادہ کر لیا کہ وہ اس یونین کے جلسے میں "مذہب اور سائنس" کے موضوع پر ایک لیکچر دیں ۔ مجھے مجبور کیا گیا کہ میں حضرتِ علامہ کو اس جلسے کی صدارت پر آمادہ کروں ۔ چنانچہ میں مسٹر محمد اعظم کو اپنے ہمراہ علامہ کے پاس لے گیا ۔ اس نے علامہ سے درخواست کی تو آپ نے یہ درخواست قبول فرما لی اور طے پایا کہ ۴ مارچ ۱۹۲۷ء کو علامہ صدارت کریں گے ۔ ان دنوں آپ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بھی منتخب ہو چکے تھے ۔

جلسے کے اعلان کے بعد ہم نے حاضرین کے لیے نشستوں کا خاص انتظام کیا کیونکہ عام خیال یہ تھا کہ حاضرین کی تعداد بہت زیادہ ہوگی ۔ لوگ واقعی کافی تعداد میں آئے اور ہمیں حبیبیہ ہال کے فرش پر بھی لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام کرنا پڑا ۔ جلسے کے اختتام پر علامہ نے اپنی مختصر سی تقریر میں ''مذہب اور سائنس'' کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا :

''مذہب ، فلسفہ ، طبیعیات اور دیگر علوم سب کے سب مختلف راستے ہیں جو ایک ہی منزل پر جا کر اختتام پذیر ہوتے ہیں ۔ مذہب اور سائنس کے متصادم ہونے کا خیال اسلامی نہیں ہے کیونکہ سائنس (یعنی علومِ جدیدہ اور فنونِ حاضرہ) کا دروازہ کھولنے والے دراصل مسلمان ہی ہیں ۔ اسلام ہی نے انسان کو منطق کا استقرائی طریق سکھایا اور علوم کی بنیاد نظریات اور قیاسات پر رکھنے کے طریق کو مسترد کرنے کی تعلیم دی اور یہی بات علومِ جدیدہ کی ترویج کا موجب بنی ۔''

ولیم جان ڈریپر کی مشہور و معروف کتاب ''معرکہ مذہب و سائنس'' (ترجمہ از مولانا ظفر علی خاں) درحقیقت مذہب اور سائنس کی ہنگامہ آرائی کی مظہر نہیں ہے بلکہ یہ دراصل عیسائیت اور سائنس کے تصادم کی تاریخ ہے ۔ اس تصادم کی اصل وجہ یہ تھی کہ یورپ کے علما اور حکما جب مسلمانوں کی علمی ترقی سے مستفید ہوئے تو اہلِ فرنگ کے خیالات میں زبردست انقلاب پیدا ہوا جس کی وجہ سے رومن کیتھولک مذہب والے اس علمی انقلاب سے متصادم ہوگئے ۔ ڈاکٹر ڈریپر نے اسی انقلاب کی تاریخ لکھی ہے ۔

سائنس اور مذہب کے تصادم کا خیال غیر اسلامی ہے۔
مسلمانوں کے ہاں قدم قدم پر انسان کو مشاہدے اور
تجربے کے بعد علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور
انسانیت کا منتہائے کمال یہ بتایا گیا ہے کہ قوائے فطرت
کو مسخّر کیا جائے۔ چنانچہ قرآن پاک تو صاف الفاظ میں
انسانوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر وہ قوائے فطرت پر
غلبہ حاصل کر لیں گے تو ستاروں تک پہنچنے کے قابل
بھی ہو جائیں گے۔
مسلمانوں میں فرقۂ معتزلہ اور دیگر فرقوں کے درمیان جو
تنازعہ پیدا ہوا تھا وہ اس قسم کا نہ تھا جو یورپ کے
روشن دماغ علما اور تاریک خیال پادریوں کے درمیان پیدا
ہوا۔ وہ تو ایک علمی بحث تھی جس کا موضوع محض یہ
تھا کہ آیا ہمیں الہامی فکرِ ربانی کو عقلِ انسانی کے معیار
پر پرکھنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟"

علامہ کی مذکورہ بالا تقریر روزنامہ "زمیندار" میں ۶ مارچ
۱۹۲۷ع کو طبع ہوئی تھی جس سے استفادہ کر کے یہاں درج کی
گئی ہے۔

جب حضرتِ علامہ پنجاب لیجس لیٹو کونسل کے ممبر منتخب
ہوگئے تھے تو اہلِ لاہور نے اس خوشی میں جلوس نکالے تھے۔ اس
موقع پر اسلامیہ کالج کی طرف سے بھی ایک شام سٹاف روم میں دعوت
کا انتظام کیا گیا تھا جس میں تمام اساتذہ شامل ہوئے تھے۔ پروفیسر
سراج الدین آزر نے اس دعوت میں کالج کے طلبہ کی تمام انجمنوں کی
طرف سے نمائندگی کی تھی۔ یہ زمانہ عبداللہ یوسف علی کی پرنسپلی کا

تھا جنھوں نے علامہ کے حق میں اپنا ووٹ سب سے پہلے قلعہ گوجر سنگھ کے پولنگ سٹیشن پر ڈالا تھا ۔ راقم اس پولنگ سٹیشن کا منتظم تھا ۔ جب دعوت ختم ہوئی تھی تو ہم لوگ آپ کے ہمراہ میکلوڈ والی کوٹھی تک ایک جلوس کی صورت میں آئے تھے ۔

٦٥

شعر سنانے کی فرمائش

بعض ناواقف حضرات ، جو کسی اعلٰی منصب پر فائز ہوتے تھے ، علامہ کو ایک عام اور روایتی شاعر سمجھ کر ان سے اپنے اشعار سنانے کی فرمائش کرتے تھے جسے آپ بہت ہی ناپسند کرتے تھے، بلکہ بعض اوقات تو وہ اپنے شاعر ہونے سے بھی انکار کر دیتے تھے ۔ اسی طرح بعض حضرات آپ سے تاریخ کہنے کی فرمائش بھی کرتے جسے وہ عموماً ٹال دیتے ۔ اسی قسم کے دو واقعات یہاں مختصر طور پر درج کیے جاتے ہیں :

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ "میں بحری جہاز کے ذریعے یورپ سے وطن واپس آ رہا تھا کہ حیدرآباد کے ایک شہزادے معظم جاہ سے جہاز پر ملاقات ہوگئی ۔ شہزادے نے فوراً اشعار سنانے کی فرمائش کی مگر میں نے معذرت کر دی ۔ پھر اُس نے اپنی ایک غزل سنائی تو میں نے کہا کہ صرف تمہارا دادا میر محبوب علی خاں عمدہ شعر کہتا تھا اور اس کی شاعری کے قائل مولانا گرامی بھی تھے ۔

ایک دفعہ "میں علامہ کے ہمراہ ڈیرہ دون گیا ۔ چودھری محمد حسین اور ملتان کے ایک صاحب بھی شریکِ سفر تھے ۔ آپ کو حکیم اجمل خاں سے بھی ملاقات کرنی تھی ۔ چنانچہ آپ نے لاہور

سے چلنے سے پیشتر رسمی طور پر ان کو ایک تار بھی دے دیا
تھا ۔ یہ تار اُن کو اُس وقت ملا جب وہ نواب صاحب رامپور کے
ہاں گئے ہوئے تھے ۔ ہم صبح صبح حکیم صاحب کے ہاں پہنچ گئے
اور ان سے ملاقات کی ۔ اسی دوران میں حکیم صاحب نے کہا کہ
چونکہ آپ کا تار مجھے نواب صاحب کی موجودگی میں ملا تھا لہٰذا
وہ بھی آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں ۔ جب حکیم صاحب نے علامہ
سے ان کی رائے دریافت کی تو علامہ نے جواب دیا کہ میں صرف اس
شرط پر ان سے ملاقات کروں گا کہ وہ نہ تو مجھ سے اشعار سننے کی
فرمائش کریں اور نہ ہی اپنے اشعار مجھے سنائیں ۔ یہ جواب سن کر
حکیم صاحب خاموش ہوگئے اور پھر اس موضوع پر بات نہیں کی ۔

☆ ☆ ☆

٦٦

خطبۂ عید الفطر

ایک مرتبہ علامہ نے احباب کے اصرار پر ۱۹۳۲ء میں ماہ رمضان کے اختتام پر عید الفطر کے روز بادشاہی مسجد لاہور میں ایک خطبہ دیا تھا جو بصورتِ پمفلٹ چھاپ کر تقسیم کیا گیا تھا ۔ اسی خطبے کو مرزا عبد الحمید نے بھی اسلامیہ کالج کے رسالے ''کریسنٹ'' کے ''فروغِ اردو نمبر'' میں ۱۹۴۰ء میں ''تعلیماتِ اقبال'' کے تحت شائع کیا تھا[1] ۔ ذیل میں اس کا ایک خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے ۔ علامہ نے سب سے پہلے روزے کے بارے میں قرآن مجید کی مشہور آیت پڑھی اور پھر فرمایا :

''. . . بے شک مسلم کی عید اور اس کی خوشی اگر کچھ ہے تو یہ ہے کہ وہ اطاعتِ حق یعنی عبدیت کے فرائض کی بجا آوری میں پورا اترے ۔ اور قومیں بھی خوشی کے تیوہار مناتی ہیں مگر سوائے مسلمانوں کے اور کون سی قوم ہے جو خدائے پاک کی فرمان برداری میں پورا اترنے کی خوشی

۱- یہ خطبہ ''مقالات اقبال'' مرتبہ سید عبدالواحد میں بھی طبع ہو چکا ہے جسے شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار ، لاہور نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا تھا ۔

مناتی ہے . . . آج کی عید ''عید الفطر'' کہلاتی ہے۔
پیغمبر خداؐ نے جب عید کے لیے عید گاہ میں اکٹھے ہونے
کا حکم دیا تو ساتھ ہی صدقۂ عید الفطر ادا کرنے کا حکم
بھی دیا . . .۔ یہ رمضان کا مہینہ آپ لوگوں نے اس اہتمام
سے بسر کیا ہے کہ کھانے پینے کے اوقات کی پابندی بھی سیکھ
لی اور اپنی صحت بھی درست کر لی . . .۔ باقی رہا یہ امر
کہ روزے ماہ رمضان کے ساتھ ہی کیوں مختص کیے جائیں؟
تو واضح رہنا چاہیے کہ اسلام نے انسان کی انفرادی اور
اجتماعی زندگی کے اسرار کو مدِ نظر رکھ کر ''صیام'' کے
زمانی تسلسل کو ضروری سمجھا ہے . . .۔ چنانچہ قرآن میں
فرمایا: ''تلک حدود اللہ فلا تقربوھا ، کذالک یبیّن اللہ
آیاتہ للناس لعلھم یتقون۔''

روزہ رکھ کر مفلسوں سے محض ہمدردی کا احساس پیدا کر
لینا کافی نہ تھا ، عید کے دن غربا کو دو چار دن کا کھانا
دے دینا کافی نہ تھا بلکہ طریقہ وہ اختیار کرنا مقصود تھا
کہ مستقل طور پر دنیاوی مال و متاع سے انتفاع کرکے
قواعد اس طور پر قائم ہوں کہ جن سے تقسیمِ وراثت اور
زکٰوۃ سے ملّتِ اسلامیہ کے مال و متاع میں ایک گونہ
مساوات پیدا ہو . . . علمائے قرآن نے ''حکام'' سے مراد
مسلمانوں کے اپنے مفتی ، قاضی اور سلطان لیے ہیں . . .
روزے رکھنے کی غرض یہ تھی کہ آئندہ تمام سال اسی
طرح ایک دوسرے کے ہمدرد اور بھائی بن کر رہو . . .
آج کے دن سے تمھارا عہد ہونا چاہیے کہ قوم کی اقتصادی

اور معاشرتی اصلاح کی جو غرض قرآن حکیم نے اپنے ان احکام میں قرار دی ہے اس کو تم ہمیشہ مد نظر رکھو گے ۔ مسلمانانِ پنجاب اس وقت تقریباً سوا ارب روپے کے قرض میں مبتلا ہیں ۔"

✡ ✡ ✡

٦٧

افغانستان کا سفر

علامہ اقبال نے اپنی مشہور کتاب ''پیامِ مشرق'' کو ۱۹۲۲ء میں شائع کیا تھا۔ آپ نے اس کتاب کو والیِ افغانستان امان اللہ خاں کے نام جس طرح ''پیش کش'' کیا اس کے الفاظ یہ ہیں :

''بحضور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں فرماں روائے دولتِ مستقلۂ افغانستان خلداللہ ملکہ و اجلالہ۔''

یہ کتاب حضرتِ علامہ نے مشہور المانوی شاعر گوئٹے کے ''مغربی دیوان'' کے جواب میں لکھی ہے۔ امیر امان اللہ خاں ۱۹۱۹ء میں تخت نشیں ہوا تھا۔ افغانستان کے سیاسی حالات دوسرے مشرق ممالک سے کسی قدر بہتر اور مختلف تھے اور علامہ کی خواہش تھی کہ ''پیامِ مشرق'' کو کسی آزاد اسلامی حکومت کے والیِ سلطنت کے نام معنون کیا جائے کیونکہ اس میں اسلامی امور پر آزادانہ بحث کی گئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی رائے افغانستان کے حق میں تھی۔ آپ نے ایک بیان بھی لاہور کے ایک انگریزی روزنامے ''ٹریبیون'' کو ۲۲ فروری ۱۹۲۹ء کو دیا تھا جس میں آپ نے اپنے نقطۂ نگاہ سے افغانستان کے حالات پر تبصرہ کیا تھا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے :

''. . . نہ صرف افغانستان کے مفاد بلکہ ایشیا کے وسیع تر

فرائض و مقاصد کے لحاظ سے ضروری ہے کہ شاہ امان اللہ کی حکومت بحال رکھی جائے . . . ہم جو کچھ اخبارات میں دیکھتے ہیں ، میرے خیال میں اس کا بڑا حصہ قابلِ اعتماد نہیں ہے اور نہ میں ان بیانات پر کوئی اعتماد رکھتا ہوں جو کابل سے آنے والے اشخاص کی زبانی ہم تک پہنچتے ہیں . . . امان اللہ خاں کی ناکامی کے وجوہ میری حد تک یہ ہیں کہ انھوں نے اصلاحات نافذ کرنے میں عجلت سے کام لیا ہے . . . حضرت شور بازار کو اس سازش کا سرغنہ کہا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے خود دستخط کیے تھے. . . انسان نے اپنی معاشرتی تہذیب کی تشکیل کا سبق حال ہی میں نہیں سیکھا ہے اس لیے جائز حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے ۔''

مجھے یاد ہے کہ ان دنوں بہت سے طالب علم علامہ کے ہاں اسلامیہ کالج پہنچ گئے تھے ۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی طرح امان اللہ خاں کو افغانستان واپس لانا چاہیے ۔ اسی شام ایک جلسہ بھی محمڈن ہال میں ہوا تھا جس میں امان اللہ خاں کی واپسی کے لیے ایک فنڈ جمع کرنے کا آغاز کیا گیا تھا ۔ اسلامیہ کالج کا طالب علم مسٹر ممتاز مرزا فنڈ جمع کرنے میں پیش پیش تھا ۔ مجھ سے بھی ممتاز مرزا نے چندہ لیا تھا اور چھپی ہوئی رسید بھی مجھے دی تھی ۔ جلسے میں امان اللہ خاں کے عنوان سے نظمیں بھی پڑھی گئی تھیں ۔ اس زمانے میں برطانوی حکام غازی امان اللہ خاں کے خلاف تھے ۔ بچہ سقہ کے حامیوں نے اسے تخت پر متمکن کر دیا تھا اور ''ملا'' شور بازار کو گرفتار کر لیا گیا تھا ۔ ایک نظم بعنوان ''خطاب باقوامِ شرق'' جو ''انقلاب''

میں چھپی تھی ، اس کے دو شعر یہ ہیں :

در نہادِ ما تب و تاب از دل است
خاک را بیداریِ خواب از دل است
گیر دامانِ امان اللہ را
او جوان مرد است و داند راہ را

جو روپیہ اس وقت ''امان اللہ فنڈ'' میں جمع ہوا تھا اسے امپیریل بینک میں جمع کرا دیا گیا تھا ۔

ایک پارٹی جنرل نادر خاں کو افغانستان بلا رہی تھی کہ وہ آ کر کسی طرح امان اللہ خاں کو واپس لائیں ۔ پہلے خبر آئی تھی کہ جنرل نادر خاں بمبئی پہنچ گئے ہیں ۔ پھر اطلاع آئی کہ وہ لاہور سے گزریں گے ۔ چنانچہ لاہور ریلوے سٹیشن پر لاکھوں مسلمان پہنچ گئے تھے ۔ علامہ اقبال اور مولوی ظفر علی خاں کے ساتھ راقم بھی وہاں موجود تھا ۔ چنانچہ ریل گاڑی کے آنے پر عبدالمجید سالک ، غلام رسول مہر ، نور الحق ، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ ، مولوی عبد القادر قصوری اور علامہ اقبال نے ڈبے میں جنرل نادر خاں سے ملاقات کی ۔ جنرل کے ساتھ ان کے دو بھائی بھی تھے ۔ سید حبیب اور ان کے بھائی عنایت شاہ ان کے ہمراہ تھے ۔ اپنے ڈبے کے دروازے پر کھڑے ہو کر جنرل نادر خاں نے لوگوں سے یوں خطاب کیا :

''میں بیمار تھا اور اب بھی میری طبیعت ناساز ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب میں اس قابل ہوں کہ اس نازک وقت میں افغانستان کی خدمت کر سکوں ۔ افغانستان میں اس وقت آگ لگی ہوئی ہے اور میں اسی آگ کو بجھانے

کے لیے جا رہا ہوں ۔ میں اپنے ذاتی اغراض کے لیے وہاں
نہیں جا رہا ہوں بلکہ میں وہاں امن قائم کرنا چاہتا ہوں ۔
میری خواہش ہے کہ خدا تعالیٰ مجھے مادرِ وطن کی
خدمت انجام دینے کے لیے طاقت بخشے ۔ میری خدا سے
یہی دعا ہے کہ وہ شاہ امان اللہ کو جلد تخت پر واپس
لائے ۔"

اس تقریر پر ''اللہ اکبر'' کے پُرجوش نعرے بلند ہوئے ۔

گاڑی چلنے لگی تو مولوی ظفر علی خاں اور شیخ سراج الدین
پراچہ بھی اس میں سوار ہو گئے اور جنرل نادر خاں کے ہمراہ پشاور
تک گئے ـــــ کوئٹہ کے راستے سردار عنایت بھی افغانستان پہنچ گئے ۔
اس کے بعد اس قسم کی افواہیں لوگوں میں عام ہو گئی تھیں
کہ امان اللہ خاں قندھار میں رہیں گے اور مُلا" شور بازار کو گرفتار
کر لیا گیا ہے ۔ غرض کہ چند دن بعد نادر خاں نے والیِ افغانستان
کی حیثیت سے اقتدار سنبھال لیا اور علامہ سر محمد اقبال کے مبارک باد
کے ایک خط کے جواب میں ان کو شکریے کا خط بھیجا جس کا
ترجمہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے ۔ یہ روز شنبہ ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ
(۱۹۲۹ع) کی تحریر ہے :

''جناب فاضل محترم سر محمد اقبال !

آپ کے عالی جذباتِ ہمدردانہ نے ، جو آپ نے موجودہ تباہ
حال افغانستان سے متعلق ظاہر کیے ہیں ، مجھے اور افغانستان
کے عام بہی خواہوں اور فدا کاروں کو ممنون و متشکّر بنا
دیا ہے ۔ افغانستان تباہی کے نزدیک ہے اور اس کی بے چارہ
ملّت کو بہت بڑے تہلکے کا سامنا ہے ۔ افغانستان اپنے

ہندی بھائیوں کی ہر قسم کی امداد و اعانت کا محتاج ہے۔
ایسے وقت میں جو خیر خواہانہ قدم آپ اُٹھا رہے ہیں وہ
ہمارے لیے بہت ڈھارس کا موجب ہے۔ خصوصاً مالی امداد ،
جس کے متعلق میں اخبار ''اصلاح'' میں بھی اپنے ہندی
بھائیوں سے اپیل کر چکا ہوں ، بہت حوصلہ افزا ہے۔
جناب فاضلِ محترم جس طرح افغانستان کی موجودہ مصیبت
میں شریک ہیں ، اُمید ہے اس موقع پر اپنی مساعی سے
کام لے کر افغانستان کی مصیبت زدہ ملّت کو ہمیشہ کے لیے
ممنون و متشکّر فرمائیں گے۔ بااحتراماتِ لائقہ

محمد نادر خاں۔''

نادر خاں کی مالی امداد کا کام خود علامہ کی سرپرستی میں ہوا اور جتنا روپیہ اکٹھا ہوا وہ نادر خاں کو ارسال کرنے کی غرض سے بینک آف انڈیا میں جمع کروا دیا گیا۔ اس موقع پر جنرل نادر خاں اور علامہ اقبال کے درمیان خاصی طویل خط و کتابت بھی ہوئی جس کی تفصیل ''گفتارِ اقبال'' میں موجود ہے۔

اواخر سنہ ۱۹۳۳ع میں جب جنرل نادر خاں افغانستان میں برسراقتدار تھے ، انھوں نے تعلیمی معاملات میں مشورے لینے کے خیال سے علامہ اقبال ، سید راس مسعود اور مولانا سید سلیمان ندوی کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ یہ تینوں حضرات افغانستان جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ جس روز ان حضرات کو روانہ ہونا تھا ، اُس روز میں صبح صبح علامہ کی کوٹھی پر پہنچا۔ ڈاکیے نے آپ کو خطوط لا کر دیے تو ان میں ایک خط ایسا بھی تھا جس میں کسی نے آپ سے خاقانی کے چند اشعار کا مطلب دریافت کیا تھا۔ آپ چونکہ عجلت میں تھے اور جواب بھی دینا چاہتے تھے لہٰذا میں نے مشورہ دیا

کہ اس خط کو پروفیسر شیرانی کے حوالے کر جائیں تا کہ وہ آپ کی طرف سے مناسب جواب لکھ دیں ۔ چنانچہ انھوں نے یہ خط ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو میرے حوالے کر دیا اور اس کی پشت پر شیرانی کے نام یہ تحریر لکھ دی :

''ڈیئر شیرانی صاحب ! میں کل کابل جا رہا ہوں اس واسطے فرصت نہیں ہے ۔ آپ مہربانی کر کے اس خط کا جواب راقم کو دے دیں اور ان کو یہ بھی لکھ دیں کہ میں کابل جا رہا ہوں ، اس واسطے خود جواب نہ لکھ سکا ۔

محمد اقبال''

(انوارِ اقبال ، ص ۲۸۸)

۲۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو علامہ کابل پہنچے ۔ سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی صاحب بھی آپ کے ہمراہ تھے ۔ کابل میں یہ لوگ سرکاری مہمان تھے ۔ انھوں نے نظامِ تعلیم کے سلسلے میں وہاں کی ''وزارتِ معارف'' کو ایک مکمل لائحۂ عمل تیار کر کے دے دیا ۔ وہاں ان حضرات نے کابل ، غزنی اور قندھار وغیرہ شہروں کی بھی خوب سیر کی ۔ جب علامہ نے جنرل نادر خاں سے ملاقات کی تو آپ نے اعلیٰ حضرت کو قرآنِ کریم کا ایک مطبوعہ نسخہ بھی پیش کیا ۔ اعلیٰ حضرت نے اس نسخے کو سینے سے لگایا ، چوما اور آبدیدہ ہو کر کہا کہ یہ تحفہ ہمارے لیے دین و دنیا کی سب سے قیمتی متاع ہے ۔ اس موقع پر دونوں آبدیدہ ہو گئے اور دونوں نے عالمِ اسلام کی بہبود کے لیے دعائے خیر کی ۔

پھر ماہ نومبر میں یہ حضرات کابل سے واپس آ گئے ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر ایک نظم ''التجائے مسافر'' کے عنوان سے

اور دوسری نظم بعنوان "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" لکھی۔ دورانِ سفرِ کابل علامہ صلاح الدین سلجوقی بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ واپسی پر علامہ سید سلیمان ندوی نے افغانستان کا سفرنامہ بھی لکھا جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

٦٨

آل انڈیا کشمیر کمیٹی اور کشمیر

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین محمود قادیانی چلے آ رہے تھے لیکن جب احرار نے احمدیوں کے خلاف تحریک شروع کی تو مرزا بشیر الدین محمود نے خود ہی کمیٹی کی صدارت سے استعفا دے دیا۔ ان کے مستعفی ہونے پر علامہ اقبال کمیٹی کے صدر اور ملک برکت علی عارضی سیکرٹری مقرر ہوئے اور یہ انتظام ایک سال تک رہا۔ علامہ اقبال نے کمیٹی کی صدارت اس لیے قبول فرمائی تھی کیونکہ وہ خود بھی کشمیری الاصل تھے اور احرار کے ممنون تھے کہ انھوں نے اس ادارے کو احمدیوں کے تسلّط سے نجات دلائی تھی۔ علامہ ہمیشہ کشمیریوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے رہے تھے اور وہ ان کی آزادی و خود مختاری اور ترقی و خوش حالی کے دل سے متمنی تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اہلِ کشمیر اور اہلِ مصر کی اصل ایک ہے۔

جون ۱۹۲۱ء میں علامہ خود بھی ایک کیس کے سلسلے میں وکیل کی حیثیت سے کشمیر گئے تھے۔ مولوی احمد دین وکیل اور منشی طاہر الدین آپ کے ہمراہ تھے۔ آپ کشمیر کی تاریخ اور اس کے جغرافیے سے مکمل واقفیت رکھتے تھے۔ لاہور کی کشمیری

برادری اور تمام کشمیری آپ کو اہلِ کشمیر کا سب سے بڑا خیر خواہ سمجھتے تھے ۔

خطۂ کشمیر اپنی جغرافیائی صورتِ حال کی وجہ سے کئی مرتبہ حملہ آوروں کی دست برد سے محفوظ رہا ۔ پہلے سلطان محمود غزنوی نے اور پھر بابر بادشاہ نے کشمیر کو فتح کرنا چاہا مگر ناکام رہے ۔ بالآخر اکبرِ اعظم اسے فتح کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اس نے راستوں وغیرہ کا انتظام کیا ۔ اس زمانے میں کشمیر پہنچنے کے دو راستے تھے : ایک حسن ابدال کی طرف سے تھا جو مظفر آباد تک جاتا تھا اور دوسرا موجودہ منگلا ڈیم کی طرف سے تھا ۔

۶۹

ڈاکٹر محمود الخضیری

(فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ پر تبصرہ)

---

۹۳۲ اع کے اخیر میں ، جب کہ علامہ اقبال اسلامی عہد کے آثار دیکھنے کی غرض سے ہسپانیہ تشریف لے گئے ، ان کی ملاقات ایک نوجوان مصری محقّق محمود الخضیری سے ہوئی ۔ وہ علامہ کا ایک لیکچر ''کیا مذہب ممکن ہے ؟'' دیکھنے کا بے حد شائق تھا جو علامہ نے لندن کی ارسطاطالین سوسائٹی کی تقریب میں انگریزی زبان میں پڑھا تھا اور چھپ بھی چکا تھا ۔ اس نے علامہ سے درخواست کی تھی کہ مذکورہ لیکچر کی ایک کاپی اسے ضرور ارسال کی جائے ۔ چنانچہ جب علامہ واپس تشریف لائے تو انھوں نے مجھے یہ لیکچر محمود الخضیری کو بھیجنے کا حکم دیا جس کی میں نے فوراً تعمیل کی اور ڈاک کے ذریعے ایک کاپی انھیں بھیج دی ۔ چونکہ یہ لیکچر راقم کی معرفت بھیجا گیا تھا لہذا اس کی رسید میں علامہ کو جو خط آیا وہ بھی میری معرفت آیا ۔ ڈاکٹر محمود الخضیری کا یہ خط ، جو عربی زبان میں ہے اور جذباتِ محبت سے لبریز ہے ، ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے ۔ یہ خط انھوں نے ۲۶ جنوری ۹۳۳ اع کو ایسکوریل محل میں بیٹھ کر لکھا ہے جو میڈرڈ (ہسپانیہ) کے قریب واقع ہے اور جس میں

گذشتہ بادشاہوں کی قبروں کے علاوہ قدیم مخطوطات کا ایک عمدہ کتاب خانہ بھی ہے۔ ڈاکٹر محمود آس زمانے میں اس کتاب خانے میں بیٹھ کر تحقیقی کام کر رہے تھے اور مخطوطات کی تصویریں حاصل کر رہے تھے۔ چنانچہ وہ علامہ کو لکھتے ہیں :

''۲۶ جنوری ۱۹۳۳ء

کیپٹن گیلن ، الاسکوریل (میڈرڈ) ۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ نے جس مہربانی سے مجھے اپنا مضمون ''کیا مذہب ممکن ہے ؟'' ارسال فرمایا ہے ، میں دل و جان سے اس کے لیے ممنون ہوں ۔ میں نے کمال دلچسپی اور عقیدت سے اس کا مطالعہ کیا ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ جس طرح آپ نے اسلامی نظریات کو صحیح رنگ میں پیش کیا ہے اور مذہب اسلام کی حقیقی ، ابدی اور زندۂ جاوید خوبیوں کو یورپ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے متعارف کرایا ہے ، یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے ۔ مجھے مسرت ہوئی ہے اور میں اس پر نازاں ہوں کہ آپ نے اپنے اس مضمون میں اشاعت و وسعتِ اسلام کے سلسلے میں ایک انتہائی توانا اور اطمینان بخش دلیل پیش کی ہے جو اس ضمن میں قطعی اور یقینی راہِ عمل کی طرف رہنمائی کرتی ہے ۔ ہمارا یہ دور ایسی مشکلات سے لبریز ہے جو بنی نوع انسان کے تمام مراحلِ زندگی پر حملہ آور ہیں ۔ ایسا لگتا ہے کہ موجودہ مسلّمہ مدارج و مراتبِ ترقی ، جن پر مغرب کے جدید تمدن کا انحصار ہے ، ہماری معاشرتی اور ذہنی جدوجہد کی قدر و منزلت کو مشکوک بنا رہے ہیں ۔ تصوف اور مذہب کے

خلاف جدید سائنس کے وسوسے اور شکوک انتہائی مجرمانہ ہیں ، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سچا مذہب کسی پہلو سے بھی بنی نوع انسان کی ترقی اور خوش حالی کے راستے میں حائل نہیں ہوتا ۔ مجھے یقین ہے کہ اس ضمن میں آپ کی مساعیِ جمیلہ اہلِ مغرب کو یقینی طور پر قائل کر لیں گی ۔

جناب والا ! آپ نے یہ مضمون ارسال فرما کر میری عزت افزائی کی ہے ۔ میری طرف سے اس مقدس تحفے کا شکریہ قبول فرمائیے ۔ ایک ادنیٰ عقیدت مند اور مرید کی حیثیت سے میں آپ کی خدمت میں دلی توقیر اور خراجِ عقیدت پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں ۔

آپ کا عقیدت کیش محمود الخضیری''

اس کے بعد ۱۹۳۶ع میں ڈاکٹر محمود الخضیری سے راقم کی ملاقات پیرس کی ایک دعوت میں ہوئی جہاں اقبال شیدائی نے تعارف کے فرائض انجام دیے تھے ۔ اس دعوت میں مشہور و معروف عالم اور جلیل القدر عرب مفکّر شکیب ارسلان مہمانِ خصوصی تھے ۔ اس ملاقات کے بعد ڈاکٹر محمود سے ایک قسم کے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے اور ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا ۔ پھر ہماری ملاقات پیرس کے ببلوتھیکا نیشنل میں ہوئی تو ڈاکٹر محمود کی زبانی معلوم ہوا کہ مشہور فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ (۱۶۵۰ع) کی یاد میں عنقریب ایک کانفرنس ہونے والی ہے ۔ چنانچہ ہم نے طے کیا کہ علامہ سے بھی اس کانفرنس کے لیے ایک مقالہ لکھنے کی درخواست کی جائے ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مجوّزہ کانفرنس جولائی ۱۹۳۷ع میں ہوگی اور اس میں دنیا کے بڑے بڑے مفکّر اور فلاسفر شرکت

کریں گے - چنانچہ میں نے فوراً علامہ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا اور ان سے ڈیکارٹ کے فکر و فن پر ایک مقالہ لکھنے کی درخواست کی - علامہ کا جواب فوراً آیا جس میں انھوں نے اپنی علالت کے پیشِ نظر مقالہ لکھنے سے معذوری ظاہر کی تھی - یہ خط ''اقبال نامہ'' (جلد دوم ، صفحہ ۳۴۰ - ۳۴۵) میں شائع ہو چکا ہے اور یہاں بھی پیش کیا جا رہا ہے :

''ڈیئر ماسٹر عبداللہ چغتائی !

آپ کا خط ملا - علمی مشاغل میں مصروف رہنا آپ کو مبارک ہو - میری صحت بہ نسبتِ سابق بہتر ہے لیکن بحیثیتِ مجموعی دائم المریض کی زندگی بسر کر رہا ہوں ، تاہم صابر و شاکر ہوں - اٹیلین زبان میں جن مضامین کا آپ نے ذکر کیا ہے ، افسوس ہے مجھے ان کا علم نہیں - اگر ممکن ہو تو ان مضامین کا انگریزی میں ترجمہ کروا کے بھیج دیجیے - ترجمے اور ٹائپ کا خرچ میں ادا کروں گا - اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ دونوں رسالے ، جن میں یہ مضامین شائع ہوئے ہیں ، بھیج دیجیے - میں ان کا یہاں ترجمہ کروانے کی کوشش کروں گا اور جب آپ یورپ سے واپس آئیں گے تو دونوں رسالے آپ کے حوالے کر دوں گا -

ڈیکارٹ پر مضمون لکھنے کی اب مجھ میں ہمت باقی نہیں رہی - اگر آپ کو پیرس میں نوجوان عمر کا کوئی سکالر مل جائے تو اس سے یہ کہنا کہ ڈیکارٹ کی مشہور کتاب Method کا امام غزالی کی کتاب ''احیاء العلوم'' سے مقابلہ کرے اور یورپ والوں کو دکھائے کہ ڈیکارٹ اپنے اس Method کے لیے ، جس نے یورپ میں نئے علوم

کی بنیاد رکھی ، کہاں تک مسلمانوں کا ممنونِ احسان ہے ؟ مغربی فلسفے کا مورخ . . . تو یہاں تک لکھتا ہے کہ اگر ڈیکارٹ عربی زبان کا عالم ہوتا تو ہم اسے غزالی کی ''احیاء العلوم'' سے چوری کرنے کا الزام لگاتے ۔ لیکن اٹلی کا مشہور شاعر دانتے بھی تو شاید عربی نہیں جانتا تھا لیکن اس کی کتاب Devine Comedy محی الدین ابنِ عربی کے افکار و تخیلات سے لبریز ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے نتائجِ افکار یورپ میں عام تھے اور یورپ کے بڑے بڑے مفکر اور تعلیم یافتہ آدمی ، خواہ وہ عربی جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں ، عام طور پر اسلامی تخیلات سے آشنا تھے ۔

انگریزی کتابوں نے ہم ہندی مسلمانوں کو یہ سکھایا ہے کہ منطقِ استقرائی کا موجد بیکن (Bacon) تھا لیکن فلسفۂ اسلامی کی تاریخ بتاتی ہے کہ یورپ میں اس سے بڑا جھوٹ آج تک نہیں بولا گیا ۔ ارسطو کی منطق کی شکلِ اول پر سب سے پہلے اعتراض کرنے والا ایک مسلمان منطقی تھا ۔ یہی اعتراض John Stuart Mill کی کتابوں میں دہرایا گیا ہے اور مسلمانوں کا استقرائی طریق بیکن (Bacon) سے مدتوں پہلے سارے یورپ کو معلوم تھا ۔

محمود خضیری سے میں سپین میں ملا تھا ۔ وہ اس وقت فقہِ اسلامی پر ریسرچ کر رہے تھے ۔ نہایت نیک نوجوان ہیں ۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ نصیر الدین طوسی پر مقالہ پڑھیں گے . . . ۔ اس تحقیق سے ان کو معلوم ہوگا کہ مسلمان ریاضی دان قرونِ وسطیٰ میں ہی اس

نتیجے پر پہنچ چکے تھے - یہ ممکن ہے کہ مکان کے ابعاد
(Dimensions) تین سے زیادہ ہوں اور ہمارے اسلامی صوفیہ
تو ایک مدت سے تعددِ زمان و مکان کے قائل ہیں - یہ خیال
یورپ میں سب سے پہلے جرمنی کے فلسفی کانٹ (Kant) نے
پیدا کیا تھا لیکن مسلمان صوفیہ اس سے پانچ چھ سو سال
پہلے اس نکتے سے آگاہ تھے - عراق کے رسالے کا قلمی نسخہ
غالباً ہندوستان میں موجود ہے اور میں نے ان کے ایک
رسالے کا ، جو خاص طور پر زمان و مکان پر ہے ، اپنے
لیکچروں میں ملخّص بھی دیا ہے - اگر محمود خضیری
بھی اس مضمون پر ریسرچ کریں تو مجھے یقین ہے کہ
یورپ میں نام پیدا کریں گے -''

میں نے اور ڈاکٹر محمود خضیری نے علامہ کے اس خط کو
سامنے رکھ کر اس کا ایک خلاصہ تیار کیا اور ڈیکارٹ سے متعلق
کانفرنس کے منتظمین کو بھیج دیا جس کی رسید بھی آ گئی تھی -
مقصد یہ تھا کہ علامہ کے نقطۂ نظر سے بھی کانفرنس کو مطلع کر
دیا جائے -

اپنے قیامِ پیرس کے دنوں میں ایک روز میں اپنی قیام گاہ کے
قریب ایک کتاب فروش کی دکان پر کتابیں دیکھ رہا تھا کہ اتفاقاً
مجھے فرانسیسی زبان کے رسالے ''مرکری'' کے دو شمارے (بابت مئی
۱۹۳۴ع و جولائی ۱۹۳۴ع) مل گئے - یہ پرچے میں نے خرید لیے
اور گھر لے آیا - مئی کے شمارے میں نٹشے پر جولیس ڈی گالٹیر کا
ایک مضمون تھا جس میں نٹشے کے نظریات پر ویسی ہی تنقید کی
گئی تھی جیسی علامہ اقبال نے کئی مواقع پر کی تھی - جن امور
کی طرف علامہ نے اپنے متذکرہ خط میں اشارے کیے ہیں ، وہ تمام

امور اس مضمون میں بھی بیان کیے گئے ہیں۔

سید سلیمان ندوی نے "حیاتِ شبلی" کے صفحہ ۵۸۲ پر "مجلسِ علم کلام کی تجویز" کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ "اس مجلس کے لیے علما میں سے انھوں نے مولوی مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی، مولانا شیر علی صاحب حیدر آبادی اور سید رشید رضا مصری کو لیا۔ اور نئے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے ڈاکٹر محمد اقبال لاہوری کو۔"

۱۹۱۱ع کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں مولانا شبلی نعمانی موجود تھے۔ علامہ اقبال نے اس میں نظم کے علاوہ منطق پر ایک شاندار تقریر بھی کی تھی۔ آپ کی صدارتی تقریر سے پہلے خواجہ کمال نے تقریر کی تھی۔ چنانچہ جب آپ نے تقریر شروع کی تو فرمایا:

"خواجہ صاحب نے جو تقریر اس وقت کی ہے وہ نہایت دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں نے اس مبحث پر بہت کچھ لکھا ہے کہ اسلام اور علومِ جدیدہ کے مابین کیا تعلق ہے؟ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ اصولوں کا سرچشمہ ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں، جب سے کہ یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا، یورپ میں علم کا چرچا مسلمانوں ہی کی یونیورسٹیوں کی بدولت ہوا تھا۔ ان یونیورسٹیوں میں یورپ کے مختلف ممالک کے طلبہ آ کر علم حاصل کرتے تھے اور پھر اپنے اپنے حلقوں میں علوم و فنون کی اشاعت کرتے تھے۔ کسی یورپین کا یہ کہنا کہ اسلام اور علومِ جدیدہ یکجا نہیں ہو سکتے، سراسر ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اور مجھے تعجب ہے کہ علومِ اسلامی اور تاریخِ اسلام کے موجود ہونے کے باوجود کوئی شخص کیونکر کہہ سکتا

ہے کہ علوم جدیدہ اور اسلام ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے ۔
بیکن ، ڈیکارٹ اور مِل یورپ کے سب سے بڑے فلاسفر
مانے جاتے ہیں جن کے فلسفے کی بنیاد تجربے اور مشاہدے
پر ہے ۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ڈیکارٹ کا ''میتھڈ''
(اصول) امام غزالی کی ''احیاء العلوم'' میں موجود ہے
اور ان دونوں میں اس قدر تطابق ہے کہ ایک انگریز
مورخ نے لکھا ہے کہ اگر ڈیکارٹ عربی جانتا ہوتا تو ہم
ضرور اعتراف کرتے کہ ڈیکارٹ سرقے کا مرتکب ہوا ہے ۔
راجر بیکن خود ایک اسلامی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا ۔
جان اسٹوارٹ مِل نے منطق کی شکلِ اوّل پر جو اعتراض
کیا ہے ، بعینہ وہی اعتراض امام فخر الدین رازی نے بھی
کیا تھا اور مِل کے فلسفے کے تمام بنیادی اصول شیخ
بو علی سینا کی مشہور کتاب ''الشفا'' میں موجود ہیں ۔
غرض کہ تمام وہ اصول جن پر علومِ جدید کی بنیاد ہے ،
مسلمانوں کے فیض کا نتیجہ ہیں ۔ بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ
نہ صرف علومِ جدیدہ کے لحاظ سے بلکہ انسانی زندگی کا
کوئی پہلو ، اور اچھا پہلو ، ایسا نہیں ہے جس پر اسلام
نے بے انتہا روح پرور اثر نہ ڈالا ہو ۔''

☆ ☆ ☆

۷۰

مسز سروجنی نائیڈو

مسز سروجنی نائیڈو کا ہندوستان کے علمی و ادبی اور سیاسی حلقوں میں جو مقام ہے وہ سب پر روشن ہے۔ وہ ہندوستان کے ادبی حلقوں میں ''بلبلِ ہند'' کے لقب سے یاد کی جاتی تھیں۔ ۱۹۲۷ع میں راقم کو علامہ اقبال کے ساتھ شملہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ہم لوگ وہاں سر فیروز خاں نون کے مہمان کی حیثیت سے ان کی کوٹھی ''گڈول'' میں ٹھہرے تھے۔ ایک دن سر فیروز خاں نون نے پنجاب کے لاٹ صاحب سر برڈوڈ کو اپنی کوٹھی میں ٹینس کھیلنے کی دعوت دی اور انھیں بتایا کہ علامہ اقبال بھی میرے ہاں مقیم ہیں اور ان سے بھی آپ کی ملاقات کراؤں گا۔ جب علامہ کو اس بات کا علم ہوا تو ملاقات کے اس تکلف سے بچنے کے لیے انھوں نے یہاں سے نکل چلنے کا پروگرام بنایا اور طے پایا کہ ''سمر ہل'' پر سردار امراؤ سنگھ مجیٹھیہ سے ملاقات کی جائے۔ چنانچہ ہم وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور خاصا فاصلہ طے کر کے جب سیسل ہوٹل کے قریب پہنچے تو اتفاقیہ طور پر وہاں مسز سروجنی سے ملاقات ہو گئی۔ علامہ اقبال اور مسز سروجنی نائیڈو کے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات

بہت پرانے تھے اور اب کئی برسوں کے بعد یہ اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی۔ چنانچہ دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور دونوں ایک دوسرے کے علمی و ادبی اور سیاسی مشاغل کے بارے میں بات چیت کرتے رہے ۔ مجھے یاد ہے کہ مسز سروجنی نائیڈو نے اس موقع پر علامہ سے کہا تھا کہ ''مسز جینا (بیگم قائد اعظم محمد علی جناح) بھی آپ سے ملنا چاہتی ہیں ۔ وہ کافی تعلیم یافتہ اور انگریزی ادب کی فاضل ہیں اور آپ سے ملنے کی مشتاق ہیں'' ۔ غرض کہ اس طرح کی باتوں میں خاصا وقت ہو گیا اور ہم ان سے رخصت ہو کر آ گئے ۔

ذیل میں علامہ اقبال کا ایک قطعہ درج کیا جا رہا ہے جو اُنھوں نے مسز سروجنی نائیڈو کی کتاب ''شکستہ پر'' (Broken Wings) کے مطالعے کے بعد کہا تھا۔ یہ اشعار اُنھوں نے مذکورہ کتاب موصول ہونے پر بطورِ رسید مسز سروجنی نائیڈو کو بھیجے تھے ۔ علامہ اقبال کے کسی مجموعۂ کلام میں یہ اشعار مجھے نظر نہیں آئے ۔ لکھنو سے ایک ادبی مجلے ''ذخیرہ'' کے اگست ۱۹۱۷ء کے پرچے میں یہ قطعہ شائع ہوا تھا اور وہیں سے یہاں نقل کیا جا رہا ہے :

''یا رب ! از غارتِ گل بر دلِ نرگس چہ گذشت
دست بے طاقت و چشمِ نگران است او را
شبنم و لالہ و گل اشک نگہ آلودش (؟)
گریہ بر محنتِ خونیں جگران است او را
خیز و پر زن کہ دریں جلوہ گہِ نکہت رنگ
طائرے ہست کہ پرواز گران است او را

محمد اقبال ، لاہور''

مسز سروجنی نائیڈو جب کبھی لاہور آتی تھیں تو عام طور پر پروفیسر مرزا سعید کے ہاں قیام کرتی تھیں ۔ ایک دن علامہ نے برسبیل تذکرہ ظریفانہ انداز میں فرمایا کہ ایک مرتبہ سروجنی نائیڈو سے ملاقات ہوئی تو اس نے دریافت کیا کہ میری غزلیات (Lyrics) کیسی ہیں ؟ میں نے جواب دیا کہ تمھاری چشم ِغزال تمھاری غزلیات سے زیادہ خوبصورت ہیں ۔

سفر ِمدراس سے واپسی پر جب علامہ حیدرآباد دکن پہنچے تو وہاں کی تقاریب سے فراغت کے بعد ایک روز آپ نے سروجنی نائیڈو کے گھر جانے کا ارادہ ظاہر کیا ، مگر معلوم ہوا کہ وہ گھر میں نہیں ہیں اور کانگرس کے سالانہ جلسے میں شرکت کی غرض سے کہیں گئی ہوئی ہیں ۔ تاہم از راہ ِ اخلاق و وضع داری علامہ ان کے گھر گئے اور ان کے شوہر ڈاکٹر نائیڈو اور بچوں سے ملاقات کر کے واپس آ گئے ۔

جب علامہ اقبال کا انتقال ہوا اور یہ خبر حیدرآباد دکن پہنچی تو مسز سروجنی نائیڈو نے علامہ کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا اور وہاں کے ماہوار رسالے ''سب رس'' میں حسب ذیل پیغام شائع کرایا :

''میں اپنے بہترین دوست اقبال کو ہندوستان کی نشأة ثانیہ کا عظیم ترین شاعر سمجھتی ہوں ۔ اس شاعر کے اردو اور فارسی شعری کارنامے ہندوستانی قوم کے رہرو اور رہنما ثابت ہوں گے ۔ اگرچہ اقبال کی نعش کی قیمتی مٹی کو زمین نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے لیکن مرحوم کی زندۂ جاوید دماغی قابلیت ، غیر زوال پذیر نشان ِعظمت کے طور پر ،

دنیا میں ہمیشہ باقی رہے گی ۔ میں مرحوم کے علمی کمالات
اور تحصیلات کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہوں ۔[1]''

مولانا عرشی نے کتاب ''نقوشِ اقبال'' میں لکھا ہے کہ میں ۱۴ اپریل ۱۹۳۵ء کو علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ میرے ساتھ حکیم طالب علی صاحب بھی تھے ۔ ہمارے حاضر ہونے سے پہلے مشہور شاعرہ مسز سروجنی نائیڈو اور میاں بشیر احمد (ہمایوں) بھی موجود تھے اور ان سے انگریزی زبان میں بات چیت ہو رہی تھی ۔ میں نے اس شاعرہ کو پہلی اور آخری بار یہاں دیکھا اور یہ بات بھی پہلی مرتبہ میرے مشاہدے میں آئی کہ علامہ شاعرہ کو رخصت کرنے کے لیے اپنی نشست سے اٹھ کر کوٹھی کے برآمدے تک تشریف لے گئے ۔[2]

۱۹۳۵ء میں انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے کی ایک نشست شام آٹھ بجے شروع ہوئی تھی جس کی صدارت علامہ اقبال نے کی تھی ۔ علامہ اُس زمانے میں انجمن کے صدر بھی تھے ۔ جب علامہ جلسہ گاہ میں تشریف لائے تو نعرہ ہائے تکبیر سے سارا ماحول گونج اُٹھا ۔ اس جلسے میں مسز سروجنی نائیڈو بھی شریک ہوئی تھیں ۔ ''نقوش اقبال'' کا مندرجہ بالا واقعہ بھی غالباً اسی زمانے کا ہے اور مسز سروجنی نے دراصل علامہ کی دعوت پر جلسے میں شرکت کی تھی ۔ جلسے کی یہ نشست بہت پُرلطف تھی جس میں علامہ اقبال نے

۱۔ یادگار اقبال ، لاہور ، ۱۹۴۵ء ، ص ٦ ۔
۲۔ نقوش اقبال ، لاہور ، ۱۹۵٦ء ، ص ۱۵۱ ۔

دوسرے مقررین کی تقاریر اور نظموں کا مختصر سا تجزیہ بھی کیا تھا اور آخر میں صدارتی تقریر فرمائی تھی۔

۱۹۱۹ء میں کانگرس کا سالانہ جلسہ امرتسر میں ہوا تھا۔ ایسا عظیم الشان اجتماع بہت کم دیکھنے میں آیا تھا۔ اس جلسے میں علامہ اقبال اور مسز سروجنی نائیڈو نے بھی شرکت کی تھی اور گاندھی جی بھی آئے ہوئے تھے۔ یہ تحریکِ عدمِ تعاون کا زمانہ تھا اور گاندھی جی ملک میں غیر معمولی اہمیت اور شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اس موقع پر مسز سروجنی نائیڈو نے کوشش کر کے علامہ کو گاندھی جی سے ملنے پر آمادہ کر لیا۔ جب یہ ملاقات اختتام پذیر ہوئی تو وہ گاندھی جی کے متعلق علامہ کے خیالات معلوم کرنے کے لیے بے تاب نظر آنے لگیں۔ ان کا خیال تھا کہ گاندھی جی نے اقبال کو اپنی شخصیت اور علمیت سے بہت متاثر کیا ہوگا اور ان کے متعلق علامہ کے نظریات میں تبدیلی آ گئی ہوگی۔ چنانچہ جوں ہی علامہ نے گاندھی جی کے کمرے سے قدم باہر رکھا، مسز سروجنی لپک کر ان کے پاس پہنچیں اور پوچھا ''کیوں ڈاکٹر صاحب! مہاتما جی کو آپ نے کیسا پایا؟'' علامہ کی حسِ مذاح ایسے ہی مواقع پر اپنے جوہر دکھاتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی طاری کر کے جواب دیا: گاندھی جی اچھے آدمی ہیں۔ کھانے پینے میں احتیاط کرتے ہیں اور تندرست رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی عمر کے اعتبار سے توانا ہیں۔'' سروجنی کو اس جواب کی توقع نہ تھی لہٰذا بہت بھنّائیں اور کہنے لگیں کہ میں نے تو ایک بڑے آدمی کے متعلق ایک بڑے آدمی کی رائے معلوم کرنی چاہی تھی مگر آپ نے میری بات مذاق میں اڑا دی۔ ڈاکٹر صاحب بولے

''سروجنی ! گاندھی کے متعلق میری رائے یہی ہے جو میں نے آپ کو بتا دی ہے ، اور یہ میری آخری رائے ہے ۔ اس سے زیادہ اور کیا کہوں ۔'' یہ جواب اور بھی مایوس کن تھا ۔ چنانچہ مسز نائیڈو خاموش ہوگئیں اور بات یہیں ختم ہو گئی ۔

۷۱

محمد عباس علی لمعہ

"اقبال نامہ" حصہ اول (۲۶۴ - ۲۹۸) میں ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ کے نام علامہ اقبال کے اُنتیس خطوط ملتے ہیں - پہلا خط اپریل ۱۹۲۹ع کا لکھا ہوا ہے اور آخری ، جس میں علامہ کی طرف سے معذرت کی گئی ہے اور جو محمد شفیع (م - ش) کے قلم سے ہے ، ۳۱ اگست ۱۹۳۷ع کا ہے - میرا خیال ہے کہ اس زمانے (۱۹۲۹ع) سے بھی بہت پہلے یہ شخص علامہ کے ساتھ خط و کتابت کرتا رہا ہے اور میرے نقطۂ نظر سے سابقہ خطوط میسر نہیں آئے - مجھے بھی علامہ کی خدمت میں حاضر رہنے کا شرف حاصل تھا اور میں جانتا ہوں کہ علامہ کے ساتھ عباس علی لمعہ کا رابطہ اس زمانے سے بہت پہلے قائم ہو چکا تھا - مجھے علامہ کے ہاں سے لمعہ کی نظموں کا ایک مجموعہ ملا تھا جس پر ۲۲ جنوری ۱۹۲۳ع کی تاریخ درج ہے - اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۲۳ع سے بھی پہلے ان صاحب نے علامہ کے ساتھ مراسلت و مکاتبت شروع کر دی ہوگی - نظموں کا یہ مجموعہ راقم نے اقبال اکیڈمی کے حوالے کر دیا تھا جو اب بھی وہاں موجود ہے - اس میں لمعہ نے علامہ کی خدمت میں منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جو اس کے سچے جذبات کا آئینہ دار ہے -

ان اشعار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علامہ کا عاشق تھا اور ان کی مدح و ثنا کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا ۔ چنانچہ خطوط سے پہلے جو رباعی درج ہے وہ بھی لمعہ کے مخلصانہ جذبات کی آئینہ دار ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے :

نذرِ لمعہ بحضورِ اقبال

تو ہے شاہِ جہانِ بے نیازی
ہے عالم گیر تیری نے نوازی
ہیں نازاں تجھ پہ عطّار و سنائی
مریدِ پیرِ رومی ، مردِ غازی

لمعہ نے حضرتِ علامہ کی خدمت میں بعض دوسری کتابوں کے علاوہ قرآن مجید کا ایک نسخہ بھی ارسال کیا تھا جس کے متعلق علامہ نے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کا مطالعہ کروں گا ۔

یکم دسمبر ۱۹۳۴ع کے ایک خط میں علامہ نے اپنی صحت کے بارے میں لمعہ کو اس طرح مطلع کیا :

"حکیم نابینا صاحب دہلی والے علاج کر رہے ہیں ۔ فرق ضرور ہے مگر عام طور پر گفتگو کرنے میں سخت تکلیف ہوتی ہے ۔ جناب کی گراں قدر رائے کا شکریہ ۔"

علامہ نے بھوپال سے بھی ایک خط لمعہ کو لکھا تھا جس میں تحریر فرمایا کہ "آپ کی تازہ نظم پڑھ کر میں بہت خوش ہوا ۔ اس میں اصلاح کی گنجائش نہیں ہے ۔" اس کے علاوہ مولانا روم کو بغور پڑھنے کا مشورہ دیا اور یہ شعر تحریر فرمائے :

نگہدار آنچہ در آبِ و گلِ تست
سرور و سوز و مستی حاصلِ تست

تہی دیدم سبوے این و آں را
مئے باق بہ مینائے دل تست !

۱۱ مئی ۱۹۳۵ع کے خط میں علامہ نے لکھا :

"آپ کے ایما پر ٹیگور میری مزاج پرسی کے لیے لاہور آئے تھے مگر میں لاہور میں موجود نہیں تھا ، اس لیے ملاقات نہیں ہو سکی ۔ اب انھیں مطلع کردیں ۔"

پھر ۷ جولائی ۱۹۳۵ع کے خط میں علامہ نے تحریر فرمایا کہ "ٹیگور آپ سے بے حد خوش ہیں ۔"

ایک خط علامہ نے ڈاکٹر لمعہ کے والد کی مزاج پرسی کے سلسلے میں تحریر فرمایا ہے ۔ ایک میں لمعہ کی چند نظمیں پہنچنے کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علامہ کی مدح میں مسلسل نظمیں لکھتے رہتے تھے اور ان کے کلام کے گرویدہ تھے ۔

۷۲

آل پارٹیز مسلم کانفرنس لاہور

(۱۹۳۲ع)

فروری ۱۹۳۲ع میں لاہور میں ایک شاندار اسلامی اور قومی اجتماع ہوا جس سے ''آل انڈیا مسلم کانفرنس'' اور ''آل انڈیا مسلم یوتھ لیگ کانفرنس'' قائم ہوئی ۔ اس کے انتظامات میاں فیروز الدین خادمِ خلافت کی مخلصانہ سرگرمیوں کی بدولت حد درجہ قابلِ ستائش تھے ۔ اوّل الذکر کانفرنس کے صدرِ استقبالیہ خان بہادر حاجی میاں رحیم بخش صاحب اور صدرِ اجلاس علامہ اقبال تھے ۔ آخرالذکر کے صدرِ استقبالیہ سید مبارک علی شاہ تھے اور صدرِ جلسہ سیٹھ عبداللہ ہارون سندھی تھے ۔ اقبال کا خطبہ انگریزی زبان میں تھا جو پہلے طبع ہو چکا تھا ۔ اب اس کا ترجمہ بھی اخبارات میں شائع ہو چکا ہے ۔ اس خطبے میں ڈاکٹر صاحب نے زیادہ تر ہنگامی نوعیت کے مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے اور اپنے اس نقطۂ نظر کو ایک مرتبہ پھر دہرایا ہے جس کا اظہار وہ الہ آباد میں مسلم لیگ کے جلسے میں کر چکے تھے ؛ یعنی یہ کہ ہندوستان کے شمال مغربی صوبوں اور مشرقی بنگال میں ، جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں ، ایک آزاد اور خود مختار مملکت قائم ہونی چاہیے ۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے بعض ایسے مسائل

پر بھی اظہار خیال کیا ہے جو پورے مسلم معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں : مثلاً انھوں نے علما کی بے عملی اور تعلیم یافتہ طبقے کی غفلت کا ذکر کیا اور فقہ اسلامی کو جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق مدوّن کرنے کی ضرورت پر زور دیا ۔ ملّتِ اسلامیہ کے اتحاد اور تنظیم کی اہمیت و ضرورت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے مسلمان قوم کو متنبّہ فرمایا کہ اگر تم سربلندی اور عروج کے خواہاں ہو تو ایک منظم قوم کی صفات اپنے اندر پیدا کرو کیونکہ ایک متحد قوم ہی اقوامِ عالم میں سربلندی حاصل کر سکتی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ خطبہ بھی ان کے دوسرے خطبات کی طرح اس قابل ہے کہ اسے بار بار مسلمان قوم تک پہنچایا جائے ۔

یوتھ لیگ کانفرنس نہایت کامیاب رہی ۔ صدر جلسہ سیٹھ عبداللہ ہارون ایک نہایت مخلص ، دردمند اور احساسِ قومی رکھنے والے بزرگ تھے ۔ انھوں نے مسلمان نوجوانوں کے دلوں کو قومی خدمت کے جذبے سے سرشار کر دیا اور لیگ کی فیاضانہ امداد فرمائی ۔ اس جلسے کے سیکرٹری چودھری نذیر احمد خاں ایڈووکیٹ تھے ۔ وہ خود علامہ کو ان کے گھر سے موٹر میں لائے تھے اور خطبہ پڑھنے کے بعد ان کے دولت کدے پر چھوڑ آئے تھے ۔

☆ ☆ ☆

۷۳

ادارۂ معارفِ اسلامیہ

ادارۂ معارفِ اسلامیہ کے بانی علامہ اقبال خود ہی تھے - ۱۹۳۳ء میں اس ادارے کی ابتدا ہوئی اور اس کے تین اجلاس ۱۹۳۳ء ، ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۸ء میں ہوئے - پہلا اجلاس لاہور میں اور آخری دہلی میں منعقد ہوا تھا - پہلے اجلاس کی صدارت علامہ اقبال نے خود فرمائی تھی اور انگریزی زبان میں خطبہ بھی پڑھا تھا - تینوں جلسوں کی مطبوعہ روئداد راقم کے پاس موجود ہے جو ادارے کے سیکرٹری شیخ محمد اقبال پروفیسر پنجاب یونیورسٹی اوریئنٹل کالج لاہور کی مرتب کردہ ہے - یہ روئداد ساڑھے سترہ سو صفحات پر مشتمل ہے جو پروفیسر صاحب موصوف ہی کی کوشش سے طبع ہو کر منظرِ عام پر آئی تھی اور احباب تک پہنچی تھی -

اس ادارے کی ابتدا اور اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر محمد اقبال مرحوم نے لکھا ہے کہ ۱۹۲۸ء میں جو آل انڈیا اوریئنٹل کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تھی ، اس کے شعبۂ عربی و فارسی کے صدر علامہ اقبال تھے - آپ کو اس کانفرنس میں شریک ہو کر علوم کے حقائق کے ضمن میں جو تجربہ ہوا اس نے آپ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اسلامی علوم و معارف کے ضمن میں بھی

ایک ادارہ قائم کیا جائے ۔ چنانچہ آپ نے پروفیسر محمد شفیع ، پروفیسر شیخ محمد اقبال اور پروفیسر محمود شیرانی کے ساتھ اپنے مکان پر مشورہ کیا اور مالی مشکلات کے باوجود اس ادارے کے قیام کا فیصلہ ہو گیا ۔ پروفیسر سید عبد اللہ نے علامہ اقبال اور دیگر احباب کے مشورے سے اس کے اغراض و مقاصد قلم بند کیے اور "ادارۂ معارف اسلامیہ" نام تجویز ہوا ۔

۱۹۲۸ع کے آخر میں جب علامہ اقبال مدراس تشریف لے گئے اور واپسی پر حیدر آباد میں ٹھہرے تو وہاں سر اکبر حیدری سے بھی اس ادارے کے سلسلے میں مشورہ کیا اور انھیں اغراض و مقاصد کا کتابچہ دکھایا ۔ مقصد یہ تھا کہ سرکارِ نظام کو اس ادارے کی افادیت پر متوجہ کرکے ان سے مالی امداد کی درخواست کی جائے ۔ چنانچہ تمام مراحل طے ہونے کے بعد ۱۹۳۲ع میں دو ہزار روپے کی امداد منظور ہوئی ۔ پروفیسر محمد شفیع چونکہ اس کام میں پیش پیش تھے لہٰذا جب رقم وصول ہو گئی تو علامہ نے ساری رقم ان کے سپرد کردی اور فرمایا کہ کام شروع کر دو ۔ چنانچہ ۱۹۳۳ع میں پہلا اجلاس منعقد ہوا ۔

چونکہ علامہ اقبال خود اس ادارے کے بانی تھے لہٰذا جلسے کی صدارت بھی انھیں قبول کرنا پڑی ۔ صدرِ جلسہ کی حیثیت سے انھوں نے انگریزی زبان میں جو خطبہ پڑھا تھا ، بد قسمتی سے وہ محفوظ نہیں رہ سکا ۔ تاہم مجھے یاد ہے علامہ نے اس خطبے میں قدیم اور جدید علوم پر بہت عمدگی سے روشنی ڈالی تھی اور مسلمان علما کے علمی کارناموں کو جدید علوم کا پیش رو ثابت کیا تھا ۔ قبل ازیں مولانا

سید سلیمان ندوی نے تاج محل پر ایک طویل مقالہ پڑھا تھا جس میں راقم کے تحقیقی کام کا ذکر بھی انھوں فرمایا تھا ۔ بہرحال اس جلسے کی تمام تقاریر پُر مغز اور بلند پایہ تھیں ۔ جلسے کی روئداد میں وہ یادگار تصویر بھی چھپ چکی ہے جس میں علامہ اقبال درمیان میں تشریف فرما ہیں ۔ سید سلیمان ندوی اور دیگر اہلِ علم بھی اس تصویر میں موجود ہیں ۔

۱۹۳۶ع میں اس ادارے کا دوسرا اجلاس بھی لاہور میں منعقد ہوا جس کی صدارت میاں فضل حسین نے کی اور ایک پُر مغز خطبۂ صدارت پڑھا ۔ علامہ عبداللہ یوسف علی ، جو ادارے کے صدر تھے ، انھوں نے انگریزی زبان میں مقالہ پڑھا تھا ۔ اس کے بعد جن مقررین کے نام نظر آتے ہیں ان میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی ، مولوی عبدالرحمٰن دہلوی اور اسلم جیراجپوری شامل ہیں ۔ علامہ اقبال کی علمی خدمات کو بے حد سراہا گیا تھا اور اس ادارے کو قائم رکھنے کے سلسلے میں انھیں ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا گیا تھا ۔

مذکورہ جلسوں کے موقع پر ایک نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا تھا جس میں اسلامی عہد کے مسکوکات کے علاوہ علوم اسلامی سے متعلق مخطوطات اور کتبات بھی رکھے گئے تھے جنھیں بے حد پسند کیا گیا تھا ۔

اس ادارے کا تیسرا جلسہ ۱۹۳۸ع میں دہلی میں منعقد ہوا جس کی صدارت سید شاہ سلیمان چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ نے کی تھی ۔ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں علامہ اقبال اور میاں فضل حسین کی رحلت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے ان کی وفات کو ایک بہت بڑا قومی سانحہ قرار دیا تھا ۔ صدر استقبالیہ ڈاکٹر سر عبدالرحمٰن (وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی) کے علاوہ ایرانی کونسل

نے بھی اس جلسے میں ایک مقالہ پڑھا تھا ۔ اس جلسے کے انتظام میں دہلی کے اینگلو عربیک کالج کے لوگوں نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا تھا اور اسے کامیاب بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی -

☆ ☆ ☆

۷۴

علی برادران اور علامہ اقبال

۱۹۱۹ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں بہت ہی پُرآشوب سال تھا ۔ جو کچھ مفکرین نے اس سال کے مختلف پہلوؤں پر لکھا ہے اس میں زیادہ تر ہندو نقطۂ نگاہ کو مدِ نظر رکھا گیا ہے ۔ میں دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے ریلوے سٹیشن پر موجود تھا جب یہ دونوں بھائی (مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی) بردولی سے رہا ہوکر آئے تھے ۔ وہاں اس قدر ہجوم تھا جو پہلے بہت کم دیکھنے میں آیا تھا ۔ لوگوں میں بے پناہ قومی جذبہ تھا اور زیادہ تر لوگ جلیانوالا باغ دیکھنے کے لیے آئے تھے جہاں سالِ گذشتہ ہندوستانیوں پر جنرل ڈائر نے گولیاں برسائی تھیں اور ہزاروں بےگناہ لوگ ، جو وہاں جلسے میں شریک تھے ، شہید ہوگئے تھے ۔ ۱۹۱۹ء کے جلسۂ کانگرس کی صدارت پنڈت موتی لال نہرو نے کی تھی جو جواہر لال نہرو کے والد تھے ۔ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی بھی اسی جلسے میں شرکت کے لیے آئے تھے ۔ ہندوستان کی تمام اطراف سے لوگوں نے اس جلسے میں شرکت کی تھی ۔ اس جلسے کے فوراً بعد امرتسر کے چوک فرید میں مسلم لیگ کا جلسہ بھی ہوا تھا جو اگرچہ کانگرس کے جلسے کے مقابلے کا تو نہیں تھا مگر ان دونوں بھائیوں

(شوکت علی اور محمد علی) کی وجہ سے کافی رونق تھی - حکیم اجمل خان اس جلسے کے صدر تھے -

کارروائی ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ علی برادران کی آمد کا اعلان ہوا جس سے جلسے میں مزید جان پڑ گئی - پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد جب علامہ اقبال مع اپنے احباب نواب ذوالفقار علی خاں ، میاں عبدالعزیز اور میاں عبدالحی وغیرہ کے ہال میں داخل ہوئے تو جلسے کا رنگ ہی بدل گیا - ان حضرات کو پلیٹ فارم پر جگہ دی گئی - علامہ اقبال نے اس موقع پر ان دونوں بھائیوں کی طرف اشارہ کر کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے تھے :

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے ، اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دامِ قفس سے بہرہ مند
''شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند''

امرتسر کے ان جلسوں کے بعد مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی لاہور بھی آئے تھے - لاہور سے کافی لوگ ان کو لینے کے لیے امرتسر گئے تھے - ان کا جلوس لاہور ریلوے سٹیشن سے شروع ہوا جو کشمیری بازار سے ہوتا ہوا تمام بڑے بڑے بازاروں میں گھوما - نماز عصر کے وقت یہ جلوس انارکلی بازار میں تھا - جب عین اقبال کے مکان کے سامنے جلوس پہنچا تو یہ دونوں بھائی اور ان

کے رفقا اقبال کے مکان پر چلے گئے جہاں انھوں نے فریضۂ نماز ادا کیا ۔ ساتھ ہی علامہ سے حالاتِ حاضرہ پر گفتگو بھی ہوئی ۔ ہر دو بھائیوں نے علامہ سے کہا کہ ہم تو جیل کی مصیبت جھیلتے ہیں اور آپ کا کلام اس سلسلے میں مہمیز کا کام کرتا ہے مگر آپ ہیں کہ اپنی جگہ سے ہلتے ہی نہیں ۔ علامہ مسکرا دیے اور فرمایا کہ مولانا ! "ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است" ۔ یہ دونوں بھائی چونکہ کانگرسی نقطۂ نگاہ کے حامی تھے اس لیے علامہ اقبال ان کے سیاسی نظریات سے متفق نہیں تھے ۔

مولانا محمد علی ایک مرتبہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ علامہ کے ہاں مہمان رہے تھے ۔ یہ زمانہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے پہلے کا تھا ۔ اسی زمانے میں علامہ نے کوشش کی تھی کہ جداگانہ انتخابات رائج ہوں اور اس سلسلے میں اسلامیہ کالج کے ہال میں ایک جلسہ بھی ہوا تھا ۔

ایک دن علامہ کے احباب میں جداگانہ انتخاب کے حق میں گفتگو ہو رہی تھی ۔ مولانا محمد علی اندر تھے ۔ یہ گفتگو سن کر انھوں نے چلا" کر کہا تھا کہ مخلوط انتخاب تم کو کاٹتا ہے ؟ اس زمانے میں وہ ذیابیطس کے مریض تھے ۔ وہ اکثر گاندھی جی کی مدح کیا کرتے تھے مگر جب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی تو یہ دونوں بھائی کانگرس کو چھوڑ کر علامہ اقبال کے ہمنوا بن گئے ۔ ہم راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے تحت بیان کر چکے ہیں کہ مولانا محمد علی کا انتقال اسی موقع پر لنڈن میں ہوا تھا اور انھیں بیت المقدس (فلسطین) میں دفن کیا گیا تھا ۔

۱۹۲۴ع میں جب حجاز پر ابنِ سعود کا قبضہ ہو گیا تھا اور شریفِ مکہ نے امرتسر میں ایک کانفرنس کی تھی تو مولانا محمد علی اور شوکت علی کے تیسرے بھائی ذوالفقار علی نے بھی قادیان سے آ کر اس کانفرنس میں شرکت کی تھی - تینوں بھائی عرصے کے بعد ملے تھے - اخیر میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے -

۷۵

اسلامی ممالک اور علامہ اقبال

افغانستان :

ہم ان صفحات میں افغانستان میں علامہ کی مقبولیت اور ان کے سفرِ افغانستان کا مفصل حال بیان کر چکے ہیں۔ آپ کو والیِ افغانستان جنرل نادر شاہ نے بطورِ خاص وہاں بلایا تھا اور آپ سید راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی کے ہمراہ وہاں تشریف لے گئے تھے۔ افغانستان کی تعلیمی اصلاحات پر ایک جامع رپورٹ بھی انھوں نے مرتب کی تھی۔

عرب ممالک :

جب آپ ۱۹۳۱ء کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے فارغ ہو کر وطن واپس آ رہے تھے تو آپ نے مصر اور فلسطین کا سفر بھی کیا تھا۔ اس سے پیشتر شیخ الازہر لندن میں علامہ سے مل چکے تھے اور آپ ان کی دعوت پر یہ طے کر چکے تھے کہ واپسی پر مصر آئیں گے اور جامعۂ ازہر کا مشاہدہ کریں گے۔ چنانچہ جب آپ اٹلی سے گزر کر فلسطین جا رہے تھے تو آپ قاہرہ بھی گئے اور جامعۂ ازہر

کا معاینہ کیا - علامہ کی پیشوائی اور انہیں متعارف کرانے میں
وہاں کے ایک پروفیسر الدکتور عبدالوہاب عزام پاشا سب سے
پیش پیش تھے - الدکتور عبدالوہاب عزام ہی نے ایک مفید
کتاب بھی علامہ پر عربی زبان میں بعنوان "محمد اقبال : سیرتہ و
فلسفتہ و شعرہ" ۱۹۵۴ع میں لکھی تھی - جیسا کہ میں کسی اور
جگہ بھی بیان کر چکا ہوں ، یہ صاحب حکومتِ مصر کی طرف سے
پاکستان میں سفیر بھی رہ چکے تھے - یہ کتاب بڑے سائز پر انہوں نے
پاکستان میں ہی شائع کی تھی - اسی کتاب نے اقبال کو عربُ دنیا
سے روشناس کرایا جو بہت بڑا کارنامہ ہے - ڈاکٹر عبدالوہاب عزام
نے اقبال پر بعض مفید مضامین مجلہ ''السبوعہ'' قاہرہ میں لکھے جو
دنیائے عرب میں اقبال کی شہرت کا باعث بنے - اس کے بعد ڈاکٹر
عبدالوہاب عزام پاشا نے ''پیامِ مشرق'' کا عربی نظم میں ترجمہ
کیا کیونکہ وہ فارسی زبان کے بھی بہت بڑے فاضل تھے - اس کتاب
کا آخری شعر یہ ہے :

ادرک الناس بحب و وئـام
انک الـداعی الی دارالسلام

ایران :

ویسے تو علامہ اقبال تمام اسلامی ممالک میں مقبول تھے مگر
ایران میں ان کے بہت زیادہ پرستار تھے - خود علامہ کو فارسی
زبان سے جو تعلقِ خاطر تھا اور جس طرح انہوں نے فارسی کو اظہارِ
جذبات کا ذریعہ بنایا اس نے اور بھی اہلِ ایران کو متاثر کیا -
میرے نزدیک ایران میں علامہ اقبال کی مقبولیت کا آغاز اس وقت
ہوا جب ن - م - راشد کی تحریک پر تہران کے عجائب گھر میں

اقبال پر ایک ادبی نشست کا انتظام کیا گیا ۔ اس اجلاس میں ملک الشعرا بہار نے بھی شرکت فرمائی تھی ۔ انہوں نے اپنی ایک نظم کا آغاز غیر منقسم ہندوستان کی ادبی خدمات سے کیا ۔ ہندوستان کے دیگر فارسی‌گو شعرا کا ذکر کرنے کے بعد جب وہ عہدِ اقبال تک پہنچے تو انہوں نے کلامِ اقبال کے حُسن اور اس کی گہرائی و عظمت کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا :

عصرِ حاضر خاصۂ اقبال گشت
واحدی کز صد ہزاران برگذشت
شاعران گشتند جیش مور و مار
ویں مبارز کرد کارِ صد ہزار

ملک الشعرا بہار کے اس خراجِ تحسین کے زیر اثر ایرانی ادبیات میں اقبال شناسی یا معرفتِ اقبال کا ایک نیا دور شروع ہو گیا اور اہلِ ایران نے غالباً پہلی مرتبہ کلامِ اقبال کو اپنی سنجیدہ توجہ کا مستحق قرار دیا ۔ یہ واقعہ ہے کہ اقبال نے برعظیم ہند و پاکستان میں فارسی زبان کو ایک نئی زندگی دی ۔ فرنگیوں کے ہاتھوں اس زبان کو اس قدر صدمات سے دو چار ہونا پڑا کہ باید و شاید ۔ صدہا سال تک برعظیم پر حکومت کرنے والی اس زبان کا نام و نشان تک مٹانے کی کوشش کی گئی اور اسے قعرِ گمنامی میں دھکیل دیا گیا ۔ یہ اقبال ہی تھے جنھوں نے اس زبان کو اپنے عظیم خیالات کے لیے ذریعۂ اظہار بنا کر اس کا کھویا ہوا وقار بحال کیا ۔ آج حکومتِ ایران کے ہزاروں نمایندوں اور لاکھوں کروڑوں کے سرمائے کو برعظیم میں فارسی زبان کے احیا کے سلسلے میں وہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی جو اکیلے اقبال کو حاصل ہوئی ۔

مارچ ۱۹۷۳ء میں اوریئنٹل کالج لاہور کا سو سالہ جشنِ تاسیس منایا گیا جس میں عالمی شہرت کے مالک ماہرینِ تعلیم نے شرکت کی ۔ حکومتِ ایران کی طرف سے معروف ایرانی عالم اور محقق پروفیسر مجتبیٰ مینوی نے اس جشن میں حصہ لیا تھا ۔ اس موقع پر کالجِ مذکور کے فارسی کے استاد سید محمد اکرم شاہ نے ان سے درخواست کی تھی کہ ایرانی لہجے میں اقبال کا کلام سنائیں ۔ چنانچہ انھوں نے ''زبورِ عجم'' کی مشہور نظم ''از خوابِ گران خیز'' سنائی جس سے محفل پر عجیب سرشاری کی کیفیت طاری ہو گئی ۔ انھوں نے یوں اس نظم کو شروع کیا :

ای غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگران خیز
کاشانہ ای ما رفت بتاراجِ غمان ، خیز
از نالہ ای مرغِ چمن ، از بانگِ اذان خیز
از گرمیِ ہنگامہ ای آتش نفسان خیز

اور ان شعروں پر نظم کو ختم کیا :

فریاد ز افرنگ و دل آویزیِ افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزیِ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیِ افرنگ
معمارِ حرم ! باز بہ تعمیرِ جہان خیز
از خواب گران خواب گران خواب گران خیز

اب ایران میں کلامِ اقبال کی مقبولیت روز بروز بڑھ رہی ہے ۔ حال ہی میں کلیاتِ اقبال طہران سے دوبارہ شائع ہوئی ہے اور اقبال پر متعدد تحقیقی مقالات بھی شائع ہو چکے ہیں ۔ پروفیسر مجتبیٰ مینوی

کی معروف کتاب "اقبال لاھوری" نے اقبال کو اہلِ ایران سے متعارف کرانے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا اور ہم ان کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے ۔

۱۹۳۶ء میں راقم اعلٰی تعلیم کی غرض سے پیرس میں مقیم تھا کہ ایک ایرانی نوجوان ڈاکٹر غلام حسین صدیقی سے ملاقات ہوئی ۔ یہ صاحب اقبال کے غائبانہ عقیدت مند تھے اور اکثر کلامِ اقبال پر اور علامہ کی سیرت و شخصیت پر گفتگو کیا کرتے تھے ۔ انھوں نے احمد حمدی برجندی کی کتاب پر ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا تھا اور فرانسیسی زبان میں ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی ۔

لاہور میں بعض ایرانی فضلا سے علامہ کے بہت اچھے مراسم تھے ۔ ان میں مولانا محسن علی سبزواری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو محلہ چہل بیبیاں میں رہائش رکھتے تھے ۔ اسی طرح ابتدائی زمانے میں ایران کے معروف شیعہ عالم اور مجتہد علامہ عبد العلی ہروی کے ساتھ بھی علامہ کے بہت قریبی دوستانہ تعلقات تھے ۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء کے برسوں میں علامہ اکثر ان کے ہاں جاتے تھے اور وہ بھی علامہ کے پاس آیا کرتے تھے ۔ وہ نواب فتح علی خاں قزلباش کے ہاں ایمپرس روڈ پر مقیم تھے ۔ علامہ کو اکثر اپنے ہاں چائے پر بلاتے تھے اور نہایت لذیذ چائے پلاتے تھے ۔ ایک مرتبہ راقم بھی علامہ کے ہمراہ ان کی قیام گاہ پر گیا تھا ۔ دونوں حضرات میں فارسی زبان میں گفتگو ہوتی تھی اور اکثر مختلف فیہ مسائل زیر بحث آتے تھے ۔ علامہ عبد العلی ہروی بڑے بلند پایہ شیعہ عالمِ دین تھے اور انھیں فارسی ادب سے بھی دلچسپی تھی ۔ علامہ کی خواہش تھی کہ وہ حیدرآباد دکن میں کوئی اعلٰی عہدہ قبول کر لیں مگر یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی ۔

طہران کے دینی ادارے ''حسینیہ ارشاد'' کے ارکان کو علامہ اقبال سے غیر معمولی عقیدت تھی ۔ انھوں نے علامہ کی مشہور مثنوی ''اسرار خودی'' میں سے منقبت ِ حضرت ِ امام حسین کو اپنے ایک رسالے میں بطور ِ ضمیمہ شامل کیا تھا اور ادارے کی مسجد کی چھت کو اقبال کے اشعار سے مزیّن کیا تھا ۔ اسی ادارے نے ۱۹۶۸ع میں اقبال کے ترانۂ ملّی کا منظوم ترجمہ کرکے عربی اور فارسی کے ترانوں کے ایک مجموعے میں شائع کیا تھا ۔ یہ کتابچہ ۶۵ صفحات پر مشتمل تھا اور ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہوا تھا ۔ ۱۹۷۰ع میں ''حسینیہ ارشاد'' نے علامہ اقبال پر ایک علمی مجلس کا انتظام کیا تھا اور ۱۹۷۳ع میں اس مجلس کے مقالات کا مجموعہ شائع کیا تھا جو ۱۶۰ صفحات پر مشتمل تھا ۔ حاجی سید ابو الفضل زنجانی مجتہد اس مجلس کے صدر تھے ۔ پروفیسر ڈاکٹر سید جعفر شہیدی نے بر عظیم میں اسلام کے پائدار اثرات پر تقریر کی تھی اور ڈاکٹر شیر علی نے ''احیائے فکر ِ اسلامی'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا تھا ۔ سید محمد محیط طباطبائی نے ، جو ایران میں ''زبدۂ اقبال شناسان'' سمجھے جاتے ہیں ، اقبال کی ایران شناسی کے مختلف مراحل پر روشنی ڈالی تھی ۔

خواجہ عبد الحمید عرفانی کی کتاب ''اقبال ــ ایرانیوں کی نظر میں'' ایک قابل قدر تصنیف ہے جس میں علامہ اقبال کے فلسفے ، تفکّر اور ان کی شاعری کے سلسلے میں اہل ِ ایران کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ یہاں ڈاکٹر تحقیق کے مقالے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جس نے اقبال شناسی کے ضمن میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے ۔ سید غلام رضا سعیدی نے علامہ اقبال کے اسلامی تفکّر کو فہم ِ قرآن ِ کریم کے سلسلے میں ایک تحریک قرار دیا ہے ۔

ڈاکٹر محمد ریاض نے رسالہ "فکر و نظر" میں ایک مفید مضمون ''ایران میں مطالعۂ اقبال'' کے نام سے سپرد قلم کیا ہے جس میں ایران میں اقبال اور فکرِ اقبال کی مقبولیت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مضمون رسالۂ ''فکر و نظر'' کے اپریل ۱۹۷۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

آخر میں مجلۂ ''آتش'' کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں متعدد ایرانی فضلا نے اقبال کے فکر و فلسفہ پر تحقیقی اور علمی مضامین لکھے ہیں اور انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ یہ مضامین رسالۂ مذکور کی ۱۳۳۰ کی اشاعت میں شامل ہیں۔

ترکی :

ایک دفعہ میں نے علامہ سے ذکر کیا کہ لپزگ (جرمنی) کے ایک کتب فروش آٹو ہیر سووٹس کے پاس سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کا دیوان موجود ہے۔ یہ سنتے ہی انھوں نے مجھے حکم دیا کہ یہ دیوان ہر قیمت پر حاصل کیا جائے۔ چنانچہ میں مذکورہ کتب فروش کی دکان پر گیا اور دیوان اس سے لے کر علامہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہ دیوان ترکی زبان میں تھا اور علامہ اس زبان سے واقف نہ تھے، تاہم وہ شاعر کے خیالات پڑھنے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ وہ دراصل یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ایک سپاہی شہنشاہ کا کلام کس پایے کا ہے اور اس کے خیالات اور فکر کی گہرائی کی کیفیت کیا ہے؟ مگر جب کسی نہ کسی طرح وہ دیوان کے مطالب سے آگاہ ہوئے تو یہ کلام انھیں قطعاً متاثر نہ کر سکا۔ یہ دیوان آخر تک علامہ کے کتب خانے میں رہا اور اب بھی اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

جب علامہ نے اپنے شہرۂ آفاق خطباتِ مدراس لکھنا شروع کیے تو اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں جہاں انھوں نے اور بہت سے علما و شعرا کے کلام کا حوالہ دیا وہاں اپنے پہلے خطبے (علم اور مذہبی تجربہ) میں ترکی کے معروف شاعر توفیق فطرت کے کلام سے بھی استشہاد کیا اور اس کا تقابل میرزا بیدل کے فکر و فلسفہ سے کیا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ کی نظر کس قدر وسیع تھی اور وہ کہاں کہاں سے علم کے موتی تلاش کر لیتے تھے۔ علامہ اہلِ ترکیہ کی عظمت اور ان کی بہادری کے شروع ہی سے معترف تھے اور انھیں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

آج اگرچہ ترکی زبان ہمارے لیے اجنبی اور غیر مانوس ہے مگر ایک وقت تھا کہ برعظیم میں یہی زبان مقتدر تھی۔ ترکی سے اپنی اسی ناواقفیت کی بنا پر آج ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ترکی میں علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ پر کیا کام ہوا ہے اور فکر اقبال کی مقبولیت کا وہاں کیا عالم ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ وہاں کلام اقبال کے تراجم بھی شائع ہوئے ہیں اور ان کی شخصیت و شاعری پر تحقیقی کام بھی ہوا ہے مگر ہم اس کی کمیت اور کیفیت کے مکمل کوائف سے آگاہ نہیں ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقادر کراخان ترکی کے معروف اہلِ علم ہیں اور فکرِ اقبال میں ان کی دلچسپی سے سبھی اہلِ علم واقف ہیں۔ انھوں نے علامہ اقبال کی شخصیت اور فن پر جو شاندار کتاب لکھی ہے اس نے ترکیہ میں علامہ کو متعارف کرانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اس میں نہ صرف انھوں نے اقبال کے فلسفے اور کلام پر عالمانہ تبصرہ کیا ہے بلکہ آخر میں کلام کا کچھ حصہ ترکی زبان میں

ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ ۲۳۰ صفحات کی یہ کتاب استنبول سے شائع ہوئی تھی۔

کچھ عرصہ پہلے سید سجاد حیدر کے ایک خط سے معلوم ہوا تھا کہ خلیل آفندی نے بھی علامہ کے کلام کا کچھ حصہ ترکی زبان میں ترجمہ کیا ہے مگر اس ضمن میں ہماری معلومات ابھی تک تشنہ ہیں۔

۷۶

جامعۂ ملّیہ میں خطبۂ صدارت

میں ''پیامِ مشرق'' کی اشاعتِ ثانی کے تحت لکھ چکا ہوں کہ ۱۹۲۳ء میں جامعۂ ملّیہ دہلی کے اساتذہ ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب اور پروفیسر غلام السیّدین جب لاہور آئے تھے تو وہ علامہ اقبال سے بھی ملے تھے اور انھوں نے ''پیامِ مشرق'' کا دوسرا ایڈیشن شایانِ شان طریقے پر شائع کرنے کی پیشکش کی تھی۔ دراصل علامہ سے ان لوگوں کے گہرے روابط تھے اور وہ ان کے علمی کمالات کے دل سے معترف تھے۔

۱۹۳۳ء میں جامعۂ ملّیہ نے توسیعی لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس میں دیگر اہلِ علم کے علاوہ ترکی کے معروف فاضل غازی رؤف بے نے بھی شرکت کی تھی جو پیرس سے دہلی تشریف لائے تھے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر انصاری امیرِ جامعہ تھے اور انھوں نے بطورِ خاص علامہ اقبال سے دہلی تشریف لانے اور کم سے کم دو لیکچروں کی صدارت قبول کرنے کی درخواست کی تھی۔ مارچ ۱۹۳۳ء کا مہینہ ان لیکچرز کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ علامہ نے بخوشی یہ دعوت قبول فرمالی اور ۱۷ مارچ کو لاہور سے دہلی روانہ ہوگئے۔ سیّد نذیر نیازی بھی اس سفر میں آپ کے ہمراہ تھے۔

جب آپ دہلی پہنچے تو بہت سے زعما اور اہلِ علم ریلوے سٹیشن پر آپ کے خیر مقدم کے لیے موجود تھے ۔ ان میں ڈاکٹر انصاری ، ڈاکٹر ذاکر حسین اور غازی رؤف بے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ طے یہ پایا تھا کہ ان لیکچروں کا آغاز غازی رؤف کے خطبات سے کیا جائے اور علامہ ان کے دونوں لیکچروں کی صدارت فرمائیں ۔

اسی شام محمد علی ہال میں غازی رؤف بے کے پہلے لیکچر سے اس سلسلے کا آغاز ہوا اور شیخ الجامعہ ڈاکٹر انصاری نے جلسے کا افتتاح کیا ۔ جب علامہ ہال میں داخل ہوئے تو نہایت جوش و خروش سے ان کا خیرمقدم کیا گیا ۔ ڈاکٹر انصاری نے اپنے کلماتِ افتتاحیہ میں غازی رؤف بے اور علامہ اقبال کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے ان جلسوں کے لیے وقت نکالا اور اپنے بلندپایہ خیالات سے نوازا ۔ اس کے بعد جلسہ شروع ہوا اور غازی رؤف بے نے اپنا خطبہ پڑھا ۔ پھر علامہ سے درخواست کی گئی کہ وہ خطبۂ صدارت ارشاد فرمائیں ۔ علامہ کی یہ تقریر خاصی طویل تھی جو کم و بیش ایک گھنٹے تک جاری رہی ۔ علامہ نے اپنی تقریر میں عالمِ اسلام کی تازہ بیداری کا تذکرہ چھیڑا اور ترکی کے انقلاب کو موضوعِ گفتگو بنایا ۔ پھر مسئلۂ جہاد ، مسئلۂ خلافت اور اتحاد بین المسلمین پر نہایت بلند پایہ اور مدلّل تقریر کی ۔ علامہ کا یہ خطبۂ صدارت انگریزی زبان میں تھا جسے پڑھے لکھے سامعین نے بے حد پسند کیا اور انھیں دل کھول کر داد دی ۔ تاہم مجمع میں ایسے لوگ بھی تھے جو اس تقریر کو سمجھنے سے قاصر تھے اور وہی لوگ نامطمئن گئے ۔ علامہ نے اپنی

تقریر کو ان اشعار پر ختم کیا :

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
راز خدائی ہے یہ ، کہہ نہیں سکتی زباں

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

جلسے کے اختتام پر لوگ علامہ سے لپٹ گئے اور ان کے ہاتھوں کو بوسے دے کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔

علامہ نے پروگرام کے مطابق غازی رؤف بے کے دوسرے لیکچر کی صدارت بھی کی تھی مگر اس موقعے پر آپ نے کوئی خطبۂ صدارت ارشاد نہیں فرمایا۔ غازی رؤف بے کے اس خطبے کا موضوع ''جنگِ عظیم'' تھا۔

جب تک علامہ جامعۂ ملّیہ کے مہمان کی حیثیت سے دہلی میں مقیم رہے ، ان کے اردگرد معتقدین اور اہلِ علم کی خوب چہل پہل رہتی تھی۔ جب آپ رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر انصاری نے آپ کا بے حد شکریہ ادا کیا اور درخواست کی کہ جامعۂ ملّیہ آپ کی مزید توجہ اور التفات کا مستحق ہے۔ کتنا اچھا ہو کہ آپ پھر بھی تشریف لائیں اور اس ادارے کے اساتذہ اور طلبہ کو اپنے ارشاداتِ عالیہ سے مستفیض فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے وعدہ کر لیا اور ۵۔ اپریل ۱۹۳۳ء کو ایک مرتبہ پھر جامعہ ملّیہ دہلی تشریف لے گئے جہاں آپ نے تقریر بھی کی اور جامعہ کے طلبہ سے ملاقات

بھی فرمائی ۔[1] جامعہ ملیّہ کی ان تقریبات کا ذکر علامہ اپنے احباب کی محفلوں میں اکثر کیا کرتے تھے ۔

☆ ☆ ☆

۱۔ مکتوبات اقبال ، مرتبہ سیّد نذیر نیازی ، مطبوعہ اقبال اکادمی ، صفحات ۹۷ - ۱۱۲ ۔

۷۷

فتویٰ ترکِ موالات

جمعیۃ العلمائے ہند غالباً ۱۹۲۰ع میں قائم ہوئی تھی ۔ اس کے صدر مفتی مولانا کفایت اللہ صاحب تھے اور ناظم مولانا احمد سعید صاحب مقرر ہوئے تھے ۔ کم و بیش پانچ سو جلیل القدر علمائے ہند نے اپنے دستخطوں سے ترکِ موالات کے حق میں فتویٰ صادر کیا تھا ۔ یہ فتویٰ حکومت نے ضبط کر لیا جس کے ردِ عمل میں ایک زبردست ہنگامہ کھڑا ہو گیا ۔ اس فتوے کی بنیاد مندرجہ ذیل آیتِ قرآنی پر تھی جو فوج میں نوکری کرنے والوں کے لیے ایک انتباہ کی حیثیت رکھتی ہے :

"و من یقتل مؤمناً متعمداً فجزاؤہ، جہنم خالداً فیھا غضب اللہ علیہ و لعنہ، و اعدّ لہ، عذاباً عظیماً"۔

ترجمہ : جو کوئی قتل کرے کسی مومن ، یعنی مسلمان کو ، جان کر ، پس سزا اس کی دوزخ ہے ، ہمیشہ رہنے والا ہے بیچ اس کے ۔ اور غضب ہوا اللہ کا اوپر اس کے ، اور لعنت کی اس کو ، اور تیار کر رکھا ہے واسطے اس کے عذاب بڑا ۔"

اس اعتبار سے یہ فتویٰ حکومتِ وقت کے لیے ایک چیلنج کی

حیثیت رکھتا تھا اور فوج میں کام کرنے والے مسلمان جوانوں کے لیے اس کی حیثیت ایک انتباہ کی تھی کہ اگر انھوں نے اس غیر مسلم حکومت میں شامل رہ کر کسی مسلمان کی جان لی تو وہ اپنے آپ کو عذابِ خداوندی میں مبتلا کر لیں گے۔

اس موضوع پر مولانا محمد علی و شوکت علی اور دیگر علما نے علامہ اقبال کے خیالات جاننا چاہے تو آپ نے فرمایا کہ برٹش گورنمنٹ کے خلاف یہ فتویٰ اسی دن نافذ ہونا چاہیے تھا جس روز ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کا راج شروع ہوا تھا۔ ہزارہا نوجوان برٹش فوج میں بھرتی ہوئے اور ہزارہا نوجوانوں نے برٹش راج کے لیے جانیں قربان کیں۔ اس کے علاوہ مسلمان سپاہیوں نے بارہا حکومتِ برطانیہ کے تحفظ کے لیے مسلمانوں پر گولیاں بھی چلائی ہیں۔

۷۸

نواب احمد یار خان دولتانہ

(علامہ اقبال کا مکتوب)

شملہ

۲۸ جولائی ۱۹۲۹ع

جناب ایڈیٹر صاحب 'انقلاب' ! السلام علیکم

۲۶ جولائی ۱۹۲۹ع کے 'انقلاب' میں آپ نے نواب احمد یار خاں صاحب کے ایک مکتوب کا حوالہ دیا ہے۔ میں اس مکتوب کے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ سطور ذیل اپنے اخبار کے کسی کالم میں شائع فرما کر مجھے ممنون فرمائیں۔

نواب صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ کسی مطبوعہ پمفلٹ میں وہ تمام تجاویز درج تھیں جن پر اب 'انقلاب' معترض ہے اور اس پمفلٹ کی تجاویز پر تمام مسلم ارکانِ کونسل نے دستخط ثبت کیے تھے۔ اور اسی واسطے نواب صاحب موصوف کے خیال میں اس مسلم کشی کے لیے صرف پنجاب سائمن کمیشن کے ممبر ہی ذمہ دار

نہیں بلکہ تمام مسلم ارکانِ کونسل بھی ذمہ دار ہیں ۔ آپ کو یاد ہوگا یہ مطبوعہ پمفلٹ وہی تحریر ہے جس پر آپ نے متعدد مضامین 'انقلاب' میں لکھے تھے اور جس کی تجاویز کے خلاف لاہور کے تمام میونسپل وارڈوں نے ریزولیوشن پاس کیے تھے ۔ یہ ریزولیوشن بھی غالباً آپ کے اخبار میں شائع ہو چکے ہیں ۔

پنجاب سائمن کمیٹی کی سفارشات کا مجھے کوئی علم نہیں ۔ ان کی رپورٹ ابھی تک شائع نہیں ہوئی ۔ لیکن نواب صاحب کے خط سے ، جس کا ملخّص آپ نے 'انقلاب' میں شائع کیا ہے ، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا خطرہ بالکل بجا ہے ، اور غالباً پنجاب سائمن کمیٹی کی سفارشات وہی ہیں جو مذکورہ بالا پمفلٹ میں درج ہیں ۔ بہرحال میں نے متعدد ارکانِ کونسل سے دریافت کیا ہے ۔ وہ سب کے سب مذکورہ پمفلٹ کی تجاویز پر دستخط کرنے سے انکار کرتے ہیں ۔ نواب احمد یار خاں صاحب سے بھی میں نے گفتگو کی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ کوئی میٹنگ کسی جگہ ہوئی تھی جہاں مسلم ارکانِ کونسل نے ان تجاویز پر دستخط کیے تھے ۔ ممکن ہے نواب صاحب کے پاس ان حضرات کے دستخط محفوظ ہوں ۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے ، میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں کسی ایسی میٹنگ میں شریک نہیں ہوا اور نہ کسی پمفلٹ کی تجاویز پر میں نے دستخط کیے ہیں ۔ جن ارکانِ کونسل سے میں نے دریافت کیا ہے ، اُن کے اسماے گرامی ذیل میں درج ہیں :

سردار حبیب اللہ ، مسٹر دین محمد ، سید محمد حسین شاہ ، مولوی سر رحیم بخش ، پیر اکبر علی ، ملک محمود الٰہی شمس آبادی ، مسٹر غلام یٰسین ۔

ان حضرات نے بڑے زور سے نواب احمد یار خان صاحب کے بیان کی تردید کی ہے ۔ مسٹر دین محمد تو شاید اسی مضمون کی کوئی تحریر بھی آپ کی خدمت میں اشاعت کے لیے ارسال کر چکے ہیں ۔

محمد اقبال

(انقلاب ، ۳۱ جولائی ۱۹۲۹ع)

۷۹

مسٹر گزٹ

لاہور سے علامہ اقبال کے زمانے میں ایک صاحب علی بخش نامی ایک اخبار ''مسٹر گزٹ'' نکالتے تھے جو باقاعدگی سے نہیں نکلتا تھا۔ اسی اخبار کے نام کی نسبت سے اس شخص (علی بخش) کو بھی لاہور کے لوگ ''مسٹر گزٹ'' کہہ کر پکارتے تھے۔

یہ اخبار چونکہ باقاعدگی سے نہیں چھپتا تھا لہٰذا ہم اسے روزنامہ یا ہفتہ وار نہیں کہہ سکتے۔ اکثر اوقات صرف دو ہی ورق ہوتے تھے اور ان میں بھی کوئی خاص مضمون نہیں ہوتا تھا۔ یہی اخبار ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ وہ ابتدا میں کسی اَور اخبار میں ملازم بھی رہ چکے تھے۔ ان کی صرف ایک آنکھ تھی اور لاہور کے بدنام علاقے ٹبّی بازار میں رہتے تھے۔ وہ نہایت بے اعتدالی کی زندگی بسر کرتے تھے کیونکہ ان کو شراب نوشی کی بھی عادت تھی۔ وہ اکثر طوائفوں کے ہاں پڑے رہتے تھے اور ان کی دعا گوئی کر کے کہیں نہ کہیں چسکی لگا لیا کرتے تھے۔ ان کا اخبار ''مسٹر گزٹ'' مشکل سے دو سو یا اس سے بھی کم چھپتا تھا جس میں عام طور پر اسی بازار سے متعلق قصیدہ خوانی ہوتی تھی اور اکثر اس قصیدہ خوانی سے کچھ نہ کچھ وصول کر لیتے تھے۔ وہ مجمع لگا کر بلند آواز سے اور للکار کر

اخبار بیچا کرتے تھے ، جس سے اکثر ناواقف لوگ خوب متاثر ہو جاتے تھے ۔ بہرحال ان کو اخبار بیچنے کا فن خوب آتا تھا ۔

کبھی کبھی پریشان ہو کر وہ علامہ اقبال کے ہاں بھی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر پہنچ جاتے تھے اور نہایت بلند آواز سے للکار کر کہتے تھے ''گھر گھر گزٹ ، گھر گھر مسٹر گزٹ ۔'' ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا تھا جس پر علامہ کا ملازم علی بخش ان کو خاموشی سے کچھ دے کر رخصت کر دیتا اور وہ دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو جاتے ۔ غرض کہ ان کا یہ نعرہ ''گھر گھر مسٹر گزٹ'' لوگوں میں خوب مشہور تھا ۔

ان کا لباس عام طور پر پاجامہ یا آدھڑی ہوئی پتلون قمیص اور سر پر ٹوپی ہوتی تھی ۔ بعض اوقات دوسروں کے اشعار بھی الاپتے تھے جو ان کو بہت یاد تھے ۔ غرض کہ وہ ایک ہنگامہ خیز شخصیت کے مالک تھے ۔

۸۰

فضل کریم درّانی

لاہور میں ایک متوسط عمر کا شخص فضل کریم درانی رہتا تھا جو ریلوے روڈ پر عرب ہوٹل کے قریب قومی کتب خانے میں شیخ محمد نصیر ہمایوں کے ہاں علمی کام کیا کرتا تھا ۔ بی ۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد اوّل وہ جموں کے ایک سکول میں سیکنڈ ماسٹر ہوگیا تھا اور وہاں سے احمدیوں کی لاہوری پارٹی کے زیرِ نگرانی جرمنی میں بطور مبلّغ چلا گیا تھا جہاں اس نے مسجد سے ملحقہ ایک حصے کو رہن بھی رکھ دیا تھا ۔ اس نے آنحضرت صلعم کی حیات پر علمی کام بھی کیا اور کچھ کام انگریزی میں طبع بھی ہوگیا تھا ۔ اس کے اس علمی کام نے اسے کچھ شہرت بھی دی تھی ۔ لاہور میں وہ اکثر مفلوک الحال رہتا تھا ۔ اس کے کھانے کا انتظام عرب ہوٹل میں تھا جہاں اس نے کبھی پوری طرح ہوٹل کے بل ادا نہین کیے تھے ۔

بقول شیخ عبدالسلام (آئینۂ ادب لاہور) درّانی صاحب نے میرے ہاتھ اپنی تصنیف بنام ''آنحضرت صلعم'' (انگریزی) علامہ اقبال کی خدمت میں ارسال کی اور ہدایت کی کہ کتاب علامہ اقبال کو دے کر

فوراً واپس آ جانا - چنانچہ شیخ عبدالسلام وہ کتاب لے کر آپ کے ہاں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر گیا - جب اُنھوں نے کتاب علامہ کو دی تو آپ نے عبدالسلام سے دریافت کیا کہ ''درانی صاحب بخیریت ہیں ؟'' عبدالسلام نے کہا کہ وہ بخیریت ہیں - پھر علامہ نے کہا کہ میرے تکیے کے نیچے جو نقدی پڑی ہے ، اُسے اُٹھالو اور درانی صاحب کے حوالے کردو - چنانچہ جس طرح عبدالسلام کو کہا گیا اس نے اس پر اُسی طرح عمل کیا - چونکہ درانی صاحب نے شیخ عبدالسلام کو ہدایت کر دی تھی کہ کوئی بات نہیں کرنی لٰہذا اس نے صرف رقم وہاں سے لے لی جو چھہتر روپے کچھ آنے تھی - پھر خوشی خوشی واپس آ کر درانی کو تمام واقعہ سنایا جس پر اُنھوں نے رونا شروع کردیا اور اُنھیں مجبور کیا کہ ابھی یہ رقم واپس کر آؤ - مگر پھر کہا کہ اس میں سے پانچ روپے مجھے دے دو اور اپنی گرہ سے یہ پانچ روپے ڈال کر پوری رقم ڈاکٹر صاحب کو کل واپس کر آنا - مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ درانی صاحب نے عبدالسلام سے بقیہ رقم بھی لے لی جو ان کے پاس تھی اور خود ہی ساری خرچ کر ڈالی -

اس تمام قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو درانی کی مالی حالت کا علم تھا - یہ بھی ممکن ہے کہ درانی نے علامہ کو کوئی خط لکھا ہو جس پر علامہ نے فوراً عبدالسلام کو رقم دینے پر آمادگی ظاہر کی - اس تمام واقعے سے درانی کی ابتر مالی حالت ، اس کی ناداری اور خودداری عیاں ہے -

درانی کا انتقال پاکستان بن جانے کے بعد ہوا - اس کی بیوی

انگریز تھی جس سے اس کے دو بچے بھی تھے مگر وہ اس کی زندگی ہی میں اس کی حالت دیکھ کر واپس یورپ چلی گئی تھی ۔ تاہم وہ بحثیت بیوی کے اسے برابر خط ارسال کرتی رہی ۔

☆ ☆ ☆

۸۱

چراغ حسن حسرت

اہلِ لاہور آج بھی مولٰنا چراغ حسن حسرت کے فکاہی کالموں اور ان کے ادبی کارناموں کا ذکر کر کے لطف لیا کرتے ہیں ۔ آنھوں نے اپنے خاص رنگ میں ایک چھوٹی سی کتاب ''اقبال نامہ'' لکھی تھی ، اس کے صفحہ ۳۳ پر وہ لکھتے ہیں :

"حضرت کے ساتھ مجھے بے حد اور بے انتہا عقیدت تھی ۔ ۱۹۰۸ع کا ذکر ہے جبکہ میری عمر ۱۴ سال تھی . . . بزمِ اُردو کے مشاعروں میں چونکہ ان کے تمام معزز احباب شریک ہوتے تھے اُس لیے آپ بھی تشریف لے جاتے تھے ۔ ۱۹۱۷ع کا ذکر ہے محمڈن ہال میں بزمِ اُردو کا مشاعرہ تھا ۔ میاں شاہ دین ہمایوں مرحوم صدر تھے ۔ حضرت علامہ بھی تشریف رکھتے تھے ۔ میں اُس وقت لاہور کی پبلک سے روشناس نہیں ہوا تھا ۔ کسی صاحب نے میاں صاحب مرحوم تک میرا نام بھی پہنچا دیا ۔ میں نے مصرعِ طرح پر ایک غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا :

وہ ہے حیرت فزائے چشمِ معنی سب نظاروں میں
تڑپ بجلی میں اس کی ، اضطراب اس کا ستاروں میں

مجھے علامہ سے داد کی تمنّا تھی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ لیکن بعض اشعار پر علامہ نے میری بے حد حوصلہ افزائی فرمائی . . . .

دنیا بھر کا یہ عظیم الشان انسان جب اپنے معمولی سے بستر پر تکیہ لگا کر بیٹھتا ہے اور حقّے کی رفاقت میں فلسفہ و شعر کی بلندیوں پر پرواز کرتا ہے تو دنیا بھر کے اہلِ علم اس کی رفعتِ تخیّل کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں . . . جنگِ بلقان کے جلسے کا انتظام مولوی ظفر علی خاں نے کیا تھا۔ آغا حشر بھی شریکِ جلسہ تھے . . . علامہ اقبال نے غازی رؤف بے کے لیکچر کی صدارت کی تھی۔ لیکچر کا عنوان ''اتحادِ اسلامی اور وطنیت'' وغیرہ قسم کا تھا . . . ایک گھنٹے کے قریب یہ تقریر رہی . . . اس کے بعد علامہ اٹھے اور کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک اس موضوع کے ہر پہلو پر ایسے بلیغ انداز میں تقریر کی کہ حاضرین عش عش کر اٹھے۔ انھوں نے اتحادِ اسلامی کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا اور پھر اُن اعتراضات کا ذکر کیا جو اہلِ یورپ اکثر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے موجودہ وطنیت کے تخیّل کا ذکر کر کے اس کے خوب پرخچے اڑائے۔ تقریر کے آخر میں سب سے پہلی مرتبہ انھوں نے اپنی مشہور نظم ''مسجدِ قرطبہ'' کا ایک بند پڑھا جس کا پہلا شعر یہ تھا:

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات

غازی رؤف بے کے دوسرے لیکچر کی صدارت بھی علامہ

نے کی مگر مختصر تقریر کی ۔ پھر چند ماہ بعد تشریف لائے اور تقریر کی درخواست کی گئی تو علامہ نے خود ہی اپنی تقریر کا موضوع ''لندن سے قرطبہ تک'' پسند فرمایا ۔''[1]

پھر اقبال کی محفل کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنی تصنیف ''مردم دیدہ'' میں لکھتے ہیں :

''علامہ سے ملنے والوں میں دو شخص بہت دلچسپ تھے ؛ مولوی گرامی اور عبداللہ چغتائی ۔ گرامی صاحب ہوشیار پور کے رہنے والے اور فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے ۔''[2]

☆ ☆ ☆

۱۔ اقبال نامہ ، مصنفہ چراغ حسن حسرت ، صفات ۱۳ ، ۳۳ ، ۳۴ ، ۴۳ ، ۱۰۸ ۔

۲۔ مردم دیدہ ، از چراغ حسن حسرت ، دارالاشاعت پنجاب لاہور ، ۱۹۳۹ع ، صفحات ۱۳۳ - ۱۳۴ ۔

۸۲

محمد صدیق نعت خواں

لاہور میں عام طور پر منتظمانِ جلسہ کے ذمے یہ ایک فرض ہوگیا تھا کہ جب کبھی علامہ سے کوئی نظم سننے کا انتظام کیا جائے تو ان سے پیشتر ایک نعت نما نظم ضرور پڑھی جائے اور وہ نظم عام طور پر مسٹر صدیق پڑھا کرتے تھے جو بھاٹی دروازے کے اندر رہتے تھے -

صدیق صاحب بیان کرتے ہیں کہ زندگی کے آخری ایام میں علامہ نے انھیں بلوایا - دراصل انجمنِ حمایتِ اسلام کے ایک جلسے میں علامہ کو ایک نظم پڑھنی تھی مگر بیماری کی وجہ سے وہ اونچی آواز میں نہیں بول سکتے تھے - ان دنوں علامہ اپنی نئی کوٹھی جاوید منزل میں منتقل ہو چکے تھے اور چودھری محمد حسین بھی آپ کی خدمت میں موجود تھے - چنانچہ علامہ کے اشارے پر چودھری محمد حسین نے صدیق صاحب کو ان کی یہ مشہور نظم جلسے میں پڑھنے کی فرمائش کی :

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ

چودھری صاحب نے یہ بھی کہا کہ علامہ کی خواہش ہے کہ آپ یہ نظم نعت کے انداز میں پڑھیں - چنانچہ صدیق صاحب نے ایسا ہی

کیا جس کا مجمع پر بہت اچھا اثر ہوا ۔

الیکشن کے موقعے پر ایک جلسے کا انتظام کیا گیا جس میں علامہ بھی تقریر کرنے والے تھے ۔ جب علامہ تشریف لائے تو جلسہ شروع ہوا مگر کسی وجہ سے لوگوں میں ایسا انتشار اور افراتفری مچی کہ لوگوں کو سنبھالنا مشکل ہوگیا ۔ صدیق صاحب بھی اس جلسے میں موجود تھے اور علامہ کے قریب بیٹھے تھے ۔ آپ نے فوراً انھیں پاس بلا کر کوئی نظم پڑھنے کو کہا ۔ چنانچہ صدیق صاحب نے خوش الحانی سے علامہ کی شہرۂ آفاق نظم ''شکوہ'' کا ایک بند پڑھا تو ایک دم مجمع میں ٹھہراؤ پیدا ہوگیا اور لوگ خاموش ہوگئے ۔

صدیق صاحب ہی کی یہ روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہندوؤں نے میونسپل کمیٹی کی باقاعدہ اجازت کے بغیر ٹکسالی دروازے کے باہر کمیٹی کے باغ کے کنارے ایک سبیل لگائی ۔ بھاٹی دروازے کے پڑھے لکھے مسلم نوجوانوں کو معلوم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے ۔ چنانچہ صدیق صاحب سمیت نوجوانوں کا ایک وفد علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ایسی ہی ایک سبیل ، جو ہندوؤں کی سبیل کے سامنے سڑک کے شمالی رخ واقع ہو ، ہمیں بھی لگانے کی ضرور اجازت دی جائے ۔ جب علامہ نے نوجوانوں کا یہ جوش و خروش دیکھا تو مسکرائے اور فرمایا کہ میں آپ کی ہمت اور دردمندانہ جذبات کی قدر کرتا ہوں مگر ہمارے پاس اس سے بھی اہم امور ہیں جو اوّلین توجہ کا مستحق ہیں ۔ سب سے پہلے تو مسلمانوں کی اقتصادی حالت سدھارنے کی ضرورت ہے جو بہت ہی ناگفتہ بہ ہے ۔ مسلمان شادی بیاہ اور مرگ کے موقعے پر غیر ضروری بھاری اخراجات کر کے طرح طرح کی مشکلات میں مبتلا ہوتے ہیں ، بلکہ

ہندوؤں سے ، جو ہمارے ازلی دشمن ہیں ، قرض لے کر عمر بھر ذلیل ہوتے ہیں ۔ پھر شادی بیاہ کے موقعے پر تو کسی حد تک اخراجات جائز بھی ہیں مگر وفات کے موقع پر دیگیں پکانے کا کیا جواز ہے ۔ ابھی تجہیز و تکفین کا کام بھی مکمل نہیں ہوتا اور جنازہ گھر میں موجود ہوتا ہے کہ طرح طرح کے پکوان پکنے شروع ہو جاتے ہیں ۔ چاہے میزبان کی اپنی اقتصادی حالت کتنی ہی خراب ہو مگر مہمانوں کے لیے حلوے مانڈے کا انتظام کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے ورنہ برادری میں ناک کٹنے کا خوف ہوتا ہے ۔ علامہ نے فرمایا کہ ان بیہودہ رسوم کو ختم کرنا ہمارا سب سے پہلا فرض ہے تا کہ مسلمان قرض کی لعنت سے چھٹکارا پا کر ہندوؤں کی اقتصادی غلامی سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کرلیں ۔ تاہم انھوں نے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کے خیال سے سبیل لگانے کی تجویز سے بھی اتفاق فرما لیا ۔

صدیق صاحب کی ایک اور روایت ہے کہ بہت عرصہ پہلے لاہور میں محمود نام کے ایک صاحب ہندو ہوگئے اور انھوں نے اپنا نام دھرم پال رکھ لیا ۔ کچھ عرصے کے بعد وہ پھر مسلمان ہوگئے اور ''محمود دھرم پال'' کے نام سے آریہ مذہب کے خلاف لکھنا شروع کر دیا ۔ جب ان کی کافی تحریریں شائع ہوگئیں تو ہندوؤں نے ان کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ۔ علامہ ان دنوں موہن لال روڈ والے مکان میں رہتے تھے ۔ ایک روز صدیق آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ آپ محمود دھرم پال کے مقدمے کی پیروی کریں ۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس کے رویے سے مطمئن نہیں ہوں اور نہ مجھے اس کا طریقِ کار پسند ہے ۔ تاہم صدیق صاحب کی درخواست پر انھوں نے اس کا مقدمہ اپنے ذمے لے لیا مگر افسوس کہ اس مقدمے کی تفصیلات ہمیں نہیں مل سکیں ۔

ایک روز حضرتِ علامہ کے ہاں تبلیغِ اسلام کے موضوع پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی اور علامہ فرما رہے تھے کہ تبلیغ نہایت مؤثر انداز میں ہونی چاہیے ۔ آپ نے اپنا ایک واقعہ سنایا کہ میں نے ایک خوبصورت ہندو عورت سے کہا کہ تمھیں اللہ نے کس قدر حسین پیدا کیا ہے ۔ اگر تمھارے اس خوبصورت جسم کو آگ میں جلا دیا جائے تو تمھیں اچھا لگے گا ؟ یا تم اسے برداشت کر لوگی ؟ وہ ایک دم چونکی اور اس کے بعد اسے ہندو مذہب سے نفرت ہوگئی ۔ آپ نے فرمایا کہ تبلیغ کا اثر تبھی ہوتا ہے کہ سائنٹفک طریقے سے اور نفسیاتی انداز میں کی جائے۔

صدیق صاحب کا کہنا ہے کہ میں نے علامہ کو ہمیشہ نہایت شائستہ گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے ۔ حاضرین میں سے اگر کوئی شخص ناگوار قسم کی گفتگو کرتا یا بےموقع بولتا تو آپ بڑی خوبصورتی سے اس کو اس بات کا احساس دلاتے لیکن اگر وہ پھر بھی باز نہ آتا تو گفتگو کا موضوع ہی بدل دیتے ۔

☆ ☆ ☆

۸۳

اقبال اور حالی

(مولانا حالی کا صد سالہ جشنِ ولادت)

ا کتوبر ۱۹۳۵ع میں بعض اہلِ دل بزرگوں نے خواجہ الطاف حسین حالی کی ولادت کی صد سالہ تقریب پانی پت میں منانے کا فیصلہ کیا ۔ چنانچہ یہ تقریب پورے اہتمام سے پانی پت میں منائی گئی جس کی صدارت نواب حمیداللہ خاں والیِ بھوپال نے کی ۔ نواب صاحب ایک روشن خیال انسان تھے اور مولانا حالی سے خاص عقیدت رکھتے تھے ۔ جن اہلِ علم نے اس تقریب میں شرکت کی اور مقالات پڑھے ان میں سیّد راس مسعود اور علامہ اقبال بھی شامل تھے ۔ اگرچہ حضرتِ علامہ آن دنوں خاصے علیل تھے اور نقاہت کی وجہ سے سفر کے قابل نہیں تھے مگر اس کے باوجود انھوں نے اس تقریب میں شرکت فرمائی اور مولانا مرحوم کی شان میں اشعار بھی کہے ۔ اگرچہ وہ خود تو یہ اشعار تقریب میں اپنی علالت کی وجہ سے نہیں پڑھ سکے مگر وہ شریک ضرور ہوئے ۔ اشعار یہ ہیں :

مزاجِ ناقہ را مانندِ عرفی نیک می دانم
چو محمل را گراں بینم ، حُدی را تیز تر خوانم

حمیداللہ خاں ! اے ملک و ملّت را فروغ از تو
ز الطافِ تو موجِ لالہ خیزد از خیابانم
طوافِ مرقدِ حالی سزد اربابِ معنی را
نوائے او بہ جاں ہا افگند شورے کہ من دانم
بیا تا فقر و شاہی در حضورِ او بہم سازیم
تو بر خاکش گہر افشاں و من برگِ گل افشانم

علامہ کے ہم زلف خواجہ فیروز بتاتے تھے کہ میں نے بھی[۶] یہ نظم علامہ سے سنی تھی اور اسے یاد بھی کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

۸۴

منشی دین محمد

منشی دین محمد ایڈیٹر "میونسپل گزٹ" لاہور ، پرانے اخبار نویسوں میں سے تھے ۔ ان کے والدِ محترم مولوی فتح دین بسمل نے "پنجاب پنچ" کے نام سے ایک ظریفانہ اخبار نکال تھا جو اپنے وقت میں بے حد مقبول تھا ۔ منشی دین محمد نے "میونسپل گزٹ" سے قبل ایک اور اخبار "صدائے ہند" کے نام سے بھی جاری کیا تھا ۔ "میونسپل گزٹ" اپنی نوعیت کا بالکل منفرد اخبار تھا جس میں بلدیات کی خبریں بالالتزام شائع ہوتی تھیں ۔ جب یہ اخبار منشی صاحب کی وفات کے ساتھ ہی بند ہوگیا تو پھر اس قسم کا اخبار جاری کرنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوئی ۔ دہلی دروازے سے جو پتلی سی سڑک اکبری منڈی کی طرف جاتی ہے اس کے کونے پر "یادگار آفس" کے نام سے ان کا ایک دفتر ہوتا تھا جہاں ہر اتوار کو آٹھ نو بجے کے قریب شعرا کی محفل گرم ہوتی تھی اور شہر کے چیدہ چیدہ شعرا اور اہلِ ذوق حضرات یہاں جمع ہوتے تھے ۔ راقم نے بھی اکثر ان محفلوں میں شرکت کی ہے اور علامہ اقبال کو بھی یہاں دیکھا ہے ۔ دیگر شعرا کے علاوہ خواجہ دل محمد صاحب اور ناظر صاحب جوگی بطورِ خاص ان مجالس میں اپنا کلام پیش کیا کرتے تھے ۔ ان جلسوں کی

کارروائی ، جن میں صرف غزلیں اور نظمیں پڑھی جاتی تھیں ، ایک مختصر رسالے کی صورت میں چھپا کرتی تھی ۔ غزل یا نظم کے عنوان کے ساتھ شاعر کا نام بھی ہوتا تھا ۔

زندگی کے آخری ایام میں منشی دین محمد مرحوم کے لیے حیدرآباد دکن سے کچھ وظیفہ بھی منظور ہوگیا تھا ۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال نے بھی کوشش کی تھی مگر زیادہ تر سر فضل حسین کی مساعی کو دخل تھا ۔ بالآخر ۱۹۳۵ع میں علم و ادب کے اس شیدائی کا انتقال ہوگیا ۔

☆ ☆ ☆

۸۵

مسٹر آپسن

مسٹر ڈیوڈ آپسن انگریزی روزنامے "مسلم آؤٹ لُک" کے مدیر تھے جو سنہ ۱۹۳۰ء تک لاہور سے باقاعدہ نکلتا رہا ۔ اس اخبار کے مالک مولوی عبدالحق بن مولانا محمد غوث تھے اور یہ شیرانوالہ گیٹ اور مستی گیٹ کے اندر خضری محلے سے شائع ہوتا تھا ۔ مسٹر آپسن وقت نکال کر اپنی بیگم کے ہمراہ اکثر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور ان سے سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا کرتے تھے ۔ مسٹر آپسن صاف گفتگو نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی پورے طور پر بات سن سکتے تھے جس کی وجہ سے علامہ اکثر لکھ کر انہیں اپنی بات سمجھاتے تھے ۔ تاہم وہ سیاسی مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے اور اپنے پیشۂ ادارت کی سوجھ بوجھ میں یکتائے روزگار تھے ۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مسائل سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے ۔ ان کا انتقال ۲۰ فروری ۱۹۲۹ء کو لاہور ہی میں ہوا ۔

علامہ اقبال کی زبردست خواہش تھی کہ ایک ایسا انگریزی اخبار جاری ہو جو صرف مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرے اور وہ ہر لحاظ سے خود کفیل بھی ہو ۔ اس کے لیے ایک بے ریا اور صاحبِ بصیرت ایڈیٹر کی ضرورت بھی تھی جو خاص طور پر

مسلمانوں کے نقطۂ نظر اور ان کے مسائل سے پوری طرح آگاہ ہو۔ اس مقصد کے لیے وہ مسٹر آپسن کو موزوں ترین آدمی سمجھتے تھے اور اس سلسلے میں اکثر ان سے صلاح مشورہ کرتے رہتے تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے مجوزہ اخبار کے لیے چندے کی مہم بھی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے احباب سے بھی چندہ وصول کیا اور خود بھی حصہ لیا۔ راقم الحروف نے بھی اس کارِ خیر میں دو سو روپے چندہ دیا تھا۔ مگر بالآخر یہ تجویز پروان نہ چڑھ سکی کیونکہ اس مقصد کے لیے جتنا سرمایہ درکار تھا وہ علامہ اور ان کے بیشتر درویش صفت احباب مہیا نہیں کر سکتے تھے۔

مسٹر آپسن باوجود ثقلِ سماعت اور دوسرے طبعی نقائص کے نہایت ظریف الطبع آدمی تھے۔ ایک روز علامہ سے کہنے لگے کہ ہم ہر روز شیرانوالہ گیٹ سے گزر کر اپنے اخبار کے دفتر پہنچتے ہیں مگر ہم نے تو کبھی کوئی شیر نہیں دیکھا۔ البتہ پنجاب کا شیر لالہ لاجپت رائے ادھر کہیں رہتا ہوگا، مگر ہم اس سے بھی محفوظ ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ انھوں نے علامہ سے کہا کہ جب سوراج مل جائے گا تو ہندو حضرات آئی ۔ سی ۔ ایس (I·C·S) کا مفہوم بدل دیں گے اور اس سے مراد ہوگی ''انڈین کاؤ سروس'' (Indian Cow Service) یعنی گائے کی خدمت کا ادارہ۔ اس پر علامہ خوب محظوظ ہوئے اور ان کی نکتہ سنجی کی داد دی۔

جسٹس شادی لال کے زمانے میں ''مسلم آؤٹ لک'' پر توہینِ عدالت کا مقدمہ قائم ہوا تو مالکانِ اخبار نے علامہ اقبال کو بھی گواہِ صفائی کے طور پر پیش کرنا چاہا۔ مگر علامہ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے فرمایا کہ میری گواہی آپ کے لیے سود مند ثابت نہیں

ہوگی ۔ مالکان نے علامہ کی اس صاف گوئی کا غلط مطلب لیا اور شکوہ کیا کہ اتنے عرصے سے ہم آپ کو مفت اخبار بھیج رہے ہیں مگر آپ ہمارے لیے اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتے ؟ یہ سنتے ہی علامہ نے علی بخش کو بلایا اور اس سے کہا کہ ''مسلم آؤٹ لک'' کا تازہ پرچہ لے آؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ یہ اخبار کب سے ہمارے پاس آ رہا ہے ؟ چنانچہ علی بخش نے جتنی مدت بتائی ، علامہ نے حساب کر کے اتنی مدت کی قیمت کا چیک اسی وقت مالکان کے حوالے کر دیا ۔ مسٹر آپسن کا انتقال اس واقعے سے پہلے ہو چکا تھا ورنہ وہ مالکانِ اخبار کو اس حرکت کی ہرگز اجازت نہ دیتے ۔

☆ ☆ ☆

۸۶

مولوی احمد الدین وکیل

لاہور کے اکثر سرکردہ اہلِ علم حضرات ہماری آنکھوں سے ایک ایک کر کے اوجھل ہوگئے ہیں جو اپنے اعلیٰ مذاق کی وجہ سے اپنی ذات میں ایک انجمن تھے ۔ علامہ اقبال کے احباب میں سے میرے نزدیک مولوی احمد الدین وکیل ایک یکتائے روزگار آدمی تھے ۔ وہ ہماری تاریخ و ثقافت کا درخشندہ ستارہ تھے ۔ میں نے اکثر ان کو انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسوں میں دیکھا تھا ۔ اگرچہ وہ باقاعدہ کوئی تقریر نہیں کرتے تھے مگر جب کبھی کوئی اعلان کسی جلسے کے پلیٹ فارم سے کرتے تو ان کے کلمات موتیوں کے برابر ہوتے اور اکثر یہ خواہش رہتی کہ وہ بولتے ہی رہیں ۔ وہ علامہ اقبال کے ابتدائی احباب اور ان کے مداحوں میں سے تھے ۔ ان کو علامہ کا کلام بھی خوب یاد تھا جو ان کے ہاں جمع ہو چکا تھا ۔ وہ علامہ کے رازداں اور ان کی قابلیت کے قائل تھے ۔ جب کبھی علامہ کو دیوانی امور میں مشورے کی ضرورت ہوتی تو اکثر انھی سے کرتے ۔ مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۱۸ع میں علامہ اقبال کے عزیزوں نے انارکلی میں جائیداد خریدی تو علامہ نے خاص طور پر اپنے عزیز ڈاکٹر غلام محمد مرحوم کو مشورہ دیا کہ وہ بیع نامہ اور مکمل

دستاویزات وغیرہ کا مسودہ مولوی احمد الدین سے لکھوائیں ۔ چنانچہ منشی طاہر الدین نے انھی سے یہ مسودہ لکھوایا تھا اور وہی آخر تک رہا ۔ راقم کے ان کے بڑے صاحبزادے مولوی بشیر احمد سے طالب علمی کے زمانے سے دوستانہ تعلقات تھے جو عمر میں مجھ سے بڑا تھا ۔ اسی طرح ان کے دوسرے صاحبزادوں سے بھی اچھے مراسم تھے ۔

جب علامہ ۱۹۲۲ع کے اخیر میں انارکلی والے مکان کو چھوڑ کر میکلوڈ روڈ پر آ گئے تو معلوم ہوا کہ مولوی احمد الدین نے اپنے طور پر نہایت احتیاط سے ان کا اردو کلام جمع کر رکھا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے تاثرات اور شرح بھی لکھی ہوئی تھی ۔ اس کا ذکر ان کے صاحبزادے بشیر احمد اکثر اپنے احباب سے کیا کرتے تھے اور یہ بھی کہا کرتے تھے کہ بابو جی (مولوی احمد الدین) کا ارادہ اسے شائع کرنے کا ہے ۔ اس کے لیے علامہ کی ایک تصویر بھی درکار ہے ۔ چنانچہ انھی دنوں علامہ نے ''بانگِ درا'' شائع کی جس کی کیفیت میں نے الگ درج کر دی ہے ۔

مولوی احمد الدین پنجاب کے بہت اچھے انشاپردازوں میں سے تھے ۔ انھوں نے ایک کتاب بعنوان ''سرگزشتِ الفاظ'' لکھی تھی جس پر پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے ان کو انعام دیا تھا اور علامہ نے اس پر ایک تقریب نامہ لکھا تھا ۔ آپ کا چونسٹھ سال کی عمر میں ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۹ع کو انتقال ہوگیا ۔

☆ ☆ ☆

۸۷

پنڈت جواہر لال نہرو

۱۹۳۷ء میں پنڈت جواہر لال نہرو لاہور آئے اور مسلمانوں سے رابطے کی تحریک کے سلسلے میں وہ سر سکندر حیات خاں سے ملے - انھوں نے سر سکندر حیات خاں سے کہا کہ چونکہ مسٹر جناح فرقہ وارانہ مسائل کے تصفیے کے سلسلے میں بہت متشدّد ہیں لہٰذا آپ ہی ہمارے ساتھ بات چیت کر کے مفاہمت کی کوئی راہ نکالیے - سکندر حیات خاں نے جواب دیا کہ مسلمانانِ ہند کے واحد نمایندہ صرف محمد علی جناح ہیں اور ان کو صرف وہی فیصلہ منظور ہوگا جو جناح کریں گے ، لہٰذا آپ کو یہ بات چیت صرف جناح صاحب سے کرنی چاہیے -

اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے علامہ اقبال سے ملاقات کی اور ان کو بھی یہی پیشکش کی - علامہ نے جواب دیا کہ پنڈت جی ! اگر شعر اور فلسفے وغیرہ پر کوئی بات چیت کرنی ہو تو میں حاضر ہوں - جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے ، اس سلسلے میں تمام تر اختیار ہم نے مسٹر جناح کو دے رکھا ہے - ان کے علاوہ کوئی بھی دوسرا شخص کانگرس کے ساتھ مفاہمت تو کیا ، بات چیت بھی نہیں کر سکتا - یہ جواب سن کر پنڈت جی مایوس

ہوگئے اور انہیں مسلمانوں کی یک جہتی اور اتحاد کو دیکھ کر یقین ہوگیا کہ قائد اعظم سے بالا ہی بالا کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی - چنانچہ بے نیلِ مرام وہ واپس لوٹ گئے -

اس موقع پر ، جب کہ کانگرس مسلمانوں کی یک جہتی اور اتحاد کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئی تھی ، شاہ فضل امام واقف نے ایک قطعۂ تاریخ کہا تھا جس کا آخری شعر یہ ہے :

کہہ رہی ہے آج واقف کانگریس
ہم تو اس جیسے کے ہاتھوں مر چلے

۱۳۵۶ھ

☆ ☆ ☆

۸۸

علامہ اقبال اور قائدِ اعظم

علامہ اقبال نے جو خطوط حضرتِ قائداعظم کو وقتاً فوقتاً ارسال کیے تھے وہ تعداد میں کل بارہ ہیں اور سب چھپ گئے ہیں - یہ ۲۵ جون ۱۹۳۶ع سے ۱۰ نومبر ۱۹۳۷ع تک کے عرصے کو محیط ہیں - ان میں پنجاب کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور مسلم لیگ کی کیفیت کو وہ خصوصیت سے بیان کرتے ہیں - خوش قسمتی سے ان خطوط پر ایک مفید مقدمہ بھی قائدِ اعظم نے خود لکھا ہے مگر افسوس کہ قائدِاعظم کے اپنے جوابات میسّر نہیں ہیں - یہ امر قابلِ بیان ہے کہ ان خطوط میں اقبال ایک عملی سیاست دان اور ماہرِ اقتصادیات کی طرح مسلمانوں کی حالت کا مطالعہ کرتے ہیں -

پنجاب کے مسلمانوں کی عام اقتصادی حالت جاننے کے لیے علامہ اقبال کے ایک انگریز دوست مسٹر ملکولم لائل ڈارلنگ کی کتاب (انگریزی یا اردو) ''پنجابی کسان'' کا مطالعہ بھی مفید ہوگا - یہ شخص طالب علمی کے زمانے میں علامہ اقبال کا رفیق تھا؛ یعنی جن دنوں آپ کیمبرج یونیورسٹی میں پڑھتے تھے، یہ شخص بھی ۱۹۰۶ع سے ۱۹۰۸ع تک وہاں طالب علم رہ چکا تھا - اس شخص کی معرفت بھی علامہ اس ضمن میں کافی باخبر تھے - چنانچہ علامہ کی کوشش

سے پنجاب گورنمنٹ نے اس زمانے میں خاصی تحقیق کے بعد وہ تمام قرضے ، جو مسلمانوں کے ذمے تھے ، ان کو معاف کر دیا تھا اور قانون سازی کے لیے سر چھوٹو رام کو خاص طور پر وزیر مقرر کیا گیا تھا ۔

ایک دفعہ کوہاٹ اور بنوں میں ہندو مسلم فساد ہوگیا تھا اور یہ خبر بھی چھپی تھی کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی حساب کتاب کی کتابیں جلا دی ہیں ۔ اس پر علامہ اقبال نے کہا تھا کہ یہ فساد ہندوؤں کی اقتصادی برتری کے خلاف غریب مسلمانوں کا احتجاج ہے ۔

قائد اعظم مارچ ۱۹۳۶ع میں مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کے خیال سے جب لاہور میں رونق افروز ہوئے تو وہ حضرتِ علامہ سے ملنے جاوید منزل بھی تشریف لائے ۔ آن دنوں علامہ کی صحت غیر معمولی طور پر خراب تھی ۔ وہ استھما کے مرض میں مبتلا تھے اور ان کی آواز بالکل بیٹھ گئی تھی ، تاہم وہ چلنے پھرنے سے معذور نہیں تھے ۔ انھی دنوں انھوں نے اپنے عزیز خواجہ عبدالغنی کے جنازے میں بھی شرکت کی تھی ۔ قائد اعظم نے جب ان سے مسلم لیگ کی تنظیمِ جدید کا ذکر کیا تو حضرتِ علامہ نے فرمایا کہ میں آپ کے مشن کی کامیابی کے لیے اپنی رگوں کا آخری قطرۂ خون بھی نچوڑ دوں گا ۔ جب یہ تاریخی ملاقات ہوئی تھی تو علامہ معمولی قمیص اور تہبند میں ملبوس اپنے بستر پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر لیٹے تھے اور قائد اعظم ان کے سامنے بید کی کرسی پر فروکش تھے ۔ اس ملاقات کے موقع پر میاں محمد شفیع (م ۔ ش) بھی موجود تھے ۔ وہ لکھتے ہیں [1] :

"آن دنوں ان کی ذہنی کیفیت دھوپ میں بیٹھے ہوئے

۱۔ اقبال — چند یادیں ، از میاں محمد شفیع ، نوائے وقت ، ۲۲ اپریل ۱۹۶۲ع ۔

یونان کے اُس فلسفی سے مختلف نہ تھی جس نے سکندرِ اعظم کی اس عرض داشت پر کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں ؟ نہایت استغنا سے جواب دیا تھا کہ ''آپ میرے لیے دھوپ چھوڑ دیں ۔"

☆ ☆ ☆

۸۹

علی بخش
(خدمت گارِ علامہ اقبال)

علامہ اقبال کا ذاتی خدمت گار علی بخش ، جس نے اپنی نصف سے زیادہ زندگی علامہ کی خدمت میں رہ کر گزار دی ، ضلع ہوشیار پور کا رہنے والا تھا ۔ وہ خود بیان کرتا ہے کہ ''میں چھوٹا سا تھا جب لاہور آیا اور شہاب الدین درزی کے ہاں ٹھہرا جس نے مجھے مولوی حاکم علی کے ہاں ملازم رکھوادیا ۔'' مولوی حاکم علی صاحب آن دنوں مشن کالج میں پروفیسر تھے اور بھاٹی دروازے میں علامہ اقبال کی قیام گاہ کے قریب ہی رہتے تھے ۔ علامہ کو خدمت گار کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے علی بخش کو اپنے پاس رکھ لیا ۔ پھر وہ علامہ کے ولایت جانے تک ان کی خدمت کرتا رہا ۔ مگر جب آپ چلے گئے تو علی بخش نے کسی اور جگہ ملازمت کر لی ، تاہم علامہ کے حسنِ سلوک کو وہ کبھی نہ بھلا سکا اور ان سے بھی رابطہ قائم رکھا ۔ چنانچہ ۱۱ دسمبر ۱۹۰۷ کو علامہ نے علی بخش کے خط کے جواب میں ولایت سے لکھا :

''عزیزی علی بخش !

. . . امید ہے وہ کمی جو چوری سے ہوگئی ہے ، اسے

پورا کر لو گے ۔ مجھے یہ سن کر بڑا افسوس ہوا ۔ تم نے اپنی شادی کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا ہے ۔ میرا خیال تھا کہ تمھاری شادی ہو چکی ہے . . .“

علی بخش سنہ ۱۹۰۰ء میں علامہ کے ہاں ملازم ہوا اور سفرِ یورپ کا زمانہ چھوڑ کر اخیر تک ان کی خدمت میں رہا ۔ اس عرصے میں اس نے علامہ کے ہاں کیا کچھ مشاہدہ کیا ، کیسے کیسے واقعات اس کے سامنے ہوئے اور خود اس نے وہاں کیسے دن گزارے ؟ یہ داستان وہ خود ہی بیان کر سکتا تھا اور حتیٰ المقدور اس نے بیان بھی کی ہے ۔ چنانچہ جستہ جستہ واقعات ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں :

حضرتِ علامہ جو کھانا اپنے لیے پسند فرماتے تھے ، ان کے خدمت گار بھی وہی کھانا کھاتے تھے ۔

ایک مرتبہ علامہ کے لدھیانے والے عزیزوں نے چاہا کہ اگر علامہ کوئی کوٹھی اپنے لیے پسند فرمائیں تو اس کی قیمت ہم ادا کریں گے مگر علامہ اس شرط پر راضی ہوئے کہ وہ اس کا کرایہ وصول کریں ۔

علی بخش کے بقول جاوید منزل کی زمین کئی کنالوں پر مشتمل تھی ۔ اس کی قیمت پچیس ہزار روپے طے ہوئی تھی اور بنک سے یہ رقم میں ہی لایا تھا ۔ کوٹھی کے لیے جگہ کا انتخاب علامہ کے دوست سید شبیر حیدر صاحب نے کیا تھا اور اس کی تعمیر کی نگرانی علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب نے کی تھی ۔ دورانِ تعمیر میں علامہ نے ایک دن بھی آ کر نہیں دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے ۔ جب کوٹھی تیار ہو گئی تو والدۂ جاوید اس میں آ کر بہت خوش ہوئیں مگر افسوس کہ یہاں ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی اور چند روز کے بعد ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا ۔

ان کے سنگِ مزار پر جو تاریخ کندہ ہے اسے حاجی دین محمد نے کتابت کیا تھا ۔ [ان کی تاریخِ وفات "سرمۂ ماذاغ" (۱۳۵۴ھ) سے برآمد ہوتی ہے]۔

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو جب علامہ اقبال کا انتقال ہوا تو ان کا سر علی بخش ہی کی گود میں تھا ۔ صبح ہی صبح جب اس نے آ کر مجھے علامہ کے سانحۂ ارتحال کی خبر دی تو وہ زار و قطار رو رہا تھا ۔

علامہ کے احباب کے ساتھ علی بخش کے تعلقات نہایت مخلصانہ اور دوستانہ تھے ۔ جب ہم علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو علی بخش اس طرح ہم سے ملتا جیسے کوئی اپنے عزیزوں سے ملتا ہے ۔ پروفیسر محمود شیرانی مرحوم تو علی بخش کو "پیر بھائی" کہتے تھے ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جو لوگ علامہ کی خدمت میں مریدی کا شرف رکھتے ہیں ، علی بخش بھی ان میں شامل ہے ۔

یوں تو علامہ کے ہاں رحما وغیرہ اور ملازم بھی تھے مگر آنے جانے والوں کی تواضع کرنا اور علامہ کو مہمانوں کی آمد کی اطلاع دینا صرف علی بخش کی ذمہ داری تھی اور وہ اس ذمہ داری کو نہایت مستعدی سے نبھاتا تھا ۔ وہ علامہ کے ملنے والوں میں بے حد مقبول تھا اور سب لوگ اس کی عزت کرتے تھے ۔ بعض اوقات وہ موقع نکال کر علامہ کے احباب کی خیریت دریافت کرنے کے لیے ان کے گھر بھی پہنچ جاتا تھا ۔

وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے معاملے میں اس قدر مستعد اور دیانت دار تھا کہ ہم نے کبھی علامہ اقبال کو اس کے ساتھ ترش روئی سے بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا ۔ علامہ جب کوئی کتاب اپنی لائبریری سے لانے کے لیے اسے کہتے تو وہ بالکل صحیح کتاب لاتا ۔

ہم نے اسے علامہ کے ہاں ہمیشہ خوش اور مطمئن دیکھا اور علامہ بھی اس سے پوری طرح مطمئن تھے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی دیانت داری تھی جس نے اسے ہر ایک کی نظر میں معتمد بنا دیا تھا اور سب لوگ اس پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔

حضرتِ علامہ اور ان کے احباب بعض اوقات علی بخش کے ساتھ دل لگی بھی کرتے اور باتوں ہی باتوں میں اس کی شادی طے ہو جاتی۔ پھر پلاؤ وغیرہ کا انتظام ہوتا اور یار لوگ دعوت اڑا کر بعد میں اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہتے کہ دلھن والے بہت ہی خراب لوگ تھے۔ انھوں نے انکار کر دیا ہے۔ مگر مایوسی کی کوئی بات نہیں، ایک اور جگہ بات چیت چل رہی ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔

پاکستان بن جانے کے بعد جب سردار عبدالرب نشتر پنجاب کے گورنر بنے تو انھوں نے علی بخش کی خدمات کے صلے میں اسے دو مربع زمین دینے کی حکومت سے سفارش کی۔ یہ سفارش یا مراسلہ کافی عرصہ لینڈ ریکارڈ کے دفتر میں پڑا رہا اور کسی نے اس پر توجہ نہ دی۔ اتفاق سے ایک مرتبہ میری ملاقات مسٹر ظہور الدین بن نظام الدین سے ہوگئی جو ان دنوں لینڈ ریکارڈ کے دفتر میں متعین تھے۔ میں نے ان سے علی بخش کے لیے گورنر کی سفارش کا ذکر کیا اور ان سے درخواست کی کہ اس پر عمل درآمد کرانے میں مدد کریں اور فائلوں میں وہ سفارش تلاش کریں۔ انھوں نے وعدہ کر لیا اور بالآخر گورنر کی چٹھی تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ دوبارہ جب ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے یہ مژدہ سنایا کہ چٹھی تو مل گئی ہے مگر ابھی اس پر عمل درآمد ہونا باقی ہے۔ پھر جب زمین کی تلاش شروع ہوئی تو دو کی بجائے صرف ایک مربع لائل پور

کے ضلع میں مل سکا ۔ چنانچہ اسی کو غنیمت جان کر علی بخش نے قبول کر لیا اور دوسرے مربع کے چکر میں نہیں پڑا ، ورنہ عین ممکن تھا کہ سرخ فیتے کے چکر میں ایک سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ۔ آج کل لائل پور کی اس زمین پر علی بخش کے اعزّہ قابض ہیں اور خوب مزے میں ہیں ۔

شاعرِ مشرق کا یہ وفا شعار خدمت گار کم و بیش چالیس برس تک علامہ اقبال کی خدمت میں رہا اور بالآخر ۲ جون ۱۹۶۹ع کو اس نے بھی داعیِ اجل کو لبیک کہا ۔ اس کا انتقال ضلع لائل پور کے چک نمبر ۱۸۸ آر ۔ بی میں ہوا جہاں حکومتِ پاکستان نے اسے اراضی الاٹ کی تھی ۔ آخری عمر میں اس کو حجِ بیت اللہ کی سعادت بھی نصیب ہو گئی تھی اور اپنے علاقے میں وہ حاجی علی بخش کے نام سے مشہور تھا ۔

☆ ☆ ☆

۹۰

ڈاکٹر سیموئل ایم۔ زویمر

۱۹۲۸ء کے موسم سرما میں ایک مرتبہ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے لاہور کی دعوت پر عیسائی مذہب کے مشہور مبلّغ اور رسالہ ’’مسلم ورلڈ‘‘ کے مدیر ڈاکٹر سیموئیل ایم۔زویمر لاہور تشریف لائے۔ اس وقت وائی۔ ایم۔ سی کے سیکرٹری مسٹر ہیوم تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر زویمر کے لیکچر کا انتظام کیا اور علامہ اقبال سے درخواست کی کہ آپ صدارت کریں جو کافی تأمل کے بعد علامہ نے قبول فرمالی۔ جلسہ بعد نماز مغرب قرار پایا جس میں لاہور کے لکھے پڑھے مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور عیسائی حضرات نے بھی خاصی تعداد میں شرکت کی تھی۔ علامہ وقتِ مقررہ پر نواب ذوالفقار علی خاں، چودھری محمد حسین اور مرزا جلال الدین وغیرہ کے ہمراہ جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس کے بعد جلسے کی کارروائی بغیر رسمی باتوں کے شروع ہوگئی۔ سب سے پہلے علامہ نے ڈاکٹر زویمر کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ ڈاکٹر زویمر نے تمام عمر عیسائیت کی تبلیغ میں صرف کر دی ہے اور وہ ایک سہ ماہی رسالے ’’دی مسلم ورلڈ‘‘ کے مدیر بھی ہیں۔ اس رسالے کا مطالعہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے تاکہ مسلمان دیکھیں کہ دوسرے مذاہب ان کے

متعلق کیا لکھتے ہیں کیونکہ اس رسالے کے مضامین میں عیسائیت کی اسلام پر فوقیت دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ ڈاکٹر زویمر کے لیکچر کا موضوع ابھی تک ظاہر نہیں کیا گیا تھا اور اس طرح منتظمینِ جلسہ نے نہایت ہوشیاری دکھائی تھی ۔ علامہ نے اپنی افتتاحی تقریر میں واضح کر دیا تھا کہ مسلمانوں کو ڈاکٹر زویمر کا لیکچر نہایت توجہ سے سننا چاہیے ۔ اس میں بہت سے نکات ان کے لیے ایسے ہوں گے جو ان کی گہری توجہ کے محتاج ہوں گے ۔

اس مختصر تعارفی تقریر کے بعد ، جسے حاضرین نے نہایت توجہ سے سنا ، علامہ نے ڈاکٹر زویمر سے تقریر کرنے کی درخواست کی اور ساتھ ہی کہا کہ اپنے لیکچر کا موضوع خود ہی بیان فرمائیے ۔ چنانچہ ڈاکٹر زویمر کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ میرے لیکچر کا موضوع ''ماخذِ مطالعۂ اسلام'' ہوگا ۔ یہ ماننا پڑے گا کہ اس عیسائی پادری کا لب و لہجہ نہایت متین اور تلفّظ بہت واضح تھا ۔ اس نے نہایت عمدگی سے بغیر کسی ذاتی تنقید کے ماخذِ اسلام کے طور پر قرآن کریم ، کتبِ تفاسیر ، کتب احادیث ، فقہ ، اصولِ فقہ اور اسلامی تاریخ کی تمام مشہور اور اہم کتابوں کی فہرست مسلمانوں کے سامنے اس طرح پیش کی کہ لوگ حیران رہ گئے ۔ اس نے نہ تو خود کوئی تنقید کی اور نہ دوسروں کے لیے کسی قسم کی تنقید کی گنجائش چھوڑی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک مسلمان ریسرچ سکالر کلاس کے طلبا کو ضروری کتابوں کی فہرست ریسرچ کے لیے لکھوا رہا ہے ۔ ہر کتاب اور اس کے مصنّف کا پورا نام اور اس کا زمانۂ تالیف آپ نے وضاحت سے پیش کیا ۔ یہ تقریر ایک گھنٹے سے زیادہ جاری رہی جسے لوگوں نے نہایت توجہ اور دلچسپی سے سنا ۔ کسی قسم کا شور یا رکاوٹ نہیں ہوئی ۔ اپنی تقریر میں ڈاکٹر زویمر نے اعتراف

کیا کہ مسلمان مصنّفین نے علوم کی جو خدمت کی ہے وہ کسی نے نہیں کی ۔

اس کے بعد لوگوں کی نظریں علامہ پر لگی ہوئی تھیں کہ آپ کیا ریمارک اس تقریر پر پیش کرتے ہیں ۔ دراصل اس جلسے کی رونق بھی ایک طرح علامہ ہی کی وجہ سے تھی ورنہ ایک عیسائی کے تبلیغی لیکچر پر مسلمان ذرا کم توجہ کرتے ہیں ۔ چنانچہ آپ نے اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر زویمر کی تعریف کی اور کہا کہ ڈاکٹر زویمر نے نہایت مفید اور جامع فہرستِ کتب متعلقۂ مطالعۂ اسلام پیش کی ہے جس سے آپ کی اسلام سے واقفیت واضح ہوتی ہے ۔ علامہ نے یہ بھی کہا کہ میرا خیال تھا آپ بحیثیت مبلّغِ عیسائیت کسی مذہبی پہلو پر اصولی روشنی ڈالیں گے مگر آپ نے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا اور اپنے آپ کو بچا لیا ۔ آپ نے یہ اقرار بھی کیا کہ ہم ڈاکٹر زویمر کی تقریر سن کر بہت مستفید ہوئے ہیں ، تاہم واضح کر دیا کہ یہی فہرست ہمیں ایک کتاب Finance Theory of Islam (از آگسٹس) میں بھی ملتی ہے جو کولمبیا یونیورسٹی نیویارک سے شائع ہو چکی ہے ۔ علامہ نے مسلمانوں کو خاص طور پر ہدایت کی کہ ہم سب کو بھی ایسے مصنفّین کی تحریروں سے آگاہ رہنا چاہیے ۔ اس کے بعد یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا ۔

اس کے دوسرے روز نواب ذوالفقار علی خاں نے ڈاکٹر زویمر کو اپنے مکان پر شام کے کھانے پر مدعو کیا جس میں علامہ اقبال بھی شریک ہوئے ۔ بعد میں انھوں نے دعوت میں ڈاکٹر زویمر سے اپنی بات چیت کی تفصیل بھی سنائی تھی ۔

حالات و واقعات سے پتا چلتا ہے کہ علامہ اقبال ڈاکٹر سیوئیل زویمر کو بحثیت مبلّغِ عیسائیت اس سے پیشتر بھی خوب جانتے تھے۔

علامہ اپنے ایک طویل مراسلے میں خالد خلیل (ترک فاضل) کو ڈاکٹر زویمر سے متعلق لکھتے ہیں :

"۔ ۔ ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زویمر کا نام بھی لوں گا جو قاہرہ میں ایک امریکن مشنری ہیں ۔ وہ اسلام کی مخالفت میں ایک رسالہ "مسلم ورلڈ" کی ادارت بھی کرتے ہیں ۔ انھوں نے متعدد کتابوں اور مضامین کی صورت میں ملت اسلامی پر بہت کچھ لکھا ہے ۔ گزشتہ سال وہ لاہور آئے تھے اور اُنھوں نے مجھے جرمن زبان کی ایک کتاب دکھائی تھی جس میں اسلام اور مللِ اسلام پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے عنوانات درج تھے ۔ میں اس کے مصنّف کا نام بھول گیا ہوں مگر یہ آسانی سے دریافت کیا جا سکتا ہے ۔ اگر آپ ڈاکٹر زویمر کو لکھیں تو وہ آپ کو بتا دیں گے ۔ یہ کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور اس سے اغلباً آپ کو ایسی کتابوں کے نام ملیں گے جو آپ کے مضمون سے متعلق ہیں ۔"

غرض کہ علامہ اقبال اپنے گرد و پیش سے خوب واقف تھے اور خصوصاً اسلام کے بارے میں یا اس کے خلاف دنیا میں جو کچھ شائع ہوتا تھا اُس سے مکمل آگاہی رکھتے تھے ۔

☆ ☆ ☆

۹۱

گابا کا قبولِ اسلام

لاہور کے ایک مشہور و معروف بیرسٹر، ماہرِ بنکاری اور لکھ پتی تاجر لالا ہرکشن کے صاحبزادے مسٹر کنھیا لال گابا نے جب قبولِ اسلام کا اعلان کیا تو لاہور میں ان کے اعزاز میں کئی دعوتوں کا اہتمام کیا گیا۔ علامہ اقبال بھی ان دعوتوں میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ مسٹر گابا نے قبولِ اسلام کے اعلان سے بہت پہلے راولپنڈی کے ایک مسلمان بیرسٹر عبدالعزیز کی بیٹی سے شادی کر لی تھی اور اس سے اس کے کئی بچے بھی تھے۔ مسٹر عبدالعزیز کو بیٹی کی اس حرکت سے کوئی ملال نہیں تھا کیونکہ بعد میں مسٹر گابا بال بچوں سمیت داخلِ اسلام ہو گئے تھے۔ گابا نے مسلمان ہونے کے بعد انگریزی زبان میں ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام ''پیغمبرِ صحرا'' (''دی پرافٹ آف دی ڈیزرٹ'') تھا۔ وہ انگریزی زبان کے بہت اچھے انشا پرداز تھے اور انھوں نے بہت عمدہ کتاب لکھی تھی۔ اصل میں مسٹر گابا نیشنلسٹ تھے لہٰذا جب ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی تو وہ پاکستان چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے اور بدستور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے رہے۔ وہ کہتے تھے کہ چونکہ مجھے پاکستان کے قیام سے اصولی طور پر

اختلاف ہے اس لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ پاکستان میں رہوں۔

اس ضمن میں یہ بھی یاد رکھنے والی بات ہے کہ جب علامہ اقبال جنوری ۱۹۳۳ء میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپس آئے تو خواجہ عبدالوحید نے ان کے اعزاز میں گول باغ (میونسپل گارڈن) میں چائے کی ایک دعوت کا انتظام کیا جس میں متعدد اہلِ علم نے شرکت کی۔ اس دعوت میں لاہوری جماعتِ احمدیہ کے مولوی محمد علی اور دیگر کئی حضرات بھی مدعو تھے۔ وہاں لوگوں کو اس بات کا بھی علم تھا کہ آج ہی مسٹر کنھیا لال گابا اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کریں گے۔ چنانچہ اس دعوت سے علامہ اقبال، مولوی محمد علی اور وہ تمام حضرات چپکے سے اٹھ کر چلے گئے جنھوں نے خاص طور پر اس کے مسلمان کرنے میں حصہ لیا تھا۔ اس کے اگلے ہی روز اخبار میں آ گیا کہ گابا مسلمان ہو گیا ہے۔ اس کے فوراً بعد خورشید منزل بلال گنج میں ان کے اعزاز میں ایک نہایت پُرتکلف دعوت کا انتظام کیا گیا تھا جس میں علامہ اقبال اور دیگر احباب نے بطورِ خاص شرکت کی تھی۔

☆ ☆ ☆

۹۲

علامہ کا لباس و حلیہ

جب علامہ انارکلی والے مکان میں رہتے تھے تو آپ کے ہاں اپنی ایک گھوڑا گاڑی تھی جیسے گگ کہا جاتا تھا اور اکثر آپ خود ہی اُسے چلاتے تھے۔ جب آپ ہائی کورٹ یا ابتدا میں کالج جاتے تھے تو اسی گاڑی میں سوار ہو کر جاتے تھے۔ اُن دنوں آپ سوٹ پہنتے تھے اور سر پر ترکی ٹوپی ہوتی تھی۔ میرے خیال میں ۱۹۱۳ع کے بعد ترکی ٹوپی آپ نے ترک کر دی تھی۔ جب مال روڈ پر آپ اس تزک و احتشام کے ساتھ نکلتے تھے تو اکثر لوگ اس نظارے کا لطف اُٹھانے کی غرض سے تھم جاتے۔

عام طور پر علامہ لنگی اور کلاہ پہنتے تھے اور لنگی کے ساتھ شلوار زیبِ تن کرتے تھے جس سے ایک الگ ہی شان نظر آتی تھی۔ جن لوگوں نے آپ کو ''خضرِ راہ'' نظم پڑھتے سنا ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ اسی لباس میں تھے اور تکیہ لگا کر بیٹھ کر نظم پڑھی تھی۔ جب آپ میکلوڈ روڈ پر آ گئے تھے تو لباس میں یہاں بھی کوئی خاص تغیر نہیں آیا تھا۔ آپ کے لباس کا انتظام عام طور پر منشی طاہر الدین اور علی بخش کیا کرتے تھے۔ آپ کے لباس کی پیمائش کمرشل بلڈنگ مال روڈ کے ''عبدالرحمٰن اینڈ سن'' کے ہاں موجود

تھی - ۱۹۲۹ء کی ابتدا میں جب ہم مدراس جانے لگے تو آپ کا ایک نیا سوٹ بھی ہمراہ لے گئے جو غالباً علی بخش ہی "عبدالرحمٰن اینڈ سن" کے ہاں سے سلوا کر لایا تھا - چونکہ وہ پرانی پیمائش پر سلا ہوا تھا، جب ہم نے آپ کو لیکچر کے موقع پر پہنایا تو وہ بہت ڈھیلا تھا مگر آپ نے کوئی خیال نہ کیا اور وہی پہن کر لیکچر دیا - موسمِ گرما میں عموماً ایک بنیان اور تہبند آپ کا گھر کا لباس ہوتا تھا جسے اکثر ملنے والوں نے دیکھا ہے - موسمِ سرما میں آپ ایک صدری ضرور پہنتے تھے، جیسا کہ اکثر تصاویر میں بھی وہ نظر آتی ہے مگر گھر آ کر اسے الگ کر دیتے اور کابلی 'دھسّہ' اوڑھ لیتے، تاہم صدری بھی ہمراہ رہتی تھی - غرض کہ نہایت سادہ لباس ہوتا تھا - مجھے یاد ہے ایک دفعہ منشی طاہر الدین نے آپ کے لیے ایک نئے کابلی دھسّے کا انتظام کیا تھا جو اُس زمانے میں پچھتر روپے کا ملتا تھا - اس کے دونوں حصوں کی سلائی میں نے اپنے گھر سے کروا کے دی تھی -

اگر نہایت تکلف کا موقع آتا تو آپ تکلف سے بچنے کے لیے ٹائی پر "بو" کو ترجیح دیتے، جیسا کہ ایک دفعہ علی گڑھ میں مجھے شہر بھیج کر اس کا انتظام کیا تھا - یہ امر بیان کرنے کے قابل ہے کہ آپ جو بھی کپڑا پہن لیتے وہ آپ پر خوب سجتا اور آپ کا ہر لباس باعزت اور بارعب ہوتا جو کسی قسم کے لوازمات کا محتاج نہ ہوتا -

جیسا کہ ذکر ہوا، نجی دعوتوں میں آپ شلوار قمیص اور لنگی ہی پہنتے تھے - ایک دفعہ عبدالرحمٰن چغتائی سے باتوں باتوں میں سر کے لیے ٹوپی یا عمامے کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا کہ "لباسِ سر" ایک بہت بڑا مسئلہ ہے - اس کا کوئی علاج کرنا چاہیے -

علی بخش نے بیان کیا ہے کہ علامہ ابتدا میں زیادہ تر شلوار قمیض اور عام کوٹ پہنتے تھے مگر کبھی کبھی بند گلے کا فراک کوٹ بھی پہن لیتے تھے - سر پر موتیے رنگ کی پگڑی بھی ہوتی تھی -

آپ کی شلوار قمیص قلعہ گوجر سنگھ کا ایک بوڑھا سا درزی نظام الدین تیار کیا کرتا تھا -

غرض کہ آپ نہایت سادہ مزاج تھے - مجھے یاد ہے ہم ایک مرتبہ علی گڑھ جا رہے تھے - لاہور سے ہم بمبئی میل میں سوار ہوئے تھے اور دہلی سے ہمیں گاڑی تبدیل کرنی تھی - گاڑی میں ابھی خاصا وقت تھا ، آپ نے خوہش ظاہر کی کہ کسی حجام کا انتظام ہو جائے تو شیو کرا لی جائے - میں نے حجام کا انتظام کیا تو آپ نے اُسے ہدایت کی کہ اُسترا ایک ہی رخ لگانا ہے - مگر اس نے آپ کی مرضی کے خلاف عمل کیا جس سے آپ بہت ناراض ہوئے -

اگر کبھی کوئی خاص ملنے والا آ جاتا تو آپ بہ خندہ پیشانی اس سے گفتگو کرتے مگر کبھی اس کی وجہ سے اپنا لباس یا حلیہ تبدیل نہیں کیا -

۹۳

علامہ اقبال اور رموزِ قرآن

ہر راسخ العقیدہ مسلمان قرآن کریم کے رموز و اشارات کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا ۔ قرآن مجید کی تفسیر اور اس کے مطالب کی تشریح کا کام بے انتہا نازک اور غیر معمولی احتیاط کا متقاضی ہے ۔ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے علامہ اقبال نے بھی اس وادیِ پُرخار میں قدم رکھا اور ایک طویل مدت قرآن کریم کے مطالعے اور اس کے رموز و اشارات کو سمجھنے میں صرف کر دی ۔ ان کی خواہش تھی کہ جس طرح خود انھوں نے کلامِ الٰہی کے اسرار و رموز تک رسائی حاصل کی ہے ، دوسرے مسلمان بھی اسی طرح کتاب اللہ کو اپنے لیے وظیفۂ حیات بنائیں ۔ وہ اپنے والدِ ماجد کی اس نصیحت کو اکثر دہرایا کرتے تھے کہ قرآن کریم کو اس طرح پڑھو جیسے خود تمھارے اوپر وہ نازل ہو رہا ہے ۔

قرآن پاک کے ساتھ علامہ اقبال کی شیفتگی اور اس کی تفسیر و تشریح کے سلسلے میں ان کی کد و کاوش کو اکثر اہلِ علم نے موضوعِ گفتگو بنایا ہے ۔ اس ضمن میں متعدد مقالات کے علاوہ دو مستقل کتابیں بھی میری نظر سے گزر چکی ہیں جو غیر معمولی قدر و قیمت

کی حامل ہیں - ایک ابو محمد مصلح صاحب کی کتاب ''اقبال اور قرآن'' جو ۱۳۵۹ھ (۱۹۴۰ع) میں حیدر آباد کن سے شائع ہوئی اور دوسری قاضی محمد ظریف صاحب کی ''اقبال ــ قرآن کی روشنی میں'' جو دسمبر ۱۹۵۰ع میں دو جلدوں میں شائع ہوئی -

ابو محمد مصلح صاحب کو میں نے پہلی مرتبہ جنوری ۱۹۲۹ع میں حیدر آباد دکن میں دیکھا تھا جب وہ علامہ اقبال سے ملنے کے لیے آئے تھے - انہوں نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا اور دیر تک علامہ کے ساتھ قرآنِ کریم کے رموز پر گفتگو کرتے رہے تھے - اس زمانے میں وہ انگریزی اور اردو زبان میں ایک نہایت بلند پایہ مجلہ ''دی قرآنک ورلڈ'' نکالا کرتے تھے جس کے مضامین اہلِ علم میں بہت دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے - اس کے بعد سنہ ۱۹۳٦ع میں ابو محمد مصلح لاہور آ گئے تھے جہاں وہ بادشاہی مسجد کے مشرق حجروں میں رہا کرتے تھے - یہیں ایک روز ان سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے علامہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی - چنانچہ میں ان کی خواہش پر انہیں علامہ کی خدمت میں لے گیا تھا - انہوں نے کچھ کتابیں اور رسائل بھی اٹھا رکھے تھے جو علامہ نے دیکھ کر بہت پسند کیے - اسی ملاقات میں انہوں نے اپنے ایک قاعدے کا ذکر بھی علامہ سے کیا جو بچوں کو قرآن مجید پڑھانے کے سلسلے میں انہوں نے ایجاد کیا تھا - اس ضمن میں علامہ کا یہ خط ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے راقم کو لکھا تھا :

''ڈیئر ماسٹر صاحب !

مولوی ابو محمد مصلح صاحب کا پتا مجھے معلوم نہیں ، اس واسطے آپ کو تکلیف دیتا ہوں - ان کی خدمت میں عرض کیجیے کہ مجھے اس کتاب کی ضرورت ہے جس میں انہوں نے

بچوں کو قرآن پڑھانے کا طریق ایجاد کیا ہے - جس روز
آپ کی معیت میں وہ مجھ سے ملے تھے اسی روز اس کتاب
یا قاعدے کا ذکر کیا تھا - اس قاعدے کی جاوید کے لیے
ضرورت ہے -[1] [illegible] محمد اقبال“

جب میں اپریل ۱۹۳۸ع میں یورپ سے واپس آیا تو مولوی
ابو محمد مصلح صاحب لاہور ہی میں تھے - ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ع کو
علامہ اقبال کا انتقال ہوا تو وہ ابھی تک شاہی مسجد میں قیام پذیر
تھے - مجھے یاد ہے ، ہم کچھ دوست مل کر حاجی رحیم بخش ریٹائرڈ
سیشن جج کے مکان پر ان سے قرآنِ کریم کی تعلیم حاصل کیا کرتے
تھے - میں ۱۹۳۸ع کے اخیر میں پونہ بمبئی چلا گیا اور مولوی
ابو محمد مصلح حیدر آباد دکن چلے گئے جہاں انھوں نے متذکرہ کتاب
”قرآن اور اقبال“ لکھی اور شائع کرائی - ۱۹۴۱ع کے بعد ان سے
میری ملاقات نہیں ہوئی اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کہاں ہیں اور
کس حال میں ہیں - انھوں نے خود بتایا تھا کہ وہ صوبہ بہار ضلع
شاہ پور کے رہنے والے ہیں -

اس میں کوئی شک نہیں کہ رموزِ قرآن کے سلسلے میں علامہ
اقبال اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتے تھے - اس ضمن میں انھوں نے
ہمیشہ اجتہاد سے کام لیا اور تقلید سے مجتنب رہے - وہ اکثر اپنے
دوستوں کو بھی اس سعادت میں شامل کر لیا کرتے تھے - چنانچہ
”ملفوظاتِ اقبال“ میں مرزا جلال الدین بیان کرتے ہیں کہ ”اکثر
مجالس میں ڈاکٹر صاحب سے قرآنِ کریم کے رموز سننے کا بھی ہمیں

۱- اقبال نامہ ، حصہ دوم ، ص ۳۳۹ - ۳۴۰ -

موقع ملا ـ"!!

جب علامہ اقبال انارکلی والے مکان میں رہتے تھے تو روزانہ صبح کے وقت پچھلی گلی والی کھڑکی میں بیٹھ کر بلند آواز سے دلکش انداز میں قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے تھے ـ قرآن مجید سے ان کی محبت اور شیفتگی کا اظہار اس انگریزی خط سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء کو سر راس مسعود کو لکھا تھا ـ اس خط کا مندرجہ ذیل فقرہ قابلِ توجہ ہے :

"... میری تمنّا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلم بند کر جاؤں ـ"

جب اس خط کا جواب علامہ کو موصول ہوا تھا تو اتفاق سے راقم بھی ان کی میو روڈ (موجودہ نام علامہ اقبال روڈ) والی کوٹھی "جاوید منزل" میں ان کی خدمت میں موجود تھا ـ آپ اس وقت کوٹھی کے صحن میں آرام کر رہے تھے اور منشی طاہر الدین بھی آپ کی خدمت میں حاضر تھے ـ اس خط میں دوسری باتوں کے علاوہ والی بھوپال کی طرف سے وظیفے کی منظوری کا ذکر بھی تھا جس پر علامہ نے مسرت اور اطمینان کا اظہار فرمایا تھا ـ خط پڑھنے کے بعد علامہ نے منشی طاہر الدین سے کہا "آفتاب کی ماں سے کہنا کہ وہ بھی آیندہ ہر مہینے پچاس روپے آ کر لے جایا کرے" مگر ابھی آپ نے یہ جملہ مکمل نہیں کیا تھا کہ وہ خود آ گئیں ـ چنانچہ منشی صاحب نے علامہ کو ان کی آمد کی اطلاع دی ـ

اس کے بعد آپ نے راس مسعود کو شکریے کا خط لکھا جس میں یہ بھی لکھا :

۱ـ ملفوظات اقبال ، مرتبہ محمود نظامی ، لاہور ، ص ۷۱ ـ

"ڈیئر مسعود! آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے ۔ میں کس
زبان سے اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کروں ۔ میں خود حاضر
ہو کر شکریہ ادا کروں گا ۔ محمد اقبال"

ابھی ہم علامہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ سید افضال علی حسینی کسی ترک شہزادے کو علامہ سے ملانے کے لیے لائے جو حیدرآباد دکن سے آئے ہوئے تھے ۔

اوپر علامہ نے سر راس مسعود کے نام اپنے خط میں قرآن کریم کے متعلق اپنے افکار قلم بند کرنے کا ذکر فرمایا ہے ۔ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا وہ پختہ ارادہ رکھتے تھے ، مگر ان کی صحت جواب دے گئی اور یہ ارادہ عمل میں نہ آ سکا ۔

☆ ☆ ☆

۹۴

علامہ اقبال کے خطوط

میرے مشاہدے میں دو شخص ایسے آئے ہیں جو خطوط کا جواب دینے کے سلسلے میں اس قدر باقاعدگی اور ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے تھے کہ دوسرا کوئی پڑھا لکھا آدمی اس ضمن میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مکاتیب کی کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے بھی شاید ہی ان کا کوئی ثانی ہوگا۔ ان میں سے ایک تو علامہ اقبال تھے جن کا دستور یہ تھا کہ ادھر ڈاکیہ خطوط دے کر جاتا تھا اور اُدھر وہ اپنے خدمت گار علی بخش کو فوراً قلم دان اور کاغذات کا ڈبہ لانے کی ہدایت فرماتے تھے۔ پھر فوراً جواب لکھتے تھے اور اُسی وقت علی بخش کے حوالے فرماتے تھے کہ لیٹر بکس میں ڈال آئے۔

علامہ کا خطوط لکھنے کا لیٹر پیڈ ابتداءً ایک ہی طرح کا تھا جس کے بائیں کونے میں اوپر کی طرف ہاتھی کی چھوٹی سی اُبھری ہوئی تصویر بنی ہوتی تھی مگر جب آپ لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بن گئے تو کسی دوست نے آپ کے نام کا پیڈ بنوا دیا جس کے ساتھ ایم۔ ایل۔ سی کے حروف بھی ہوتے تھے (یعنی ممبر لیجسلیٹو کونسل)۔

دوسرے صاحب جو خطوط کا جواب نہایت باقاعدگی سے دیتے تھے، ڈاکٹر مولوی عبدالحق (بابائے اردو) تھے۔ ان کا قاعدہ یہ تھا کہ

روزانہ دوپہر کے وقت ان کا ملازم خود ڈاک خانے جاکر ڈاک لے آتا تھا ۔ آپ ان کا مطالعہ کرتے مگر جواب دوسرے روز صبح کے وقت ناشتے کے فوراً بعد لکھتے تاکہ ملازم جب دوسرے روز کی ڈاک لینے کی غرض سے جائے تو ان خطوط کو بھی حوالۂ ڈاک کر آئے ۔

ایک ہی شہر میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے اگرچہ شروع سے ہی راقم کو علامہ سے تعارف کا شرف حاصل تھا مگر زیادہ قریب ہونے کا موقع ۱۹۱۴ع میں ہوا اور پھر یہ تعلقات ان کی زندگی کے آخری سانس تک برقرار رہے ۔ میں سفر و حضر میں علامہ کے ایک ادنیٰ مصاحب اور خدمت گار کی حیثیت سے ان کی خدمت میں حاضر رہا ۔ چنانچہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ انھوں نے ہزاروں خطوط اپنے اعزہ ، احباب اور اہلِ علم کو بصورتِ جواب لکھے ۔ ان میں سے بیشتر خطوط علمی استفسارات کے جواب میں ہوتے تھے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ عام نوعیت کے خطوط کو نظر انداز کر دیتے تھے ۔ عام طور پر لوگ کاتبِ خط کی اخلاقی حالت اور خط کے مضمون کی اہمیت کے علاوہ ذاتی حالات کو مدِ نظر رکھ کر جواب دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کرتے ہیں ۔ بعض اوقات عدیم الفرصتی اور جسمانی عوارض بطورِ خاص جواب لکھنے سے مانع ہوتے ہیں مگر حضرت علامہ نے باوجود جسمانی عوارض ، علمی مطالعے میں استغراق اور عدیم الفرصتی کے کبھی جواب لکھنے سے گریز نہیں فرمایا ۔ وہ اکثر جسمانی عوارض میں مبتلا رہے جس کا ذکر انھوں نے بار بار اپنے احباب کے نام خطوط میں بھی کیا ہے مگر پھر بھی خطوط نہایت باقاعدگی سے لکھتے رہے ۔ چنانچہ ۱۹۰۲ع میں اپنے دوست منشی سراج الدین احمد کو ، جو کشمیر میں رہتے تھے ، یوں اپنے حالات سے آگاہ فرماتے ہیں :

"ڈیئر سراج!

دو تین روز سے طبیعت بہ سبب دورۂ درد کے علیل ہے۔ یہ چند شعر قلم برداشتہ آپ کے شکریے میں عرض کرتا ہوں۔ میرا ارمغان یہی ہے۔ اسے قبول کرکے مجھے مشکور کیجیے۔ چاہیں تو پیشانی پر چند اردو سطور لکھ کر "مخزن" میں بھیج دیجیے۔ والسلام

آپ نے مجھ کو جو بھیجی ارمغان انگشتری

دے رہی ہے مہر و الفت کا نشان انگشتری . . ." الخ

جہاں تک کم فرصتی یا فراغ بالی کا تعلق ہے، یہ دونوں امر زیادہ تر انسان کے ذاتی احساسات اور نفسیاتی کیفیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ صورتِ واقعہ خواہ کچھ ہو مگر انسان کے اعلیٰ اخلاق و کردار کا تقاضا یہ ہے کہ وہ فرضی یا واقعی موانع کو ادائیگیِ فرائض کے راستے میں حائل نہ ہونے دے۔ اقبال جو کچھ تھے اور ان کی مصروفیات جس نوعیت کی تھیں وہ کسی سے پوشیدہ نہ تھیں۔ ہر وقت ان کے گرد احباب کا ایک مجمع رہتا تھا جو طرح طرح کے مسائل پر ان سے گفتگو کرتے تھے۔ نہ صرف علمی اور سیاسی مسائل کے سلسلے میں وہ علامہ سے استمداد کرتے تھے بلکہ ذاتی اور خانگی مشکلات کے سلسلے میں بھی وہ علامہ اقبال کو اپنا مشکل کشا سمجھتے تھے۔ جب اس قسم کی مصروفیات سے کچھ وقت بچتا تھا تو وہ مطالعۂ علمی اور فکرِ شعر و سخن میں منہمک ہو جاتے تھے۔ پھر فکرِ معاش بھی ساتھ ساتھ تھا جس سے کبھی بھی وہ مکمل طور پر چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ تاہم ان تمام مصروفیات کے باوجود وہ خطوط کا بروقت جواب نہ دینا گناہ سمجھتے تھے اور اسے اخلاقی کمزوری پر محمول فرماتے تھے۔

خطوط لکھتے وقت وہ بعض امور پر بطورِ خاص توجہ دیتے تھے - ایک تو تاریخ نہایت التزام سے لکھتے تھے ، دوسرے مکتوب الیہ کا پتہ بہت چھان بین کے بعد درج فرماتے تھے اور تیسرے خط کے اختتام پر اپنا نام اور اس کے جزو ''محمدؐ'' پر 'ص' (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کا حرف بہت باقاعدگی سے لکھتے تھے - ان کے تمام خطوط میں یہ امور قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں -

علامہ کے خطوط کے دو تین مجموعے اس وقت میرے پیش نظر ہیں - ان میں سے قدیم ترین خط سولانا احسن مارہروی کے نام ہے جن کی کتاب ''تاریخِ ادبِ اُردو'' کسی تعارف کی محتاج نہیں - یہ خط بھی ابتداً اسی ''تاریخ ادب اُردو'' میں شائع ہوا تھا - اس خط کے آخر میں علامہ نے اپنا نام اور متعلقہ کوائف یوں درج فرمائے ہیں :

''محمد اقبال

از لاہور گورنمنٹ کالج بورڈنگ ہاؤس

۲۸ فروری ۱۸۹۹ء''

اس خط میں بھی وہ تمام لوازم درج ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے -

دوسرا خط نواب حبیب الرحمان خاں شروانی کے نام ہے جس میں اس بات کی وضاحت بھی موجود ہے کہ نواب صاحب کا خط لاہور سے ہوتا ہوا انھیں فورٹ سنڈیمن میں ملا جو بلوچستان میں واقع ہے - اپنے جواب میں علامہ نے مقام اور تاریخ اس طرح لکھی ہے :

''فورٹ سنڈیمن برٹش بلوچستان ، ۱۵ مئی ۱۹۳۰ء -''

آپ آن دنوں اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب کے پاس فورٹ سنڈیمن میں مقیم تھے جو بہ سلسلۂ ملازمت بلوچستان میں تعینات تھے اور انجینیئرنگ کے شعبے میں کام کرتے تھے -

مذکورہ خط میں نواب صاحب نے علامہ کی کسی نظم پر تنقید کی تھی جس کے جواب میں علامہ نے نہایت خندہ پیشانی سے انھیں

دعوت دی کہ ”آپ میری ہر نظم پر اسی قسم کا خط لکھ دیا کریں تو آپ کا ممنون ہوں گا۔“

بعض لوگ خط و کتابت کے ذریعے علامہ کی شاگری کا شرف حاصل کرنے کے متمنّی ہوتے تھے اور وہ انھیں حتی الوسع مایوس نہیں فرماتے تھے۔ حیدرآباد سٹی کالج کے پروفیسر ابو الظفر عبد الواحد نے ۱۹۱۸ء میں جو خط علامہ کو لکھا وہ اسی قسم کی خواہش کا آئینہ دار ہے۔ علامہ نے اس خط کا جو جواب دیا اس کے آخری حصے کے الفاظ یہ ہیں :

”. . . اگر فن سیکھنا مقصود ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کا انتخاب ٹھیک نہیں ہے۔ شاعری کے دو لوازم ہیں : زبان اور مضمون . . . تاہم خطوط کے ذریعے سے جو کچھ میں آپ کے لیے کر سکتا ہوں، اس کے لیے حاضر ہوں۔ آپ کبھی کبھی خط لکھ دیا کریں۔ جواب میں انشاء اللہ کبھی دریغ نہیں ہوگا۔“

خطوط کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان میں عموماً تصنع کا عنصر نہیں ہوتا اور لکھنے والے کا مافی الضمیر مکمل بے ریائی کے ساتھ مکتوب الیہ تک منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ خصوصیات تمام اچھے مکاتیب میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں جبکہ تصانیف میں یہ ناپید ہوتی ہیں۔ بقول شخصے خطوط میں انسان ایک طرح خود سے باتیں کرتا ہے، یہ دلی خیالات و جذبات اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہوتے ہیں۔ ہمیں بڑے لوگوں کی زندگی کے اہم ترین واقعات زیادہ تر خطوط کے ذریعے معلوم ہوئے ہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ علامہ کے بعض ایسے خطوط بھی ان کے مجموعہ ہائے مکاتیب میں شامل کر لیے گئے ہیں جو بالکل ذاتی اور نجی

نوعیت کے ہیں ۔ علامہ نے خود ایسے خطوط پر 'ذاتی' یا 'پرائیویٹ' کے الفاظ لکھ کر متنبّہ فرما دیا تھا کہ ان خطوط کی تشہیر یا اشاعت غیر مناسب ہے ، مگر ناشرین اور مرتّبین نے اس قسم کی کسی تنبیہ کی پروا نہیں کی اور انھیں شائع کر دیا ہے ۔ یہ درست ہے کہ اقبال کی ایک ایک سطر بلکہ ایک ایک لفظ قوم کی امانت ہے مگر جس حصے کو انھوں نے خود بالصراحت نجی قرار دے کر اس کی تشہیر کی ممانعت کردی تھی اسے شائع کرنا نہ صرف بے انصافی ہے بلکہ ایک طرح کی خیانت بھی ہے ۔ ایسے مکاتیب جن پر ''خفیہ'' یا ''ذاتی'' کے الفاظ انھوں نے درج کیے تھے ، دو قسم کے تھے ؛ ایک تو وہ تھے جو خالص سیاسی نوعیت کے تھے اور اس وقت کے قومی و ملّی مفاد کے پیش نظر ان پر خفیہ کے الفاظ لکھ کر ان کی تشہیر کی ممانعت کی گئی تھی ۔ مثلاً حضرتِ قائدِ اعظم کے نام بعض خطوط پر صراحۃً ''خفیہ'' کے الفاظ درج کیے جاتے تھے اور اس وقت واقعی ایسے خطوط کی تشہیر یا اشاعت مسلمان قوم کے لیے نقصان دہ ہو سکتی تھی ۔ دوسری قسم کے خطوط جن پر 'خفیہ' یا 'ذاتی' کے الفاظ درج کیے گئے ، بالکل ذاتی نوعیت کے تھے جو قریبی عزیزوں یا بے تکلف دوستوں کے نام لکھے گئے ۔ اول الذکر مکاتیب کی تشہیر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف جائز قرار پائی بلکہ مسلمان قوم کے سیاسی مستقبل کے لیے ان کی اشاعت ناگزیر ہوگئی مگر ثانی الذکر خطوط کی تشہیر کی گنجائش نہ تو اس وقت تھی اور نہ ہی بعد کے زمانے میں ملک اور قوم کو ان کی اشاعت سے کسی غیر معمولی فائدے کی توقع تھی ۔ مثلاً سر راس مسعود کے نام خانگی نوعیت کے جو خطوط لکھے گئے تھے ، دیانت داری کا تقاضا یہی تھا کہ مکتوب نگار کے حسبِ خواہش انھیں کسی صورت میں شائع نہ کیا جاتا ۔ یا کم از کم

وہ حصے حذف کر دیے جاتے جو خالص ذاتی نوعیت کے تھے ۔

خط کا جواب نہ دینا کوئی قانونی جرم نہیں ہے اور نہ ہی کسی قسم کی نالش کا خطرہ ہوتا ہے مگر صاحبِ کردار لوگوں کے لیے، جو اعلیٰ اخلاقی روایات کی پاسداری اپنا فرض سمجھتے ہیں، یہ امر کسی کچہری یا استغاثے سے کم نہیں ہے ۔ کچہری سے تو ڈگری کے بعد معاملہ ختم ہو جاتا ہے مگر یہ گلہ عمر بھر رہتا ہے کہ فلاں صاحب نے میرے خط کا جواب نہیں دیا ۔ جس طرح مقروض اُس وقت تک شرمندہ رہتا ہے جب تک وہ قرضہ ادا نہیں کر دیتا اور ہمیشہ قرض خواہ کا سامنا کرنے سے گھبراتا ہے، اسی طرح جوابِ خط سے گریز کرنے والا بھی سامنا نہیں کر سکتا ۔ مگر یہ سب کچھ اُسی وقت ہوتا ہے جب انسان اعلیٰ کردار کا مالک ہو اور اپنے اخلاقی فرائض کو پہچانتا ہو ورنہ تو ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں جو جواب دینا کسرِ شان خیال کرتے ہیں ۔

حضرت علامہ اقبال کے سلسلے میں قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ باوجود جسمانی عوارض اور دوسری مصروفیات کے انھوں نے کبھی خطوط کے جواب لکھنے میں پس و پیش سے کام نہیں لیا ۔ نہایت باقاعدگی کے ساتھ وہ خطوط لکھتے تھے لیکن غیر ضروری طوالت سے مکمل طور پر اجتناب کرتے تھے ۔ آخر عمر میں جب آپ کی بینائی جواب دے گئی تو معمول یہ ہوگیا کہ اپنے احباب اور نیازمندوں سے خطوط سنتے تھے اور جواب بھی انھی کو املا کرا دیتے تھے ۔ مکتوب الیہ سے معذرت بھی کر دیتے تھے کہ چونکہ اپنے ہاتھ سے جواب لکھنے کے قابل نہیں رہ گیا لہٰذا کسی دوست سے لکھوا کر بھیج رہا ہوں ۔ خود راقم الحروف کو جو خط ۱۳ جون ۱۹۳۷ع کو پیرس کے پتے پر علامہ نے ارسال فرمایا تھا اُس میں بھی یہ

وضاحت موجود تھی - چنانچہ اس کے آخری الفاظ یوں تھے :

”یہ خط ایک دوست کے ہاتھ سے لکھوایا ہے کہ میں
اب اپنے ہاتھ سے بہت کم لکھتا ہوں -“

اقبال کا عام مسلک ، جس پر انھوں نے عمر بھر عمل کیا ، ان کی نظم ”التجائے مسافر“ کے مندرجہ ذیل شعر سے واضح ہوتا ہے - یہ نظم انھوں نے دہلی میں حضرت نظام الدین اولیا محبوب سبحانی کے مزارِ مبارک پر بھی پڑھی تھی - شعر یہ ہے :

مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

ان کی زندگی اس شعر کی مکمل تفسیر تھی کیونکہ میرے علم اور مشاہدے کے مطابق کبھی بھی کسی کو اقبال کی زبان یا قلم سے دکھ نہیں پہنچا - دکھ دینا تو دور کی بات ہے ، کبھی شکایت کا موقع بھی انھوں نے کسی کو نہیں دیا - میں اس مسئلے پر الگ بھی لکھوں گا کہ کس طرح انھوں نے ایک صحیح الفہم ، صحیح الذہن اور صحیح الفطرت انسان ہونے کی حیثیت سے اپنے بعض افعال سے رجوع فرما لیا -

یہاں مجھے ان لوگوں سے بھی کچھ کہنا ہے جنھوں نے اقبال کے خطوط شائع کیے ہیں یا شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں - جو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان میں اس بات کی کمی بُری طرح محسوس ہوتی ہے کہ علامہ کے اسلوبِ تحریر یا خطوط کے پس منظر جیسے اہم امور کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا - اگر یہ مجموعے مکتوب الیہ کے مکمل تعارف اور عصری واقعات و سوانح پر حواشی کے التزام سے شائع ہوتے تو اس علمی کارنامے کی اہمیت دوچند ہو جاتی اور یہ ایک نہایت عمدہ علمی خدمت ہوتی - موجودہ صورت میں صرف

اتنا ہوا ہے کہ یہ خطوط محفوظ ہوگئے ہیں اور اہلِ علم حسبِ ضرورت ان کے متن سے استفادہ کر سکتے ہیں ۔ صحیح معنوں میں ان کی اشاعت کا حق اُس وقت ادا ہوگا جب مفصّل تعارف اور مکمل تحشیے کے ساتھ انہیں شائع کیا جائے گا ۔

اب تک علامہ کے کافی خطوط شائع ہو چکے ہیں مگر میرے نزدیک اب بھی سینکڑوں مکاتیب ایسے ہیں جو سامنے نہیں آئے ۔ یا تو وہ ضائع ہو چکے ہیں یا پھر بعض لوگوں کے پاس اب بھی محفوظ ہیں ۔ کاش یہ تمام خطوط سامنے آتے اور کوئی مردِ مجاہد ان میں چُھپے ہوئے علم و دانش کے موتیوں کی نشان دہی کر کے قوم کو اس خزانے سے مالا مال کر سکتا ہے ۔

ایک مرتبہ میں علامہ کی خدمت میں حاضر تھا ۔ علی بخش ڈاک لایا جس میں کسی صاحب کا ایک دستی رقعہ بھی تھا ۔ یہ رقعہ اگرچہ ڈاک سے پہلے آیا تھا مگر علی بخش نے فیصلہ کیا کہ معمول کی ڈاک کے ساتھ اسے علامہ کی خدمت میں پیش کردوں گا ۔ علامہ نے ملاقاتیوں سے معذرت کر کے فوراً خطوط کا مطالعہ شروع کر دیا ۔ پھر انھوں نے بڑے کمرے سے قلمدان منگوایا اور سب سے پہلے دستی رقعے کی پشت پر اس کا جواب لکھ کر حوالے کیا کہ جو آدمی یہ رقعہ لے کر آیا ہے اسے فوراً روانہ کر دو ۔ یہاں یہ وضاحت بھی کر دی جائے کہ علامہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کے کونے والے کمرے میں ایک چارپائی پر آرام فرمایا کرتے تھے اور ملاقاتی بھی یہیں آ کر بیٹھتے تھے ۔ دستی رقعے کے جواب سے فراغت پانے کے بعد آپ نے کاغذات کا مخصوص ڈبہ کھولا اور بقیہ خطوط کا جواب بھی اسی وقت لکھ کر علی بخش کے حوالے کیا ۔ اس کے بعد پھر ملاقاتیوں سے محو گفتگو ہوگئے اور اس تھوڑی سی غیرحاضری

پر ایک مرتبہ پھر معذرت طلب کی۔

عام طور پر علامہ خود ہی اپنے لعابِ دہن سے لفافوں پر ٹکٹ چسپاں فرماتے تھے اور اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ ٹکٹ لفافے کے دائیں کونے پر چسپاں کیے جائیں اور اگر ایک سے زیادہ ٹکٹ ہوں تو ان میں تھوڑا تھوڑا مناسب فاصلہ ہو۔ لفافوں کے جو عکس شائع ہو چکے ہیں ان سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔

علامہ کے تمام مطبوعہ خطوط سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ القاب کے سلسلے میں وہ مکتوب الیہ کے رتبے کا بطورِ خاص خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ جس قسم کے تعلقات ہوتے تھے، اندازِ تخاطب بھی بالکل ویسا ہی ہوتا تھا۔ بے تکلف دوستوں کو مکاتیب میں بھی اسی نام یا عُرف سے مخاطب فرماتے تھے جو بالمشافہ گفتگو میں ازراہِ محبت استعمال کرتے تھے۔ مجھے عام گفتگو میں بھی لفظ ''ماسٹر'' سے مخاطب فرماتے تھے اور جو خطوط انھوں نے میرے نام تحریر فرمائے ہیں ان میں بھی یہی لفظ نمایاں ہے۔ کم و بیش تمام احباب کے ساتھ ان کا یہی طرزِ عمل تھا۔

علامہ کا خط نہایت پختہ تھا جیسا کہ قدیم دستاویزات میں دیکھنے میں آتا ہے۔ اس قسم کا پختہ منشیانہ خط اب ناپید ہوتا جا رہا ہے۔

میں نے ابھی بعض پرائیویٹ خطوط کا ذکر کیا تھا جن کی اشاعت کسی بھی پہلو سے مناسب معلوم نہیں ہوتی مگر بدقسمتی سے انھیں شائع کر دیا گیا۔ ان کے علاوہ بعض خطوط ایسے ہوتے ہیں جنھیں مکتوب الیہ تو اپنے سابقہ تعلقات کی بنا پر آسانی سے سمجھ لیتا ہے مگر عام لوگوں کے لیے وہ ناقابلِ فہم ہوتے ہیں کیونکہ ان میں بعض بعض باتیں اشارۃً بیان کی جاتی ہیں اور جب تک

ان باتوں کی حواشی کے ذریعے وضاحت نہ کر دی جائے ، یہ خطوط مہمل معلوم ہوتے ہیں ۔ ایسے خطوط کو قارئین کوئی علمی کارنامہ یا ادب پارہ سمجھنے کی بجائے بعض اوقات ہدفِ تنقید بھی بناتے ہیں ۔ یہی کیفیت اُن خطوط کی ہے جو عجلت میں لکھے جاتے ہیں ۔ لکھنے والے کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتا کہ کبھی انھیں شائع کر دیا جائے گا ۔ وہ روا روی میں بعض ذاتی مسائل کو اس طرح سپردِ قلم کرتا ہے کہ مکتوب الیہ تک ان کا مفہوم منتقل ہو جائے اور بس ۔ ایسے ذاتی نوعیت کے مکاتیب کو بغیر نظر ثانی کے من و عن شائع کر دینا سراسر زیادتی ہے ۔ جب علامہ کو اپنی زندگی میں اس رجحان کا پتہ چلا تو انھوں نے اس کو سخت ناپسند کیا ۔ چنانچہ نیازالدین احمد خاں کے نام اپنے ایک خط میں ، جو لاہور سے ۱۹- اکتوبر ۱۹۱۹ع کو لکھا گیا ، تحریر فرماتے ہیں :

"مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ آپ میرے خطوط محفوظ رکھتے ہیں ۔ خواجہ حسن نظامی بھی ایسا ہی کرتے ہیں ۔ کچھ عرصہ ہوا جب انھوں نے بعض خطوط ایک کتابہ میں بھی شائع کر دیے تو مجھے بہت پریشانی ہوئی ۔ کیونکہ خطوط عجلت میں لکھے جاتے ہیں اور ان کی اشاعت مقصود نہیں ہوتی ۔ عدیم الفرصتی تحریر میں ایک ایسا انداز پیدا کر دیتی ہے جس کو پرائیویٹ خطوط میں معاف کر سکتے ہیں مگر ان کی اشاعت نظر ثانی کے بغیر نہیں ہونی چاہیے ۔ اس کے علاوہ میں پرائیویٹ خطوط کے طرزِ بیان میں خصوصیت کے ساتھ لاپروا ہوں ۔ اُمید ہے آپ میرے خطوط کو اشاعت کے خیال سے محفوظ نہ رکھتے ہوں گے ۔ زیادہ کیا عرض کروں ۔ اُمید کہ آپ

کا مزاج گرامی بخیر ہوگا ۔ مخلص محمد اقبال"

اس خط سے میرے متذکرہ بیان کی پوری تائید ہوتی ہے کہ بعض مکاتیب ہرگز شائع نہیں ہونے چاہییں ۔ اگر بہت ضروری ہو تو نظرثانی کے بعد انہیں شائع کیا جائے یا صرف نفسِ مضمون ، جو ناگزیر ہو ، قارئین تک پہنچا دیا جائے ۔ ایسے خطوط ، لکھنے والے کی امانت ہوتے ہیں اور امانت میں خیانت کسی صورت میں جائز نہیں ۔

جس طرح حضرتِ علامہ خطوط کا جواب نہایت پابندی سے دیتے تھے ، اسی طرح وہ موصول شدہ خطوط کو ضائع بھی بڑے التزام سے فرماتے تھے ۔ سوائے اکبر الہ آبادی کے خطوط کے ، جواب لکھنے کے فوراً بعد وہ خطوط کو تلف کر دیتے تھے ۔ میں علامہ کی قربت کی وجہ سے یہ حرکت کرتا تھا کہ بعض اہم شخصیات کے خطوط کو تلف شدہ صورت میں بھی محفوظ کر لیتا ، مثلاً حکیم اجمل خاں وغیرہ کے خطوط ، مگر بعد میں جب احساس ہوا کہ میں خیانت کا مرتکب ہو رہا ہوں تو میں نے انہیں ضائع کردیا ورنہ ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو جاتا ۔ اگر وہ تمام خطوط ، جو علامہ کو موصول ہوتے تھے ، محفوظ کر لیے جاتے تو ایک نادر مجموعہ مرتب ہو سکتا تھا ۔

۱۹۲۴ء میں جب "بانگِ درا" کا پہلا ایڈیشن شائع ہونے لگا تو علامہ نے اس کی فروخت کا کام راقم کے سپرد کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا ۔ ساتھ ہی انھوں نے ایک اَور مختصر سی کتاب کا ذکر بھی فرمایا کہ وہ بھی "بانگِ درا" کے ساتھ ہی شائع ہوگی ۔ اگرچہ یہ خدمت میرے لیے ایک اعزاز کی حیثیت رکھتی تھی مگر دلی طور پر میں اس کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ اس طرح علامہ کی محفل میں میری حیثیت بالکل مختلف ہو جاتی ۔ بالآخر یہ کام میری

خواہشات کے عین مطابق ہوا اور ''بانگِ درا'' کی فروخت کا کام شمس العلما مولانا سیّد ممتاز علی کے ادارے دارالاشاعت کے سپرد ہوگیا۔ مگر وہ چھوٹی سی کتاب پھر کبھی نظر نہ آئی جس کا علامہ نے ذکر کیا تھا ۔ یہ کتاب دراصل حضرتِ اکبر الٰہ آبادی کے خطوط کا مجموعہ تھا جس کے متعلق علامہ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ بالکل مرتّب شدہ ہے ۔ اس پر ضروری حواشی بھی ہوں گے اور لوگ اسے بہت پسند کریں گے ۔ لوگوں میں اس مجموعے کا چرچا کافی دیر رہا اور وہ اس کے منتظر رہے مگر مَیں نے اسے اپنی آنکھوں سے پھر کبھی نہ دیکھا اور آہستہ آہستہ یہ مجموعہ طاقِ نسیاں کے حوالے ہوگیا ۔ پھر جب پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب نے رسالہ ''اقبال'' کے اپریل ۱۹۶۲ع کے شمارے میں ایک فاضلانہ مضمون ''اکبر پیش روِ اقبال'' کے عنوان سے لکھا تو انھیں بھی اکبر الٰہ آبادی کے مذکورہ مجموعۂ خطوط کے سلسلے میں معلومات یک جا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ انھوں نے اس سلسلے میں راقم سے بھی رابطہ قائم کر کے اس کے متعلق استفسار کیا ، جس کا ذکر مذکورہ مضمون کے صفحات ۲۸ - ۳۳ پر موجود ہے ، مگر کافی تلاش و جستجو کے باوجود بھی یہ مجموعہ انھیں نہیں مل سکا اور نہ کسی اَور کی نظر سے گزرا ۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ مجموعہ بطورِ امانت چودھری محمد حسین کے پاس رہا ہوگا اور انھوں نے اسے ضائع کردیا ہوگا ، کیونکہ جیسا کہ مَیں پہلے عرض کر چکا ہوں ، اقبال لوگوں کے خطوط کو ان کی امانت سمجھتے تھے اور ان کی تشہیر پسند نہیں فرماتے تھے ۔

۱۹۶۳ع کے ''معارف'' میں اکبر کے وہ تمام خطوط شائع ہو گئے ہیں جو انھوں نے سید سلیمان ندوی کو لکھے تھے ۔ ان خطوط

میں علامہ اقبال اور ان کے فکر و فن کا خاصا ذکر ہے۔ مثلاً مسئلہ وحدت الوجود کا ذکر ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر اور اقبال کے درمیان اس مسئلے پر اور دیگر علمی مسائل پر اکثر خط و کتابت ہوتی ہوگی۔ اگر اکبر کے خطوط، جو اقبال کو لکھے گئے تھے، مل جاتے تو اس امر کی تصدیق ہو جاتی۔

''اقبال نامہ'' (مجموعۂ خطوطِ اقبال) کے حصہ اول میں صفحہ ۴۴ سے ۷۷ تک وہ خطوط تو ملتے ہیں جو علامہ نے اکبر الہ آبادی کو تحریر فرمائے تھے۔ اگرچہ میرے نزدیک وہ بھی مکمل خطوط نہیں ہیں۔ مگر حضرتِ اکبر کے خطوط بنامِ اقبال کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ خیال یہی ہے کہ اوّل اوّل تو علامہ نے ان کی افادیت کے پیش نظر انھیں شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر پھر اس خیال سے انھیں ضائع کردیا کہ جس طرح وہ اپنے ذاتی خطوط کی اشاعت اور تشہیر کو پسند نہیں فرماتے، اسی طرح دوسروں کے خطوط کی اشاعت بھی مناسب نہیں ہے۔ بہرحال مقصد یہ ہے کہ اقبال حتی الوسع خطوط کی اشاعت کو پسند نہیں فرماتے تھے اور ذاتی خطوط یا عجلت میں قلم برداشتہ لکھے گئے مکاتیب کی اشاعت کو تو سخت معیوب سمجھتے تھے۔

''اقبال نامہ'' حصہ دوم (ص ۱۵۴ - ۱۶۹) میں علامہ کے کچھ خطوط پروفیسر اکبر منیر کے نام ہیں۔ تاریخی طور پر یہ خطوط اس زمانے کے ہیں جب اکبر منیر ہنوز اسلامیہ کالج میں بی۔ اے کے طالب علم تھے (جنوری ۱۹۱۸ع)۔ راقم کو بھی ان سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ انھیں فارسی زبان سے بہت شغف تھا۔ جب سیاسی دباؤ کے تحت پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔ اے فارسی کی کلاسیں شروع ہوئیں تو اکبر ان طلبہ کے ساتھ صف اول میں تھے جنھوں نے

ایم - اے فارسی کے امتحان میں نمایاں مقام حاصل کیا اور ڈگری لی - میرا خیال ہے کہ انھوں نے اُس زمانے میں جن لوگوں سے فارسی زبان پڑھی تھی اُن میں مولانا سراج الدین پال ، قاضی فضل حق ، مولانا محمد شفیع اور علامہ اقبال نمایاں ہیں - اقبال اُنھی دنوں پنجاب یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے تھے - پروفیسر اکبر اگرچہ فارسی کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے، جس کی تعریف اقبال نے بھی کی ہے ، مگر بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں فارسی زبان پر کامل عبور حاصل نہیں تھا - ایم - اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انھیں ملک سے باہر بحرین میں تعینات کیا گیا تھا کیونکہ دوسرا خط ، جو ۲۱ اپریل ۱۹۲۰ع کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے ، بحرین سے لکھا گیا تھا - اقبال نے انھیں جو خط ۴ - اگست ۱۹۲۰ع کو تحریر فرمایا اُس میں وہ لکھتے ہیں :

''ایک کتاب ـــــ غالباً ''لطائفِ غیبی'' نام ـــــ ایران میں شائع ہوئی تھی - پروفیسر براؤن نے ''لٹریری ہسٹری'' میں اس کا ذکر کیا ہے - یہ کتاب اُن اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی ہے جو شیعہ حضرات نے وقتاً فوقتاً حافظ پر کیے ہیں - اگر کہیں سے دستیاب ہو جائے تو میرے لیے خرید کر بھیج دیجیے -''

اسی خط میں اقبال نے ایک اور کتاب ''یونانی فلسفہ'' کا ذکر بھی کیا ہے جو ابھی تک ان کی نظر سے نہیں گزری تھی - پھر نکلسن کے ترجمۂ ''اسرار خودی'' کا ذکر کیا ہے جو تا حال شائع نہیں ہوا تھا - انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''میں گوئٹے کے دیوان کے جواب میں ایک دیوانِ فارسی لکھ رہا ہوں -'' اس خط میں انھوں نے مکتوب الیہ کو مطلع کیا ہے کہ بے شمار لوگ

افغانستان کی طرف ہجرت کر رہے ہیں ۔

اکبر منیر نے اپنے مکتوب محررہ ۲۰ جنوری ۱۹۲۲ء میں اطلاع دی ہے کہ وہ ایک کتاب فارسی کے انٹرنس کے کورس کے لیے مرتب کر رہے ہیں ۔

اس کے بعد اکبر منیر پنجاب کے محکمۂ تعلیم سے منسلک ہو گئے اور ملتان میں ان کا تقرر ہوا کیونکہ ۱۷ مارچ ۱۹۲۵ء کا خط ملتان کے پتے پر لکھا گیا ہے ۔ اس میں "زبور عجم" کے متعلق اقبال نے لکھا ہے کہ اس کے لیے ابھی کچھ مدت درکار ہے ۔

حضرتِ علامہ کے لیے سٹیشنری کا انتظام بغیر کسی خاص ہدایت کے منشی طاہر الدین خود ہی کر دیا کرتے تھے ۔ جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں ، کافی عرصے تک ایک ہی طرح کا کاغذ اور لفافے استعمال ہوتے رہے ۔ البتہ جب علامہ لیجس لیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہو گئے تو کسی دوست نے ان کے نام کے دو تین لیٹر پیڈ چھپوا کر دے دیے مگر لفافے پھر بھی وہی سادہ قسم کے استعمال میں رہے ۔

اگر کسی خط کا جواب تحقیق طلب ہوتا اور اس کے لیے کتابوں کے حوالے درکار ہوتے تو خط کی رسید تو فوراً بھیج دی جاتی مگر تحقیق طلب مسائل کے لیے اہلِ علم احباب سے مدد لی جاتی ۔ اس کا طریقِ کار یہ تھا کہ چھوٹی چھوٹی چٹوں پر تحقیق طلب مسائل لکھ کر مختلف اہلِ علم حضرات کو بھجوا دیے جاتے اور ان سے کہا جاتا کہ متعلقہ ماخذ سے حوالے نوٹ کر کے ارسال کر دیجیے ۔ ایسے استفسارات کے لیے دیگر اہلِ علم کے علاوہ پروفیسر مولوی محمد شفیع اور پروفیسر محمود شیرانی یا راقم سے بطور خاص رابطہ قائم کیا جاتا ۔ یہ چٹیں اب بھی ان حضرات کے گھروں میں مل جائیں گی ۔

اس قسم کے استفسارات زیادہ تر اسلامی مسائل کے متعلق یا پھر اشعار کی تشریح کے سلسلے میں ہوتے تھے ۔

جب علامہ افغانستان کے سفر پر جانے لگے اور اسٹیشن پر پہنچنے کے لیے موٹر میں سوار ہوئے تو اسی وقت ڈاکیا روزمرہ کی ڈاک لے کر آ گیا ۔ ایک خط میں مکتوب نگار نے خاقانی کے بعض اشعار کی شرح کرنے کی درخواست کی تھی ۔ فرمانے لگے اب اس خط کا جواب کیسے دیا جائے ۔ میں قریب ہی کھڑا تھا ۔ میں نے عرض کی کہ خط اسی طرح شیرانی صاحب کے پاس بھجوا دیجیے ۔ وہ آپ کی طرف سے تسلی بخش جواب بھیج دیں گے ۔ چنانچہ اسی وقت مجھ سے قلم لے کر لفافے پر مندرجہ ذیل پیغام تحریر فرمایا اور خط شیرانی صاحب کو بھجوا دیا :

"ڈیئر شیرانی صاحب !

میں کابل جا رہا ہوں اس لیے فرصت نہیں ہے ۔ آپ مہربانی کر کے اس خط کا جواب راقم کو دے دیں اور ان کو یہ بھی لکھ دیں کہ میں کابل جا رہا ہوں اس واسطے جواب نہ لکھ سکا ۔ محمد اقبال"

علامہ اقبال ہر مکتوب الیہ کو جواب دینا اخلاقی فرض سمجھتے تھے ۔ اس معاملے میں مکتوب الیہ کے مقام اور مرتبے مثلاً سماجی ، اقتصادی ، علمی یا سیاسی حیثیت کا کوئی معیار مقرر نہیں تھا ۔ دنیا کے کسی خطے سے خط آتا ، وہ کاتبِ خط کو جواب دینا اپنا

۱۔ "اقبال نامہ" حصہ دوم ص ۳۵۱ میں مرتب نے شیرانی صاحب کے نام خطوط کے عنوان میں حافظ محمود شیرانی کی بجائے ان کے بیٹے اختر شیرانی کا نام لکھ دیا ہے ۔

فرض سمجھتے تھے - اس سلسلے میں ان کے نزدیک وائسرائے ہند اور ملک کے کسی ادنیٰ ترین فرد کو یکساں اہمیت حاصل تھی - اتنی ہی عجلت سے وہ علی بخش کو جواب دیتے تھے جتنی سرعت سے قائدِ اعظم محمد علی جناح کو خط کا جواب لکھتے تھے -

جب ۱۹۰۵ع میں آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ تشریف لے گئے تو اپنے خدمت گار علی بخش کو کہہ گئے کہ جب تک میں واپس نہیں آتا ، تم بے کار نہ رہنا اور کوئی دوسری ملازمت کر لینا - اسی دوران میں علی بخش کے ہاں چوری ہوگئی تو اس نے ۱۹۰۷ع کے آخر میں علامہ کو بھی اس کی اطلاع دی - اس کے جواب میں علامہ نے جو ہمدردانہ خط لکھا وہ ذیل میں درج ہے :

"عزیز علی بخش !

بعد سلام کے واضح ہو کہ خط تمھارا پہنچا ، حال معلوم ہوا - میرے آنے میں ابھی چھ سات ماہ کا عرصہ باقی ہے - امید ہے تم اس وقت تک فارغ نہ رہو گے اور وہ کمی جو چوری سے ہوگئی ہے ، اسے پورا کر لو گے - مجھے یہ سن کر افسوس ہوا - اگر میں وہاں ہوتا تو اس موقع پر ضرور تمھاری مدد کرتا -

تم نے شادی کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا ہے - میرا خیال تھا کہ تمھاری شادی ہوچکی ہے - بہرحال انسان کو شادی سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ بیوی اور بچوں کی پرورش کے واسطے اس کے پاس سامان ہے یا نہیں - اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اپنی محنت سے بیوی کو آسودہ رکھ سکو گے تو ضرور کر لو - شادی کرنا عین ثواب ہے اگر بیوی آسودہ رہ سکے - اگر کوئی شخص ایسا نہ کر سکتا،

ہو تو وہ شادی کر کے نہ صرف اپنے آپ کو تکلیف میں مبتلا کرتا ہے بلکہ ایک بے گناہ کو بھی لے ڈوبتا ہے۔

محمد اقبال

۱۱ - دسمبر ۱۹۰۷ء"

حضرتِ علامہ نے کافی خطوط مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد یمین السلطنت ، مدار المہام ، صدر اعظم حیدرآباد دکن کو لکھے ہیں جو چھپ بھی گئے ہیں ۔ مندرجہ ذیل خط انہوں نے جناب شبیر حسن جوش ملیح آبادی کی حیدر آباد میں تقرری کے لیے ۱۴ جنوری ۱۹۲۴ء کو لکھا ۔ خط کا اصل متن درجِ ذیل ہے :

"یہ خط شبیر حسن جوش ملیح آبادی کی تقرری کے لیے لکھتا ہوں ۔ یہ نوجوان نہایت قابل اور ہونہار شاعر ہیں ۔ میں نے ان کی تصانیف کو ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا ہے ۔ اپنی خداداد قابلیت کے علاوہ لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے ہیں جو اثر و رسوخ کے ساتھ ساتھ لٹریری شہرت بھی رکھتا ہے ۔ مجھے امید ہے کہ سرکار ان کے حال پر نظر عنایت فرمائیں گے ۔ اور اگر ان کو کسی امر میں سرکارِ عالی کے مشورے کی ضرورت ہوگی تو اس سے دریغ نہ فرمائیں گے ۔ سرکارِ والا کی شرفا پروری کے اعتماد پر اس درخواست کی جرأت کی گئی ہے ۔ امید ہے مزاج بخیر ہوگا ۔

مخلص محمد اقبال ، لاہور"

(منقول از "شاد اقبال" مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، صفحہ ۱۵۹ ، مطبوعہ حیدرآباد دکن) ۔

چنانچہ جوش صاحب اس کے بعد دارالترجمہ حیدرآباد میں ملازم ہوگئے تھے ۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ، زندگی کے آخری ایام میں علامہ اقبال کی بصارت جواب دے گئی تھی ، مگر خطوط کا جواب وہ پھر بھی اسی عجلت اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اپنے احباب اور عقیدت مندوں سے لکھوا کر بھجواتے رہے ۔ آخری خط جو حضرتِ علامہ نے ایک آرٹسٹ کاظمی صاحب کو لکھوایا ، ۱۸ اپریل ۱۹۳۸ ع کا ہے ، جبکہ تین روز بعد ، یعنی ۲۱ ۔ اپریل ۱۹۳۸ ع کو آپ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہوگئے ۔ چونکہ یہ خط کئی لحاظ سے اہم ہے لہذا اسے ذیل میں درج کیا جا رہا ہے :

"لاہور ،

۱۸ اپریل ۱۹۳۸ ع

مکرم بندہ ! السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ آیا ، پڑھ کر خوشی ہوئی ۔ آپ بدایوں جیسے مردم خیز خطے میں "اقبال ڈے" منا رہے ہیں ، خدا آپ کو مبارک کرے ۔

میں نے اور علامہ یوسف علی صاحب نے آپ کا آرٹ بابت 'شکوہ' اور 'جوابِ شکوہ' مولانا حالی کی برسی پر دیکھا تھا ۔ میرا اور مبصّرِ زمانہ عبداللہ یوسف علی صاحب کا یہ خیال ہے کہ اگر آپ نے کافی مشق اور مہارت کے بعد اس فن میں کمال حاصل کرکے 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' کو دنیائے اسلام کے سامنے پیش کر دیا تو آپ فنِ مصوّری میں ایک نیا اضافہ کرکے اپنے فن کا ایک نیا سکول قائم کریں گے ۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جب یہ چیز ایسی شان کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی تو دنیا یقینی طور سے اس کو "کاظمی سکول" کے نام سے موسوم

کرے گی - آپ محض فنِ مصوری میں اضافہ نہیں کر رہے بلکہ دنیائے اسلام میں بحیثیت "مصورِ اقبال" ایک زبردست خدمت انجام دے رہے ہیں جو کہ شاید قدرت آپ ہی سے لینا چاہتی ہے - پوری مہارتِ فن کے بعد آپ نے "جاوید نامہ" پر خامہ فرسائی کی تو ہمیشہ زندہ رہیں گے -

میری طبیعت پہلے سے اچھی ہے مگر حالت روز بروز ابتر نظر آتی ہے - بوجہ کمزوری کے دوسرے صاحب سے خط لکھوا رہا ہوں - خدا سے دست بدعا ہوں کہ وہ آپ کے نیک ارادوں میں کامیابی عطا کرے - مجھ کو آپ کا مستقبل روشن نظر آتا ہے - آپ میرے لیے اللہ سے دعا کریں کہ یا تو صحتِ کلی دے یا ساتھ ایمان کے اٹھا لے - والسلام

محمد اقبال ، جاوید منزل"

اس خط سے جہاں اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ اقبال اپنی موت سے تین روز پہلے تک برابر خطوط کا جواب دیتے رہے ، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آخر وقت تک آپ کا حافظہ نہایت اعلیٰ درجے کا تھا اور خیالات میں توانائی تھی - مصوری کا موضوع ، جس پر میں کبھی الگ بھی روشنی ڈالوں گا ، اگرچہ علامہ کا موضوع نہیں تھا مگر وہ اس موضوع پر بھی نقادانہ بصیرت کے ساتھ اظہار خیال فرما سکتے تھے - پھر یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ اقبال کا حوصلہ آخر وقت تک بلند تھا اور دوسرے لوگوں کو بھی وہ عزم و ہمت کا پیغام دیتے تھے - ان سے مل کر اور ان سے گفتگو کرکے ہمیشہ ایک تازگی کا احساس ہوتا تھا اور انسان کتنے ہی مصائب میں گھرا ہوا ہو وہ اس انداز میں مسائل کو حل کرتے تھے کہ عزم ایک مرتبہ پھر جوان ہو جاتا اور مردہ رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگتا -

بہرحال مکاتیبِ اقبال کے ضمن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ زندگی کے رازہائے سربستہ پر اور زندگی کے حقائق پر جس طرح ان کے خطوط سے روشنی پڑتی ہے وہ دیگر ذرائعِ اظہار سے زیادہ توانا ہے ۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ مکاتیبِ اقبال کو ان کے پس منظر سے الگ کرکے صحیح معنوں میں نہیں سمجھا جا سکتا ۔ ان کے خطوط جہاں ان کی شخصی زندگی کا آئینہ ہیں وہاں متعلقہ عہد کے سوانح اور وقائع کی سچی تصویر بھی پیش کرتے ہیں ۔ اس لیے میں بار بار اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ اگر اقبال کو ، اور گرد و پیش کے متعلق ان کے نظریات کو ، صحیح معنوں میں سمجھنا ہے تو مکاتیبِ اقبال کو ان کے پس منظر سمیت شائع کرنا نہایت ضروری ہے ۔

جب ہم علامہ اقبال کے دیگر علمی کارناموں کے بعد ان کے خطوط پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی کیفیت اور کمیت دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں ۔ ان کی خطوط نویسی کی ابتدا گذشتہ صدی کے آخر میں ہوئی تھی ۔ آپ کا سب سے پہلا خط ۲۸ فروری ۱۸۹۹ع کا ملتا ہے جو آپ نے گورنمنٹ کالج کے بورڈنگ ہاؤس سے مولانا احسن مارہروی کو لکھا تھا ۔ اس کے بعد اخیر دم تک یہ سلسلہ جاری رہا ۔ اگر وہ خود نہیں لکھ سکتے تھے تو اپنے کسی رفیق سے لکھوا کر اس فریضے کو انجام دیتے تھے ۔ چنانچہ خطوط کے وہ تمام مجموعے ، جو آج بازار میں دستیاب ہیں ، وہ یہ ہیں :

۱۔ اقبال نامہ ، حصہٴ اول ، ۱۹۴۵ع ۔

۲۔ اقبال نامہ ، حصہٴ دوم ، ۱۹۵۱ع ۔

۳۔ اقبال ، مصنفہٴ عطیہ بیگم (انگریزی) ۱۹۴۷ع ۔

۴- مکاتیبِ اقبال بنام خان نیاز الدین خان ، ۱۹۵۴ع -

۵- مکتوباتِ اقبال بنام سید نذیر نیازی ، ۱۹۵۷ع -

۶- یادگار یوم اقبال ، (کراچی) مرتبہ یعقوب توفیق ، ۱۹۶۶ع -

۷- اقبال کے خطوط و تحریریں (انگریزی) ۱۹۶۷ع -

۸- انوارِ اقبال ، ۱۹۶۷ع -

۹- مکاتیبِ اقبال بنامِ گرامی ، ۱۹۶۹ع -

۱۰- خطوطِ اقبال بنام محمد علی جناح (انگریزی) -

۱۱- شاد اقبال -

۱۲- نوادر اقبال ، بنام کشن پرشاد شاد -

۱۳- خطوطِ اقبال ، مرتبہ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی -

نہ معلوم ابھی علامہ کے کتنے خطوط یا تحریریں گم نامی میں پڑی ہیں اور کتنی ہیں جو ضائع ہو چکی ہیں - عام خط کا جواب لکھنا آسان ہوتا ہے جو کسی زیادہ تحقیق یا کسی قسم کی طویل تحریر کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ مکتوب الیہ اور مکتوب لکھنے والے میں معاملہ ایک طرح طے شدہ ہوتا ہے اور اس کے کئی پہلو پہلے سے واضح ہوتے ہیں - میں نے بارہا علامہ کے پاس بیٹھے ہوئے مشاہدہ کیا ہے کہ آپ نے مکتوب الیہ کو محض ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعے نہایت تسلی بخش جواب لکھ دیا اور اس کو ضرورت بھی اسی کی تھی حالانکہ وہ معاملہ بذات خود اہم اور طویل تحریر کا محتاج تھا -

علامہ کے بیشتر خطوط ان کے اپنے کلام اور مختلف علمی مسائل کی تفسیر و تشریح کے حامل ہیں ۔

میرا ارادہ تھا کہ میں یہاں ایک مختصر تعارف علامہ کے تمام مکتوب الیہ حضرات کا پیش کروں مگر یہ کام بذاتِ خود ایک طویل تحریر کا محتاج ہے -

۹۵

متفرق واقعات

جب راقم الحروف لدھیانہ سے لاہور آ گیا تو ایک روز میرے استاد مولوی حبیب الرحمٰن مکیؒ صاحب میرے ہاں مہمان کی حیثیت سے تشریف لائے ۔ ان سے اکثر علامہ کے متعلق گفتگو ہوتی تھی مگر وہ ابھی تک علامہ سے ملے نہیں تھے ۔ وہ عرب نژاد تھے اور بعض اوقات ان کو علامہ کی نظموں کا مطلب ترجمہ کر کے سمجھانا پڑتا تھا ۔ میں جب ان کو علامہ کے پاس لے کر گیا تو علامہ بہت خوش ہوئے اور کئی مسائل معرضِ بحث میں آئے ۔ دورانِ گفتگو میں جب نمازِ ظہر اور عصر کا وقت ہو گیا تو مولوی مکیؒ صاحب نے علامہ کو اپنا امام بنا کر ہر دو نمازیں ادا کیں ۔ علامہ کا یہ شعر انہیں بہت پسند تھا :

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

وہ حیران ہوتے تھے کہ کس طرح علامہ نے اس شعر میں معانی کے ایک دریا کو بند کر دیا ہے ۔

کسی شخص نے علامہ سے کہا کہ آپ ''تفسیرِ ابنِ عباس''

کا مطالعہ کریں ۔ اس زمانے میں چونکہ بہت سے علمی مسائل علامہ کے پیشِ نظر تھے لہٰذا آپ نے مجھے مکلّف کیا کہ کہیں سے یہ تفسیر پیدا کرو ۔ چنانچہ جب وہ کتاب انجمنِ نعمانیہ کی لائبریری سے مل گئی تو میں وہاں سے مانگ کر لایا ۔ آپ نے اس کا مطالعہ کیا اور دوسرے ہی روز واپس کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کو پھر ہرگز نہ لانا کیونکہ اس کے ہر لفظ کے معنی عجیب و غریب ہیں ۔

جن دنوں آپ زمان اور مکان کی بحث کے ضمن میں اہلِ علم سے گفتگو کیا کرتے تھے تو میں لاہور کے اکثر علما کو آپ کی خدمت میں لے کر گیا تھا جن میں سے مولانا سید طلحہ صاحب ، مولوی غلام مرشد صاحب اور مولوی حشمت علی اہلِ قرآن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ مولوی روحی صاحب کو بھی میں ایک روز تانگے پر لایا جو حقہ پینے کے عادی تھے ۔ جب وہ آئے تو علامہ بھی حقہ گڑگڑا رہے تھے ۔ مولوی صاحب نے آتے ہی حقے کو اپنی طرف کر کے زور کا کش لگایا مگر اس میں کچھ بھی نہ تھا ۔ اس پر مولوی صاحب بہت برہم ہوئے اور علامہ سے کہا کہ یہ کیا مذاق ہے ۔ آپ حقہ اس طرح پیتے ہیں ؟ علامہ نے کہا ’’حضرت ! میں اسے پی نہیں رہا تھا بلکہ محض اس سے باتیں کر رہا تھا ۔‘‘

مجھے یاد ہے کہ سب مولوی صاحبان نے بہت مفید مشورے دیے تھے ۔ سید طلحہ نے آپ کو امام شاطبی کی ’’کتاب الاعتصام‘‘ اور ’’کتاب الموافقات‘‘ کے متعلق مشورہ دیا تھا کہ بحثِ زمان و مکان کے ضمن میں ان کا ضرور مطالعہ کریں ۔ چنانچہ ’’کتاب الموافقات‘‘ کا حوالہ آپ کے لیکچروں والی کتاب میں اب بھی موجود ہے ۔

جب پروفیسر رشید احمد صدیقی لاہور میں ۱۹۲۹ء میں آئے تھے تو بہت سے احباب ان کی وجہ سے علامہ کے پاس آتے تھے جن میں پروفیسر احمد شاہ پطرس بخاری ، پروفیسر تاثیر ، مجید ملک اور مہر و سالک وغیرہ بھی ہوتے تھے - میں نے ان کو جب لاہور کی سیر کرائی تو واپسی پر بہت سے حضرات علامہ کے ہاں موجود تھے - انھوں نے لاہور پر اور علامہ پر جو تبصرہ کیا وہ واقعی عجیب و غریب تھا ؛ انھوں نے کہا کہ میں نے تمام لاہور اس شخص کی ذات میں دیکھ لیا ہے - ان کے آنے پر علامہ نے اپنے بہت سے احباب کو خود بھی خط لکھ کر مدعو کیا تھا -

---

ایک روز ڈاکٹر سید محمد حسین صاحب حسبِ معمول دس بجے کے قریب تانگے پر تشریف لائے - پہلے وہ اندر چلے گئے اور پھر باہر آ کر علامہ کی خیریت دریافت کی - پھر جاتے جاتے انھوں نے علامہ سے کہا کہ گوشت سے ذرا پرہیز کیجیے - ابھی وہ جانے کے لیے تانگے میں بیٹھ ہی رہے تھے کہ علامہ نے علی بخش کو آواز دی اور فرمایا کہ جاؤ اور عمدہ سا گوشت لے آؤ ، آج کباب بنائیں گے - اس نے عرض کی کہ ابھی تو شاہ صاحب نے گوشت کھانے سے منع کیا ہے - فرمایا کہ ڈاکٹر لوگ تو اس طرح کی باتیں کیا ہی کرتے ہیں - تم فوراً گوشت لے آؤ - پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ ماسٹر تم بھی کباب کھا کر جانا -

---

جب پنجاب کونسل کے الیکشن میں علامہ کو کامیابی نصیب ہوئی تو دین محمد کاتب مُصر ہوا کہ کسی روز میرے غریب خانے پر تشریف لا کر پلاؤ کی دعوت کھائیں - در اصل دین محمد نے انتخابات

کے دنوں میں بہت کام کیا تھا اور نہایت خلوص سے یہ دعوت دی تھی لہٰذا علامہ راضی ہو گئے اور ایک اتوار اس دعوت کے لیے مخصوص کر دی گئی۔ مقررہ تاریخ کو ہم موٹر میں بیٹھ کر چل دیے مگر ابھی سڑک پر پہنچے تھے کہ کسی صاحب نے سامنے آ کر موٹر روک لی اور قریب آ کر عرض کی کہ مجھے آپ سے نہایت ضروری کام ہے۔ پہلے میری بات سن لیجیے۔ آپ نے مذاقاً فرمایا کہ آگے سے ہٹ جائیے۔ آج کسی کی بات نہیں سنی جائے گی۔ کیونکہ آج پلاؤ کی شہادت کا دن ہے۔

جیسے کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں، علی بخش کی شادی احباب میں اکثر گفتگو کا موضوع بنی رہتی تھی۔ اس سلسلے میں کئی مرتبہ پلاؤ بھی کھایا گیا مگر یہ شادی کبھی نہ ہوئی۔ ایک روز منشی طاہر الدین نے نہایت سنجیدگی سے علی بخش سے کہا کہ آج تو تمھاری شادی واقعی ہو جائے گی۔ چنانچہ دوستوں کو بلایا گیا جن میں مہر و سالک بھی تھے۔ علی بخش بے چارے کو یقین نہیں آ رہا تھا اور وہ بار بار علامہ سے کہتا کہ پہلے مجھے دلھن نہیں تو اس کے گھر والوں سے ملایا جائے، تب میں یقین کروں گا۔ مگر علامہ فرماتے کہ دیکھو علی بخش! جب پلاؤ پک رہا ہے تو پھر تمھیں کس بات کی فکر ہے۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ پلاؤ کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ غرض علی بخش پلاؤ کا مطلب جاننے کی کوشش میں لگا رہا اور دوست پیٹ بھر کے پلاؤ کھاتے رہے۔

ایک روز میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ تم نے فلاں کتاب لانے کا وعدہ کیا تھا مگر آج تک نہیں لائے۔

میں نے کہا "کیا عرض کروں ، اس قدر مصروفیت رہتی ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی اور اگر فرصت ملتی ہے تو وقت نہیں ملتا۔" میرے اس جواب پر علامہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور فرمایا "منشی ! آج تو تم نے وہ بات کہی ہے جو آئن سٹائن کے باپ کو بھی نہیں سوجھی ہوگی ۔ واہ وا ! "فرصت ملتی ہے تو وقت نہیں ملتا" کیا بات پیدا کی ہے ۔" پھر علی بخش کو آپ نے آواز دی اور فرمایا کہ جاؤ مولانا مہر اور سالک کو بلا لاؤ ۔ ان کو بھی ماسٹر کا کارنامہ سنائیں ۔

میں ایک روز علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے موٹر نکلوائی اور مجھے ساتھ بٹھا کر چودھری شہاب الدین کے ہاں پہنچ گئے ۔ سردی کا موسم تھا اور چودھری صاحب غسل کر کے باہر دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ چونکہ وہ بہت زیادہ سیاہ فام تھے لہٰذا علامہ اکثر انہیں چھیڑتے رہتے تھے ۔ اس روز جب ہم ان کے ہاں پہنچے تو انھوں نے پہلے ہی علامہ سے کہہ دیا کہ آج کوئی مذاق نہ کرنا ۔ مگر علامہ نے فوراً ان کے ننگے سیاہ بازوؤں پر چٹکی لی اور پوچھا "چودھری صاحب ! یہ صوف کیا بھاؤ لیا ہے ؟" صوف دراصل سیاہ رنگ کا کپڑا ہوتا ہے ۔

ایک مرتبہ نواب ذوالفقار علی خاں نے مہترِ چترال (خان آف چترال) کی دعوت کی تھی جس میں دیگر معززین کے علاوہ چودھری شہاب الدین بھی مدعو تھے ۔ جب مہترِ چترال آ گئے تو معززین سے ان کا تعارف کرایا گیا ۔ چودھری شہاب الدین کی باری آئی تو نواب ذوالفقار علی خاں نے تعارف کراتے ہوئے کہا "آپ مہترِ چترال ہیں اور آپ . . ." نواب صاحب کا جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ

فوراً علامہ نے گرہ لگائی "۔ ۔ ۔ اور آپ مہترِ لاہور ہیں ۔" بات دراصل یہ تھی کہ ایک تو چودھری صاحب کا رنگ بہت سیاہ تھا اور دوسرے آن دنوں وہ لاہور میونسپل کمیٹی کے صدر تھے ۔ اسی دوگونہ مناسبت سے علامہ نے انھیں "مہترِ لاہور" کہہ کر نکتہ سنجی کی داد دی جس پر ساری محفل زعفران زار بن گئی ۔

جب علامہ نے علاج کے لیے حکیم نابینا (حکیم عبدالرزاق انصاری) سے رجوع کیا تو آپ نے حکیم صاحب پر یہ بات واضح کر دی کہ کھٹائی اور مرچ وغیرہ سے پرہیز میرے لیے ممکن نہیں ہے ، کیونکہ یہ چیزیں میری کمزوری ہیں ۔ چنانچہ حکیم صاحب نے جو دوا تجویز کی اس میں اس بات کا بطورِ خاص خیال رکھا کہ کھٹائی وغیرہ سے پرہیز اس میں شامل نہ ہو ۔

۱۹۳۸ء میں علامہ کی صحت کا یہ عالم تھا کہ بینائی سے بھی محروم ہو گئے تھے ، مگر ان کا سیاسی اور ملّی شعور اس قدر بیدار تھا کہ ملک کے طول میں مسلمانوں کے مفاد کے منافی کوئی بھی بات ہوتی تو آپ فوراً اس کا نوٹس لیتے اور اس کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار فرماتے ۔ گانگرس کو آپ ایک خالص فرقہ پرست ہندو تنظیم سمجھتے تھے اور اس کی سرگرمیوں سے پوری طرح باخبر رہتے تھے ۔ جو لوگ کانگرسی نقطۂ نظر کے حامی تھے ان میں مولانا حسین احمد مدنی بھی شامل تھے مگر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف کام کرنے والے کسی بھی شخص کو علامہ معاف نہیں کر سکتے تھے ، چاہے اس کا علمی اور سماجی مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو ۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۸ء میں ، جب کہ بیماری کی وجہ سے آپ مکمل طور پر

بستر سے لگ کر رہ گئے تھے ، آپ نے مولانا حسین احمد مدنی کو اس طرح للکارا کہ اس سے پورا ہندوستان گونج اٹھا ۔ آپ کا وہ یادگار قطعہ جس میں مولانائے موصوف کے نظریات کو ہدفِ تنقید بنایا گیا تھا ، ۳۱ جنوری ۱۹۳۸ع کے روزنامہ "احسان" میں شائع ہوا تھا ۔ اس کا مندرجہ ذیل شعر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے :

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست

علامہ اقبال اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :

"امیر شکیب ارسلان کو اگر آپ خط لکھیں تو میرا سلام ضرور لکھیے گا ۔ میرے دل میں ان کا بہت احترام ہے ۔ افسوس کہ قیامِ یورپ کے زمانے میں باوجود کوشش کے ان سے ملاقات نہ ہو سکی ۔ ان سے یہ بھی دریافت کر کے مجھے اطلاع دیں کہ سیّد ضیاء الدین طباطبائی آج کل کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں ؟

اقبال شیدائی اور ان کی بیگم صاحبہ کو میری طرف سے بہت بہت سلام کہیے ۔ ان کی بیگم صاحبہ کا قصد تھا کہ وہ اپنی میڈیکل تعلیم ختم کرنے کے بعد ہندوستان آ کر پریکٹس کریں گی ۔ معلوم نہیں ان کے اس ارادے کا کیا حشر ہوا ۔ ہاں خالدہ ادیب خانم کو بھی میرا بہت بہت سلام کہیے ۔

محمد اقبال"

علامہ نے اپنے اس خط میں امیر شکیب ارسلان کا ذکر کیا ہے جو بہت بڑے فاضل تھے اور عرب اتحاد و اخوّت کے علم بردار

تھے ۔ انھوں نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پیرس کا سفر بھی اختیار کیا اور عربوں کو بیدار کرنے کے لیے زبردست جدوجہد کی ۔ چنانچہ عربوں میں جو قومی بیداری اور حرّیتِ فکر پیدا ہوئی اس میں امیر شکیب ارسلان کی مساعی کا بہت بڑا حصہ ہے ۔ اسی طرح مسلمانانِ عالم کی بیداری اور آزادی کے لیے بھی ان کی کوششیں قابلِ تحسین ہیں ۔ انھوں نے اسلامی تاریخ و ثقافت پر بہت عمدہ اور مفید کتابیں لکھی تھیں اور علامہ ان کی انھی خدمات کی وجہ سے ان کا دل سے احترام کرتے تھے ۔

دوسرے شخص ، جن کا علامہ کے مندرجہ بالا خط میں ذکر ہے ، اقبال کا شیدائی ہیں ۔ یہ صاحب سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور آزادی کے لیے کام کرنے والے حریت پسندوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے ۔ بالآخر انگریزوں کے تشدد نے انھیں ہجرت کرنے پر مجبور کردیا ۔ وہ افغانستان اور روس کے راستے یورپ پہنچے اور پیرس میں بیٹھ کر انگریزوں کے خلاف سرگرمِ عمل ہوگئے ۔ پیرس میں قیام کے زمانے میں انھوں نے ایک ہم خیال یورپین عورت سے شادی کرلی جو میڈیکل کی طالبہ تھیں ۔ علامہ جب ۱۹۳۲ع میں پیرس گئے تھے تو اقبال شیدائی کی بیگم سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی ۔ پاکستان بننے کے بعد شیدائی وطن واپس آ گئے تھے اور روزنامہ ''امروز'' میں انھوں نے اپنے حالاتِ زندگی شائع کیے تھے جو کئی قسطوں پر مشتمل تھے ۔

پنجاب یونیورسٹی سے علامہ اقبال کا تعلق بہت قدیم تھا اور یونیورسٹی کے ہر شعبے کا عملہ ان کا بے حد احترام کرتا تھا ۔ یونیورسٹی لائبریری کے کارڈ پر آپ ہر قسم کی کتاب جاری کروا

سکتے تھے حالانکہ عام لوگوں کو یہ سہولت حاصل نہ تھی ۔ راقم نے خود بھی کئی مرتبہ علامہ کے لیے لائبریری سے کتابیں جاری کروائیں اور ان کی خدمت میں لے گیا ۔ ان کی علمی لگن کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی ناگزیر وجہ سے کتاب کے حصول میں تاخیر کا امکان ہوتا یا کسی اَور کے نام مطلوبہ کتاب جاری ہوچکی ہوتی تو بجائے انتظار کرنے کے آپ فوری طور پر وہ کتاب خرید لیتے ۔ چنانچہ سپینگلر کی کتاب کے انگریزی ترجمے ''دی ڈیکلائن آف دی ویسٹ'' (انحطاط مغرب) کے سلسلے میں بھی یہی ہوا ۔ جب علامہ کو معلوم ہوا کہ یہ کتاب کسی اور کے نام جاری ہو چکی ہے اور فوری طور پر اس کا حصول ممکن نہیں تو آپ نے بلاتاخیر بازار سے خرید لی ۔

پنجاب یونیورسٹی سے علامہ کا تعلق ممتحن کی حیثیت سے بھی تھا ۔ آپ یونیورسٹی کے ایم-اے اور ایل ۔ ایل ۔ بی کے پرچے دیکھتے تھے ۔ پرچے دیکھنے کے سلسلے میں آپ کا اصول یہ تھا کہ ہر روز جتنے پرچے دیکھ لیتے تھے ، انھیں اسی شام کو علی بخش کے ہاتھ رجسٹرار کو بھیج دیا جاتا تھا ۔ مقصد یہ تھا کہ جس حد تک ممکن ہو سفارش کی لعنت سے بچا جائے ۔ ویسے تو ان کا عزیز سے عزیز دوست اور رشتہ دار بھی سفارشی نمبروں کے لیے جرأت نہیں کر سکتا تھا ، پھر بھی وہ اپنے طور پر اس قسم کی پیش بندیاں ضروری خیال فرماتے تھے ۔ ایک مرتبہ ایل ۔ ایل ۔ بی کے ایک طالب علم نے ، جو اکثر امتحان میں فیل ہو جاتا تھا ، ڈاکٹر تاثیر اور راقم سے کہا کہ علامہ سے میرے کچھ نمبر بڑھانے کی درخواست کی جائے کیونکہ یہ پرچہ بہت ہی مشکل تھا ، مگر ہم نے اس سے صاف کہہ دیا کہ اس بات کی جرأت کوئی بھی نہیں کر سکتا ۔ تاہم جب اس نے بہت زیادہ اصرار کیا تو ہم صرف اتنی بات پر راضی ہوئے کہ پورے پرچے پر

اصولی بات چیت ہو سکتی ہے ۔ چنانچہ ہم نے علامہ سے پرچے کی مشکلات پر بات کی تو آپ نے ایک اصول کے تحت تمام امیدواروں کے پرچوں پر نظرثانی کی اور سب کے نمبر بڑھا دیے جس سے اس خاص امیدوار کو بھی فائدہ پہنچا اور اتفاق سے وہ پاس بھی ہو گیا ۔

ایک مرتبہ لاہور میں آل انڈیا سکھ ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں دور دور سے سکھ حضرات شامل ہوئے ۔ ایک دن میں علامہ کی خدمت میں حاضر تھا کہ کچھ سکھ حضرات علامہ سے ملنے کے لیے آئے ۔ ان میں ڈاکٹر پورن سنگھ ، پروفیسر کشمیرا سنگھ ، بھائی ٹھاکر سنگھ اور سردار جوگندر سنگھ بھی تھے ۔ علامہ ان تمام حضرات سے بہت اچھی طرح پیش آئے اور بے تکلفی سے گفتگو کرتے رہے ۔ سردار جوگندر سنگھ علامہ کا شیدائی تھا اور علامہ اسے بے تکلفی سے ”جوگی جی“ کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے ۔ ڈاکٹر پورن سنگھ نے بتایا کہ میں نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں آپ کا ذکر بھی کیا ہے ۔ اس کا نام ”دی سپرٹ آف دی اوریئنٹل پوئٹری“ ہے ۔ پھر علامہ نے بطور خاص سردار جوگندر سنگھ کی خیریت دریافت کی اور نہایت اپنائیت سے اس سے باتیں کرتے رہے ۔ جیسا کہ ذکر ہوا ، سردار جوگندر سنگھ ، علامہ کے پرستاروں میں سے تھا ۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام بھی علامہ کے نام پر اقبال سنگھ رکھا تھا اور اس کے گاؤں کا نام اقبال نگر تھا ۔ علامہ کی وفات پر سردار جوگندر سنگھ نے ”سول اینڈ ملٹری گزٹ“ میں ایک مضمون بھی لکھا تھا جس کے ایک ایک لفظ سے عقیدت و محبت کا اظہار ہوتا ہے ۔

ریاض الکریم نامی ایک شخص کانگرسی نقطۂ نظر کا حامی تھا ۔ اس نے انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ”فار انڈیا

اینڈ اسلام'' تھا اور اس میں ایک باب ''اقبال کے نام کھلا خط'' کے عنوان سے شامل تھا ۔ اس میں علامہ کی معروف نظم ''چین و عرب ہمارا'' کا حوالہ دے کر متحدہ ہندوستان اور کانگرسی نقطۂ نظر کی ترجمانی کی گئی تھی اور علامہ پر بھی تنقید تھی ۔ یہ کتاب عباس طیّب جی اور ڈاکٹر انصاری کے نام معنون تھی ۔ مگر علامہ اقبال نے اس کتاب یا اس کے مصنف کا کبھی ذکر تک نہ کیا اور نہ ہی انھوں نے اپنے سیاسی نظریات پر نظرثانی کرنے کے سلسلے میں کسی دباؤ کو قبول کیا ۔

علامہ اقبال جب کبھی بارودخانے میاں نظام الدین کے ہاں جاتے تو میاں صاحب ، ان کے صاحب زادے (مشہور ناول نگار ایم ۔ اسلم) ، میاں امیرالدین اور دیگر اہلِ خاندان ان سے نہایت محبت اور احترام سے ملتے ۔ ان لوگوں کے درمیان علامہ نہایت خوش و خرم اور ہشاش بشاش نظر آتے اور ایسا محسوس ہوتا کہ اپنائیت اور یگانگت کے اس ماحول میں علامہ کی طبیعت نہایت شگفتہ ہوگئی ہے ۔ آموں کے موسم میں امیرالدین اکثر علامہ کو آم کھانے کے لیے مدعو کیا کرتے اور اس سلیقے سے ''آم پارٹی'' کا انتظام کرتے کہ طبیعت خوش ہو جاتی ۔ اس خاندان کے ساتھ علامہ کے یہ تعلقات بالآخر عزیزداری پر منتج ہوئے اور آپ کی صاحب زادی کا عقد میاں امیر الدین کے صاحب زاد سے ہوگیا ۔

میں نے عام طور پر علامہ کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں ابتدا سے دیکھا کہ علامہ جس کمرے میں عموماً لیٹتے تھے ، وہاں ایک چمڑے کا بیگ درمیانہ سائز کا قریب ہی پڑا رہتا تھا جو دراصل

آپ کے اشعار کی بیاض تھی ۔ جب کبھی کوئی شعر آپ کے ذہن میں آتا تو آپ علی بخش کو آواز دے کر بلاتے اور اس کو فرماتے کہ مجھے یہ رجسٹر دینا ۔ ساتھ ہی قلم دوات بھی منگواتے اور شعر درج کر لیتے ۔ ہم نے یہ کبھی نہ پوچھا کہ یہ کیا رجسٹر ہے یا اس میں کیا ہے یا آپ کیا لکھ رہے ہیں ۔ اس کام کے لیے نہ تو کوئی وقت مقرر تھا اور نہ ہی آپ کسی اَور وقت پر اس کام کو ٹالتے تھے ، خواہ آپ کسی سے گفتگو کر رہے ہوتے یا کسی اہم کام میں مصروف ہوتے ۔

ایک دفعہ میں علامہ کے ساتھ شملہ میں تھا ۔ ہم دونوں اتفاق سے ایک ہی کمرے میں لیٹے ہوئے تھے ۔ نصف شب کا وقت تھا کہ مجھے آپ نے اپنا ایک شعر سنایا اور پھر ہم سوگئے ۔ صبح جب ہم ناشتے پر بیٹھے تو آپ نے فرمایا ''ماسٹر! تم کو رات ایک شعر سنایا تھا ۔'' میں نے کہا ''آپ نے سنایا تو تھا مگر مجھے وہ پورا یاد نہیں ہے ۔'' آپ نے ذرا توقف کر کے فرمایا ''ذرا ذہن پر زور دیجیے ۔'' چنانچہ میں نے اس شعر کے ایک دو الفاظ آپ کو سنا دیے کہ اس طرح وہ شعر تھا ۔ آپ نے کہا ''یہی تو میں آپ سے پوچھتا تھا ۔'' یہ کہہ کر آپ خاموش ہوگئے ۔

مندرجہ بالا واقعات مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر درج کیے گئے ہیں ورنہ تو اس قسم کے بے شمار سبق آموز اور دلچسپ واقعات کے لیے ایک دفتر درکار ہے ۔ جس طرح علامہ کی ذات گوناگوں صفات کی حامل تھی ، اسی طرح ان کی ذات سے منسوب واقعات و سوانح بھی متنوع اور رنگارنگ ہیں ۔ ان کی خدمت میں حاضر رہنے والے اور ان کی جوتیوں میں بیٹھنے والے جو حضرات اس وقت بقیدِ حیات ہیں ، وہ میری اس بات کی تائیدِ مزید کریں گے کہ

علامہ کی طبیعت میں جو اطمینان و استغنا اور ضبط و تحمل کی سدا بہار صفت تھی اس میں ان کی زندگی کے آخری لمحات تک سر مو فرق نہیں آیا ۔ انتہائی کٹھن حالات کا مقابلہ بھی انھوں نے ہمیشہ نہایت استقامت کے ساتھ کیا ۔ اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے ۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی ہم نے ان کی پیشانی پر بل نہیں دیکھا ۔ سچائی اور صاف گوئی کی تمام صفات علامہ اقبال کی ذات میں ودیعت کی گئی تھیں اور کبھی ہم نے انھیں مصلحت کوشی سے کام لیتے ہوئے نہیں دیکھا ۔

۹۶

علامہ اقبال کی بیماری اور آخری ایام

اگر ہم ابتدا سے علامہ اقبال کی جسمانی صحت اور ان کے شب و روز کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اگرچہ بظاہر وہ تندرست و توانا نظر آتے تھے ، اور شروع ایام میں وہ واقعتاً تندرست بھی تھے ، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی نہ کسی اعتبار سے وہ اکثر جسمانی تکلیفات کا شکار بھی رہے - ہم نے اکثر یہ دیکھا کہ علامہ نے بعض دعوتوں میں شرکت سے اس لیے معذوری کا اظہار کیا کہ وہ جسمانی طور پر تندرست نہیں ہوتے تھے - جن لوگوں نے ۱۹۳۲ع میں آپ سے نظم ''خضر راہ'' سنی ہے وہ جانتے ہیں کہ چونکہ آپ ان دنوں نقرس کے مرض میں مبتلا تھے لہٰذا آپ نے یہ نظم بیٹھ کر پڑھی تھی - مگر جب آپ نے یہ نظم شروع کی تھی تو ایسا لگتا تھا کہ بیماری کا نام و نشان تک نہیں رہا - ۱۹۳۲ع ہی میں جب آپ نے گول میز کانفرنس میں شرکت فرمائی تو آپ کی ناک پر ایک پھوڑا نمودار ہوا جس سے علامہ خاصے خوف زدہ ہو گئے مگر اللہ نے فضل کیا اور آپ صحت یاب ہو گئے - ۱۹۳۳ع میں راقم الحروف اورنگ آباد میں مولوی عبدالحق کے ہاں مقیم تھا کہ انہیں لاہور سے کسی نے علامہ اقبال کی علالت سے مطلع کیا - پھر اخبارات میں

بھی اس بیماری کی خبر شائع ہوئی کہ علامہ کا گلہ بیٹھ گیا ہے اور
وہ بات چیت نہیں کر سکتے ۔ اس خبر نے ہمیں اس قدر پریشان کیا
کہ ہم اسی روز چل کھڑے ہوئے اور دوسرا کوئی کام نہیں کیا ۔
راستہ بھر ہم دعا کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے حفظ و امان
میں رکھے اور جلد صحت یاب کرے ۔ پھر جب میں اورنگ آباد
سے واپس آ کر علامہ کی خدمت میں پہنچا تو اگرچہ مکمل طور پر
صحت یاب نہیں ہوئے تھے مگر کسی قدر افاقہ ضرور تھا ۔ اس زمانے
میں آپ حکیم عبدالرزاق نابینا دہلوی کے زیرِ علاج تھے جس سے آپ
کو افاقہ بھی ہوا ۔ لاہور میں ڈاکٹر عبدالحمید ملک اور حکیم محمد
حسن قریشی آپ کے خصوصی معالج تھے اور میاں محمد شفیع ، راجا محمد
حسن اختر اور دوسرے رفقا علامہ کے تیماردار اور نگران تھے ۔

ایک مرتبہ علامہ اپنے علاج کی غرض سے بھوپال بھی تشریف
لے گئے تھے جہاں سید راس مسعود نے درخواست کر کے آپ کو بلایا
تھا ۔ اس سفر میں علامہ کا قدیمی خدمت گار علی بخش بھی آپ کے
ہمراہ تھا ۔ جب علامہ اس سفر سے واپس تشریف لائے تو احباب کا
ایک ہجوم آپ کا منتظر تھا ۔ دوسرے ڈاکٹر حضرات جو علامہ کی
صحت کی نگرانی کیا کرتے تھے ، ان میں ڈاکٹر عبدالقیوم ، ڈاکٹر
جمعیت سنگھ ، ڈاکٹر محمد یوسف اور ڈاکٹر الٰہی بخش خاص طور پر
قابلِ ذکر ہیں ۔ دوستوں میں میاں محمد شفیع ، راجا حسن اختر اور سید
نذیر نیازی آپ کی تیمارداری اور دیکھ بھال پر مامور تھے ۔

علامہ کی زندگی کے آخری ایام کی پوری کیفیت مولانا
عبدالمجید سالک مرحوم نے اپنی کتاب ''ذکرِ اقبال'' میں بیان کر
دی ہے ۔ وہ ان ایام میں اکثر علامہ کے قریب رہتے تھے اور ان کے
شب و روز کی کیفیت کا مطالعہ کرتے رہتے تھے ۔ جب میں ۹ اپریل

۱۹۲۸ء کو علامہ کی مزاج پرسی کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُس وقت بھی سالک مرحوم ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ۔ علامہ کے آخری وقت میں ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب بھی آپ کے پاس موجود تھے ۔ بالآخر ان کا آخری وقت قریب آ گیا اور وہ تبسّم برلب اپنے تمام دوستوں اور عزیزوں کو روتا ہوا چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے :

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست

☆ ☆ ☆

٩٧

علامہ اقبال کی وفات

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ، ١٩ اپریل ١٩٣٨ء
کو میں آخری مرتبہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور ان کی
کیفیتِ مزاج دیکھ کر مجھے یہ اندوہ ناک احساس ہوا تھا کہ اب وہ
زیادہ عرصہ ہمارے درمیان میں نہیں رہیں گے - ٢٠ - اپریل کو بعض
مصروفیات کی وجہ سے میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا جس
کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا کیونکہ یہی دن ان کی زندگی کا آخری
دن ثابت ہوا - ٢١ اپریل ١٩٣٨ء کی صبح کو ابھی میں نماز سے
فارغ ہوا تھا کہ کسی نے دروازے پر آواز دی - میں نے باہر نکل
کر دیکھا تو علی بخش زار و قطار رو رہا تھا - اس نے روتے ہوئے
مجھے بتایا کہ شیخ صاحب (علامہ اقبال) کا انتقال ہو گیا ہے - میں
اسی حالت میں جاوید منزل کی طرف بھاگا اور وہاں پہنچ کر دیکھا
تو بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے اور ہر آدمی پریشان اور شکستہ
حال تھا - میں بغیر توقف کے سیدھا علامہ کے کمرے میں پہنچا اور
آپ کا آخری دیدار کیا - پھر میں وہیں بے دم ہو کر زمین پر بیٹھ
گیا اور آپ کے جسدِ بے روح کو دیر تک گھورتا رہا - وہ بطلِ
جلیل جس نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ایک نئی زندگی دی

تھی اور حریت و مساوات اور آزادی و خودداری کا شعلہ ان کے دلوں میں بھڑکایا تھا ، آج اس کا اپنا جسدِ خاکی زندگی کی حرارت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکا تھا ۔

علامہ کے انتقال کی خبر بجلی کی طرح شہر بھر میں پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے عقیدت مندوں کا ایک ہجوم جاوید منزل میں جمع ہو گیا ۔ لوگوں کے آہ و بکا کا یہ عالم تھا کہ شہر کے در و دیوار بھی آہ و زاری کرتے ہوئے محسوس ہوتے تھے ۔ لاہور شہر اور گرد و نواح سے اس قدر لوگ جمع ہو گئے اور ایسے ایسے چہرے میں نے آہ و بکا میں مصروف دیکھے کہ جنھیں اپنی زندگی میں پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا ۔

جب جنازہ تیار ہو گیا تو اس ہجوم کے پیشِ نظر جس کا ہر فرد جنازے کو کندھا دینے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا ، یہ تجویز ہوئی کہ چارپائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھ دیے جائیں تا کہ ہر فرد یہ سعادت حاصل کر سکے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انسانوں کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بعد دوپہر شاہی مسجد کی طرف روانہ ہوا ۔

مسلمانانِ لاہور کی یہ دلی خواہش تھی کہ علامہ کو شاہی مسجد کے سائے میں دفن کیا جائے اور اس کے لیے حکومتِ وقت سے اجازت حاصل کرنا ضروری تھا ۔ ادھر پنجاب کے چیف منسٹر لاہور میں موجود نہیں تھے اور حکامِ بالا اس معاملے میں لیت و لعل سے کام لے سکتے تھے ۔ مگر بالآخر حکام نے مسلمانوں کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا اور ساتھ ہی مرکزی حکومت نے محکمۂ آثار قدیمہ کے مشورے سے یہ شرط بھی لگا دی کہ علامہ کی قبر پر جو عمارت تعمیر ہوگی وہ شان و شوکت کے اعتبار سے شاہی مسجد کو کسی طرح مات نہ کرے گی ۔ چنانچہ گورنمنٹ کی اس شرط کو قبول کر لیا گیا اور

مسجد کی سیڑھیوں کے پاس بطرفِ جنوب علامہ کی آخری آرام گاہ تجویز ہوئی ۔ جب یہ تمام باتیں طے ہو گئیں تو شاہی مسجد میں بھی یہ اطلاع پہنچا دی گئی ۔ اس سلسلے میں مولوی ابو محمد مصلح صاحب رقم طراز ہیں جو اُن دنوں شاہی مسجد کے ایک حجرے میں مقیم تھے :

''ایک دن دوپہر کے وقت خطیبِ مسجد مولوی نورالحق صاحب نے کنڈی کھٹکھٹائی ۔ میں باہر آیا تو ان کی زبانی ڈاکٹر اقبال کے انتقال کی خبر ملی ۔ خطیب صاحب نے یہ بھی کہا کہ دروازے کے دوسری طرف یعنی جنوبی سمت کے حجروں کے سامنے جو صحن ہے ، وہی مزار کے لیے تجویز کیا گیا ہے ۔ ابھی ابھی میاں نظام الدین صاحب (بارود خانے والے) ، سید محسن شاہ صاحب اور مولانا غلام مرشد صاحب اس سلسلے میں آئے تھے ۔''

بعد دوپہر جاوید منزل سے جنازے کا جلوس روانہ ہوا ۔ اس قدر ہجوم تھا کہ الفاظ میں اس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی ۔ ہم سب انتہائی مایوسی و غم زدگی کی حالت میں جنازے کے ساتھ ساتھ تھے ۔ مجھے یاد ہے میاں عبدالحی وزیر تعلیم اور بعض دوسرے سر کردہ حضرات بھی میرے ساتھ گردن جھکائے ہوئے چل رہے تھے ۔ جوں جوں جنازہ اسلامیہ کالج کی طرف بڑھ رہا تھا ، ہجوم میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا اور کلمۂ شہادت کے وظیفے سے پوری فضا گونج رہی تھی ۔ بالآخر انسانوں کا یہ سمندر اسلامیہ کالج پہنچا اور کالج کی گراؤنڈ میں ، جہاں کبھی علامہ کی ترنم ریز آواز میں ہم ان کی ایمان افروز نظمیں سنا کرتے تھے ، نماز جنازہ ادا کی گئی ۔

نماز جنازہ سے فراغت کے بعد جنازہ دلی دروازے کی طرف روانہ ہوا اور اسی دروازے سے اندرونِ شہر داخل ہوگیا ۔ جب ڈبی بازار

کی سنہری مسجد کے قریب جنازہ پہنچا تو مجھے یاد ہے مرزا جی عطر والے نے بلند آواز سے پکار کر کہا تھا کہ ''لوگو! پتلون پوش ولی آج چل بسا ہے۔''

چونکہ آخر میں شاہی مسجد میں بھی نمازِ جنازہ ادا کرنے کا پروگرام طے ہو چکا تھا لہٰذا یہاں بھی لوگوں کی ایک کثیر تعداد مسجد کے اندر اور باہر موجود تھی۔ بعض لوگ اتنے بڑے ہجوم کے پیشِ نظر حضوری باغ میں نماز جنازہ ادا کرنے کے حامی تھے مگر بالآخر صحنِ مسجد میں نماز ادا کی گئی اور مولوی غلام مرشد صاحب نے امامت کے فرائض انجام دیے۔

اس کے بعد جنازہ قبر کے قریب لا کر رکھ دیا گیا۔ مستری غلام دستگیر قبر تیار کرنے کے کام پر مامور تھے۔ قبر کے بارے میں یہ طے پایا تھا کہ اس میں لحد نہ ہو اور اسے سیدھا بنائے جائے۔ چنانچہ جب قبر تیار ہوگئی تو ہم سب عقیدت مند مل کر علامہ کے جسدِ خاکی کو قبر میں اتارنے لگے۔ اس وقت یہ کیفیت تھی کہ آنکھیں اشک بار تھیں اور دل جیسے خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس ہجوم کا ہر آدمی غم و الم کی تصویر بنا ہوا تھا اور ایک اندوہ ناک خاموشی ماحول پر طاری تھی۔ ہم لوگ علامہ کے جسدِ خاکی کو قبر میں اتار چکے تھے کہ عبدالرحمٰن چغتائی مرحوم نے آخری بار قبر میں اتر کر علامہ کے جسدِ بے روح کو بوسہ دیا۔ اس کے بعد قبر کو بند کر دیا گیا اور ہم لوگ گویا اپنا سب کچھ لٹا کر بوجھل قدموں کے ساتھ واپس آ گئے۔ مولوی ابو محمد مصلح لکھتے ہیں:

''لاہور کی شاہی مسجد ہندوستان کی سب سے زیادہ وسیع مسجد ہے۔ اس کے صحن میں نمازِ جنازہ ادا ہوئی۔ اس

کے بعد تدفین عمل میں آئی ۔ قلعے اور مسجد کا درمیانی
صحن صدیوں سے خالی پڑا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
بادشاہوں نے بھی اس رعایت کو مدنظر رکھا تھا اور
خود اورنگ زیب عالم گیر علیہ رحمۃ کو بھی اپنے
سوگوار اقبال کی خاطر منظور تھی ۔ اور چونکہ اس کے بعد
بھی میں عرصے تک لاہور میں رہا اس لیے وہ سب مناظر
میں دیکھتا رہا جو اقبال کے مزار سے متعلق عقیدت مندوں
کی طرف سے پیش ہوتے رہے اور آیندہ بھی ہوتے رہیں گے ۔

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بنایا راز الوندی"

علامہ اقبال کے انتقال پر ہندوستان کے تقریباً تمام شہروں میں
تعزیتی جلسے منعقد ہوئے اور اخبارات و رسائل نے خاص نمبر شائع
کیے ۔ اس قدر لوگوں نے قطعاتِ تاریخ کہے کہ شمار سے باہر ہیں ۔
اسی طرح کا ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیے :

زہے کرشمۂ فیضانِ مرقدِ اقبال
کہ گشت مرجعِ تسکینِ پیر و برنائے
نقیبِ عظمتِ مینارِ مسجدِ شاہی
مزارِ شاعرِ مشرق سپہر آرائے

مزارِ اقبال کے ضمن میں مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کی
رائے ملاحظہ ہو :

"ڈاکٹر اقبال کے مزار کی تعمیر کا معاملہ احباب کے
زیرِ غور تھا ۔ چنانچہ نجی طور پر بعض دوستوں نے ایک
رقم بھی فراہم کر لی تھی کہ انھی دنوں حکومتِ افغانستان
نے ڈاکٹر صاحب کے مزار کے لیے ایک تعویذ بھیجا ۔ یہ

سنگِ مرمر کی بے شمار سلیں تھیں جن پر مناسب آیات کندہ
تھیں ۔ یہ تمام اجزا پچیس صندوقوں میں بحفاظت بند تھے ۔
مجموعی وزن کوئی ڈیڑھ سو من ہو گا ۔ تعویذ کو ترتیب سے
جوڑنے کے لیے ایک نقشہ ہدایات ہمراہ تھا ۔ حکومتِ
افغانستان کے افسروں نے تعویذ میاں امیر الدین صاحب
اور چودھری محمد حسین غفرلہ کے سپرد کر دیا جو اب مزار
پر نصب کیا جا چکا ہے ۔"

جیسا کہ ذکر ہوا ، ملک بھر میں ہزاروں جلسہ ہائے تعزیت
منعقد ہوئے جن میں شاعرِ مشرق کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ۔ اسی
طرح کا ایک جلسہ ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ع کو علی گڑھ یونیورسٹی میں
بھی ہوا تھا جس میں ڈاکٹر عبدالعزیز نے اپنی تقریر کے دوران میں
یہ قطعہ پڑھا تھا جو بعد میں ''انسانیت موت کے دروازے پر" کے
زیرِ عنوان جلسے کی کارروائی کے ساتھ شائع ہو گیا تھا :

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو
ہمہ خنداں بوند و تو گریاں
آنچناں زی کہ وقتِ مردنِ تو
ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

☆ ☆ ☆

۹۸

آخری ملاقات

میں ۱۸- اپریل ۱۹۳۸ء کو یورپ سے واپس آ کر ۱۹- اپریل ۱۹۳۸ء کی شام کو ایک پارٹی سے فارغ ہو کر چند دوستوں کے ساتھ جاوید منزل میں علامہ کے ہاں گیا - علی بخش جب آیا تو اس کو میں نے کہا کہ میں علامہ سے ملنا چاہتا ہوں - چنانچہ مجھے اکیلے کو ملنے کی اجازت دے دی گئی اور میرے تمام ساتھی باہر رہے - میں اندر گیا اور دیکھا کہ مولانا غلام مرشد اور مولانا عبد المجید سالک آپ کے پاس بیٹھے ہیں - آپ ایک گاؤ تکیے کے سہارے لیٹے تھے - نہایت بشاشت سے آپ نے ہاتھ ملایا ، بیٹھنے کو کہا اور حسبِ عادت بے تکلفانہ گفتگو کی اور فرمایا کہ پیرس میں تم خوب آزاد رہے ہو - پھر آپ نے اطالوی زبان کے بعض رسائل کا تقاضا فرمایا اور کہا کہ ان کو جلد مہیا کرو - دراصل ان رسائل میں آپ کے لیکچروں پر تبصرہ تھا - پروفیسر رینو کی لڑکی نالینو کی زیرِ ادارت یہ رسالہ چھپتا تھا - آپ ویسے علیل ضرور نظر آتے تھے مگر آپ کا دماغ درست تھا اور طبیعت نہایت شگفتہ تھی - میں نے اپنی تمام کیفیت پیرس یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کی بیان کی - اسی دوران میں پیرس یونیورسٹی کے بعض پروفیسروں کا ذکر بھی آیا جن کو آپ بھی جانتے تھے -

پھر مجھے کسی نے حاضرین میں سے اشارہ کیا کہ گفتگو مختصر کردو ۔ چنانچہ میں نے اسی وقت آپ سے اجازت طلب کی اور ہاتھ ملا کر باہر آ گیا ۔ مگر افسوس کہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ع کو آپ کا انتقال ہو گیا ـــ انا للہ و انا الیہ راجعون :

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

علامہ کے چالیسویں پر آپ کے دیرینہ دوست چودھری محمد حسین اور منشی طاہر الدین (متوفی ۲۳ مئی ۱۹۴۰ع) کے زیرِ اہتمام ایک نہایت عمدہ دعوت کا انتظام کیا گیا تھا ۔ ہم سب احباب اس دعوت سے فارغ ہو کر رخصت ہونے کو تھے کہ میاں شاہ نواز (باغبانپورہ والے) اپنی اہلیہ کے ساتھ موٹر میں تشریف لائے ۔ ان کی اہلیہ تو موٹر سے اتر کر ہم لوگوں کے پاس آئیں مگر میاں صاحب موٹر ہی میں بیٹھے رہے ۔ پھر انھوں نے موٹر کے اندر بیٹھے بیٹھے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے اور ہم سب لوگ بھی کھڑے کھڑے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنے لگے ۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی مقبرے پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں ۔ میاں شاہ نواز صاحب بھی اس کے چند ہی دن بعد فوت ہوگئے تھے ۔

☆ ☆ ☆

۹۹

علامہ اقبال کی محفلِ احباب

(چودھری محمد حسین)

میں عرصۂ دراز تک علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ سفر میں بھی ساتھ دیا اور حضر میں بھی ان کے درِ دولت پر جبیں سائی کی۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی انھوں نے خیریت دریافت کرنے کے سلسلے میں مجھے پہل کرنے کا موقع دیا ہو۔ میں جب حاضر ہوتا اور ان کی نظر مجھ پر پڑتی، نہایت بے تکلفی اور اپنائیت سے فرماتے ”آؤ ماسٹر کیا حال ہے اور آج کیا خبر ہے۔“ ان کے ہاں ہر وقت دوستوں اور ملنے والوں کا ایک ہجوم جمع رہتا تھا۔ ان میں طرح طرح کے لوگ ہوتے تھے اور طرح طرح کی باتیں کرتے تھے جو بعض اوقات ناگوارِ خاطر بھی ہوتیں مگر ہم نے کبھی علامہ کو چیں بہ جبیں ہوتے یا ترش روئی سے پیش آتے نہیں دیکھا۔ دوستوں سے ان کے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات مصروفیات کی وجہ سے میں ان کی خدمت میں کچھ روز کے لیے حاضر نہ ہو سکتا تو فوراً علی بخش کو رقعہ دے کر بھیجتے یا کارڈ لکھتے جس میں نہایت خوبصورت پیرائے سے غیرحاضری کا ذکر ہوتا۔ اسی طرح کا ایک رقعہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیے اور اس کا

پیرایہ بیان بھی دیکھیے :

"ڈیئر ماسٹر عبد اللہ !

تمام لاہور میں اس بات کا چرچا ہے کہ ماسٹر عبد اللہ اعلانِ آزادی کے خوف سے کہیں بھاگ گئے ہیں ۔ کیا یہ واقعی درست ہے ؟

۷ فروری ۱۹۲۹ء محمد اقبال ، لاہور"

یہی ان کا برتاؤ تھا کہ ہم ان کے گرویدہ تھے ۔ ان کی علمی شان اور اخلاق عظمت کا احاطہ کرنا میرے جیسے ہیچمدان کے لیے ناممکن ہے ۔ میں نے تو انہیں علمی معاملات میں ہمیشہ عجز و انکسار سے کام لیتے ہوئے دیکھا اور تعلّی یا خودنمائی کا شائبہ تک نظر نہ آیا ۔ ایسا اکثر ہوتا کہ کسی نظم یا شعر کے معاملے میں کوئی بات مشتبہ نظر آتی یا زبان کے معاملے میں کوئی امر تصفیہ طلب ہوتا تو وہ علی بخش کو فلیمنگ روڈ پر بھیجتے کہ جاؤ مہر اور سالک کو بلا لاؤ ۔ بعض اوقات پروفیسر شیرانی کو بھی بلا لیتے اور پھر زبان و ادب اور شعر و شاعری پر گفتگو شروع ہو جاتی جو بعض اوقات رات گئے تک جاری رہتی ۔ شیرانی مرحوم تحقیق کے مردِ میدان تھے اور فارسی زبان و ادب پر بھی ان کی نظر بہت گہری تھی ۔ بعض دفعہ بطورِ تفنّن شیرانی مرحوم سے کہتے کہ "یار شیرانی ! اگر تم یہ ثابت کرنے کا تہیہ کر لو کہ اقبال نام کا کوئی شخص وجود ہی نہیں رکھتا تو امید ہے کہ تم یہ بھی کر کے دکھا دو گے ۔" بعض اوقات شیرانی مرحوم کو اپنا فارسی کا کوئی شعر سناتے اور ان سے فرمائش کرتے کہ قدما کے کلام سے اسی مضمون کا کوئی شعر تلاش کرو ۔

ایک مرتبہ علامہ نے اپنی کوٹھی پر احباب کی ایک خاص محفل شروع کی تھی جس میں روزانہ رات کو آپ کی مشہور مثنوی

"اسرار خودی" کا درس ہوتا تھا ۔ مثنوی کا متن مولانا عبدالمجید سالک پڑھتے تھے اور علامہ اشعار کی شرح کرتے جاتے تھے ۔ فلسفہ و تصوف کے ایسے ایسے نکات سے پردہ اٹھتا تھا کہ سننے والے جھوم جھوم جاتے تھے ۔ مجھے یاد پڑتا ہے اس محفل میں دیگر احباب کے علاوہ مسٹر ممتاز حسن ، احمد الدین ازہر اور چودھری محمد علی بھی شریک ہوتے تھے ۔

علامہ کے ملاقاتیوں کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہیں تھا اور نہ ہی علامہ حتی الوسع ملاقات سے پہلوتہی کرتے تھے ۔ معمول یہ تھا کہ دن بھر ملاقاتیوں کی آمد و رفت جاری رہتی ۔ دوپہر کو دس اور گیارہ بجے کے درمیان آپ کھانا کھا لیتے جو خاصا پرتکلف ہوتا اور جس میں اچار جزوِ لازم کے طور پر شامل ہوتا ۔ آپ دن بھر میں صرف یہی کھانا کھاتے اور اس سے فارغ ہو کر پھر احباب اور ملاقاتیوں میں گھر جاتے ۔

چار بجے کے بعد کسی بھی وقت چودھری محمد حسین کا ان کی خدمت میں حاضر ہونا معمول تھا ۔ چودھری صاحب آن دنوں پریس برانچ میں ملازم تھے اور قلعہ گوجر سنگھ میں رہائش رکھتے تھے ۔ اگر اس معمول میں کوئی گڑبڑ ہوتی یا چودھری صاحب کسی وجہ سے نہ آ سکتے تو لازمی طور پر علی بخش کو ان کے گھر خیریت معلوم کرنے کی غرض سے بھیجا جاتا ۔

چودھری محمد حسین چونکہ پریس برانچ میں ملازم تھے جہاں پنجاب بھر کے اخبارات و رسائل حکماً آتے تھے اور ان کا مطالعہ ان کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا لہذا وہ حالاتِ حاضرہ سے بخوبی آگاہ رہتے تھے ۔ علامہ ان کی آمد کا بطورِ خاص انتظار فرماتے تھے کیونکہ وہ تازہ ترین ملکی حالات اور سیاسی رجحانات سے علامہ کو باخبر

رکھتے تھے ۔ چودھری صاحب ہندو اخبارات کا بطورِ خاص مطالعہ کرتے تھے اور شام کو علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان اخبارات کے اداریوں ، مضامین اور خبروں کا نچوڑ علامہ کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے ۔ علامہ چونکہ ہندو سیاست اور ہندو ذہنیت کے تازہ ترین رجحانات پر ہر وقت نظر رکھتے تھے لہذا چودھری صاحب آتے ہی بغیر کسی تمہید کے وہ سب کچھ بیان کر دیتے جو اخبارات نے لکھا ہوتا ۔ اس طرح مسلمانوں کے خلاف ہندو ذہنیت کے نشیب و فراز سے آپ آگاہ رہتے اور مناسب تدابیر پر غور و فکر فرماتے ۔ چودھری صاحب بعض اوقات شام کے کھانے کے لیے علامہ سے رخصت لیتے اور پھر واپس آ جاتے اور نصف شب تک ان کی خدمت میں رہتے ۔

چودھری محمد حسین مرحوم صحیح معنوں میں علامہ کے مزاج شناس تھے ۔ وہ اس وقت سے علامہ سے عقیدت رکھتے تھے جب نواب ذوالفقار علی خاں کے بچوں کے اتالیق تھے ۔ چودھری صاحب کی دیانت داری اور اخلاص نے انھیں علامہ کا سب سے بڑا معتمد علیہ بنا دیا تھا ۔ مدراس لیکچرز کے لیے علامہ کی روانگی کے بالکل آخری لمحوں میں جب چودھری محمد حسین بھی ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگئے تو بعض لوگوں نے اس سے یہ تاثر لیا کہ شاید حکومت نے چودھری صاحب کو علامہ کی نگرانی کے لیے ان کے ساتھ روانہ کیا ہے ۔ جب علامہ تک یہ بات پہنچی تو انھوں نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا کیونکہ انھیں چودھری محمد حسین پر غیر معمولی اعتماد تھا اور ساتھ ہی یہ یقین بھی تھا کہ چودھری صاحب کبھی ان کے اس اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائیں گے ۔ بلاشبہ چودھری صاحب نے بھی وفا کی دنیا میں ایسی مثال قائم کی جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گی ۔ انھوں نے نہ صرف علامہ کی زندگی میں ان کے علمی اور شعری

کارناموں کو روشناس کرانے میں غیر معمولی جدوجہد کی بلکہ ان کے انتقال کے بعد بھی صحیح معنوں میں ان کی جائداد اور تصانیف کے سلسلے میں ایک دیانت دار ٹرسٹی کے فرائض انجام دیے۔ علامہ نے خود بھی اپنی بعض تصانیف کے دیباچوں میں چودھری صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

علامہ نے اپنی زندگی میں اپنی جائداد اور تصانیف کے بارے میں جو وصیت کی تھی چودھری محمد حسین اور منشی طاہر الدین نے اس کے ایک ایک حرف پر عمل کیا۔ آمد و خرچ کا حساب کتاب منشی طاہر الدین کے سپرد تھا جو ان فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے اور علامہ کو ان کی ذات پر مکمل اعتماد تھا۔ میں نے اپنی طویل رفاقت میں علامہ کی جیب میں کبھی کوئی نقدی وغیرہ نہیں دیکھی تھی۔ ضروریات زندگی کی فراہمی اور آمد و خرچ کا مکمل حساب کتاب انھی دو حضرات کی صوابدید پر منحصر تھا اور یہی دونوں حضرات علامہ کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد یہ فرائض انجام دیتے رہے۔ یہ محض چودھری محمد حسین کا کارنامہ تھا کہ علامہ کے انتقال کے بعد ان کا خاندان کسی کا محتاج نہیں رہا۔ اسے علامہ اقبال کے خاندان کی خوش قسمتی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ علامہ کی شفقت سے محروم ہونے کے بعد انھیں ایک ایسا سرپرست اور منتظم مل گیا جس نے اس خاندان کی دیکھ بھال اور فلاح و بہبود کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ چودھری محمد حسین ایک علم دوست انسان تھے اور علامہ ان کی علمی جستجو اور تنقیدی بصیرت کے قدردان تھے۔ انھوں نے علامہ کی بعض کتابوں کے علاوہ دوسرے مصنفین کی تصانیف پر بھی عالمانہ تبصرے لکھے جو پسند کیے گئے۔ وہ سیالکوٹ کے ایک گاؤں بھارنگی کے رہنے والے تھے۔

۱۹۳۵ع میں علامہ اپنی ذاتی کوٹھی "جاوید" منزل میں اٹھ آئے تھے ۔ اس وقت تک آپ کی صحت کافی متاثر ہو چکی تھی ۔ اکثر اوقات خط بھی خود نہیں لکھ سکتے تھے ۔ چنانچہ معمول یہ ہو گیا تھا کہ جو دوست حاضر ہوتا ، علامہ اسی کو خطوط کا جواب املا کروا دیتے ۔ اس سلسلے میں میاں محمد شفیع (م ۔ ش) ، سید نذیر نیازی اور بعض دوسرے احباب بطورِ خاص اس کام پر مامور تھے ۔ ان دنوں راجہ حسن اختر اور مولانا عبدالمجید سالک اکثر علامہ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے کیونکہ علامہ کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی ۔ چودھری محمد حسین آخر وقت تک حسبِ معمول شام کو حاضر ہوتے رہے اور اس معمول میں کبھی فرق نہیں آنے دیا ۔

☆ ☆ ☆

۱۰۰

نتیجہ

میں نے ان صفحات میں علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر متعدد عنوانات کے تحت روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے - یہ وہ حالات و واقعات ہیں جو میرے سامنے وقوع پذیر ہوئے یا جن کا مجھے علم ہے - میں ۱۹۱۴ع سے سفر و حضر میں علامہ کے قریب رہا اور یہ سوانح میرے ذاتی مشاہدات اور علم پر مبنی ہیں اور میں نے انھیں اپنی بہترین یادداشت کے مطابق قلم بند کیا ہے - یہ عین ممکن ہے کہ بعض دیگر حضرات ، جو علامہ کے قریب رہے اور اب تک بقیدِ حیات ہیں ، ان موضوعات پر زیادہ شرح و بسط کے ساتھ لکھ سکیں - اور میرے خیال میں بہتر یہی ہوگا کہ یہ حضرات بھی میرے ان بیانات کی موجودگی میں اپنے مشاہدات بیان فرمائیں ، تاکہ قارئین مختلف بیانات کا تجزیہ کر کے کسی نتیجے تک پہنچ سکیں - میں ان بیانات کو مزید طوالت بھی دے سکتا تھا مگر میں نے یہی بہتر خیال کیا کہ مختصر طور پر قارئین سے علامہ اقبال کو متعارف کرا دیا جائے -

بعض حالات و سوانح کو الگ الگ عنوانات کے تحت لکھنے کی بجائے میں نے یکجا کر دیا ہے کیونکہ یہ ایک ہی زمانے میں

وقوع پذیر ہوئے تھے ؛ مثلاً ''عطیہ فیضی'' ، ''پروفیسر آرنلڈ'' اور ''تیاری مقالہ برائے پی ایچ ۔ ڈی'' کو یکجا کر دیا گیا ہے کیونکہ مقالۂ مذکور کی تیاری کے سلسلے میں پروفیسر آرنلڈ اور عطیہ فیضی سے علامہ کو سب سے زیادہ واسطہ پڑا ۔ بالآخر جب یہ مقالہ اشاعت پذیر ہوا تو علامہ نے اسے پروفیسر آرنلڈ کے نام منسوب کر دیا ۔ پروفیسر آرنلڈ کا انتقال ۱۹۳۰ع میں ہوا ۔ اسی طرح ''دنیائے اسلام میں علامہ اقبال کی مقبولیت'' کے زیرِ عنوان اُن تمام اسلامی ممالک کو یکجا کر دیا گیا ہے جن میں علامہ کے فکر و فن پر کسی قدر علمی کام ہوا ہے ۔

یہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کا دور ہماری تاریخ کا درخشاں ترین دور تھا ۔ اسے ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ الثانیہ کا دور کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا ۔ انھوں نے جو کچھ سوچا ، جو کچھ کہا اور جو کچھ کیا ، صرف اسلام کی سربلندی کے لیے سوچا ، ملتِ اسلامیہ کی بیداری کے لیے کہا اور برِعظیم کے مسلمانوں کی اصلاح و فلاح کے لیے جد و جہد کی ۔ انھوں نے ہر امر کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا اور اسی نقطۂ نظر سے اسے پیش کیا ۔ آج کے حالات اور دورِ اقبال کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ اس فرق کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جنھوں نے وہ دور دیکھا ہے ۔ اسلام کے لیے جو جذبہ اقبال نے اپنے عہد کے مسلمانوں میں بیدار کیا وہ آج پھر سرد پڑتا جا رہا ہے اور یہ بڑی کربناک صورتِ حال ہے ۔ اقبال کا شروع سے یہ نقطۂ نظر تھا کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور دنیا کے تمام مسائل کا حل اسلام کے زریں اصول میں مضمر ہے ۔ انھوں نے زندگی بھر اسی نقطۂ خیال کا پرچار کیا اور اسلام کو ایک عالم‌گیر مسلک کے طور پر پیش کرتے رہے ۔ انھیں یقین

تھا کہ ایک نہ ایک دن ملّتِ اسلامیہ ایک مرکز پر ضرور جمع ہوگی اور پھر یہ ملّت پوری دنیا کی رہنمائی کے فرائض انجام دے گی۔ ان کی زندگی میں تو یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا مگر حالات بتا رہے ہیں کہ بالآخر اسلامی دنیا اقبال کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کے لیے مجبور ہو جائے گی۔ صہیونیت ، سامراج اور دوسری اسلام دشمن طاقتیں آج جس انداز میں اسلام کے خلاف صف آرا ہیں ، یہ حالات یقیناً مسلمانوں کو اس نتیجے پر پہنچائیں گے کہ نجات کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ اقبال کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر اپنے تشخّص کو برقرار رکھا جائے۔ اگر یہ ہوگیا تو دنیا کی کوئی طاقت اسلام کو میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گی اور یہی وہ وقت ہوگا جب اسلام دنیا بھر کی رہنمائی اور امامت کے فرائض انجام دے گا۔

اسلام کے ساتھ علامہ اقبال کی وابستگی کو مشہور عرب شاعر لبید کے مندرجہ ذیل شعر کا مکمل نمونہ سمجھنا چاہیے جس نے اسلام لانے کے بعد رسول کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا تھا :

الحمد للہ اذ لم یاتنی اجلی
حتی کسانی فی الاسلام سربالا

ترجمہ : خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس وقت تک موت نہیں آئی جب تک میں نے اسلام کا جامہ نہیں پہن لیا۔

یہی حالت اقبال کی تھی جن کا اوڑھنا بچھونا اسلام تھا اور وہ اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرتے تھے۔

حضرتِ بلالؓ کے متعلق علامہ نے دو نظمیں کہی ہیں۔ ایک نظم میں وہ اس مفلوک الحال اور غریب الوطن حبشی کو محض اس لیے فاتحِ اعظم سکندرِ رومی پر ترجیح دیتے ہیں کہ بلالؓ

عاشقِ رسولؐ اور اسلام کا سچا شیدائی تھا ۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

لیکن بلالؓ وہ حبشی زادۂ حقیر
فطرت تھی جس کی نورِ نبوّت سے مستنیر
اقبال کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رومی فنا ہوا ، حبشی کو دوام ہے

☆ ☆ ☆

اشاریہ

مرتبہ

احمد رضا

اشخاص

آ

الف

ب

پ

ت

خ

د

ڈ

ذ

ر

ز

س

ش

ص

ض

ط

ظ

ع

غ

ف

ق

ک

گ

ل

م

ن

و

ہ

ی

☆ ☆ ☆

مقالات ، ادارے

ب

پ

غ

ف

ق

ک

ن

و

ہ

ی

☆ ☆ ☆

کتب ، اخبارات و رسائل ، مقالات و مضامین

ٹ

ج

چ

ح

خ

د

ش

ص

ط

ع

غ

ف

ق

ک

گ

ل

م

ی

☆ ☆ ☆

منظومات

الف

ب

پ

ت

ج

ح

☆ ☆ ☆